کلیم عجم
سیماب

خطباتِ شاعری

میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا
گرمیِ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

فہرستِ خطباتِ شاعری

مطبوعۂ رفاہ عام پریس آگرہ

۶۸۱

پہلا خطبہ

آل انڈیا قومی مشاعرہ۔ گیا

۲۴ - دسمبر ۱۹۲۲ء

معززینِ قوم!

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہوگا اس "آل انڈیا قومی مشاعرہ" کی صدارت کا اعزاز جناب چکبست لکھنوی کے لئے مقدر تھا لیکن سوءِ اتفاق سے ان کی والدۂ ماجدہ کی طبیعت ناساز ہوگئی اور اراکین مجلس انتظامیہ نے بارِ صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا۔ جسے قلّت وقت اور نزاکت موقع کے خیال سے مجھے مجبوراً اٹھانا پڑا۔

احمد آباد (گجرات) کے بعد "آل انڈیا قومی مشاعرہ" کی یہ دوسری نشست ہے اور اہل گیا قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بہترین انتظامات فرماکر اور کثیر اخراجات برداشت کرکے قوم کی شاعرانہ زندگی کی یادگار امسال بھی کشادہ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ قائم کی۔

یہ ظاہر ہے کہ مرورِ ایام نے ایشیائی شاعری کو انحطاط کے پست ترین قعرِ ذلت میں ڈھکیل دیا ہے۔ تاہم رنگِ زمانہ صاف کہہ رہا ہے کہ شاعر ضروریاتِ زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ حیاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی اور واقعاتِ ہائلہ پر حقیقی تبصرہ جس خوبصورتی اور دقتِ نظر کے ساتھ ایک شاعر کرسکتا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔

اُردو شاعری کے اجزائے ترکیبی جب تک صرف گل و بلبل، شمع و پروانہ، سرو و قمری اور شانہ و زلف سے وابستہ رہے، شاعری صرف تفریح خاطر کا ایک ذریعہ مسرور سمجھی گئی۔ لیکن قدرت نے لکھنو دہلی اور پانی پت کے بعض فاضل عمائدین کے دماغ کو انوار شاعری سے متجلی کرکے دنیائے سخن کی فضائے بسیط پر رشد و ہدایت کی بجلیاں چمکائیں۔ وہ ہندوستان میں سب سے پہلے قومی شاعر تھے، جن کے رشحات شاعری کو فضائے سخن نے ایک نئی قوت، ایک نیا اثر، اور ایک نئی ترقی بخشی۔ اور جس کے بعد قومی شاعری کا ایک خاص معیار قائم ہو گیا۔ میرا مطلب مولانا حالی، شمس العلما محمد حسین آزاد، شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد، اور مولانا شبلی (مرحوم) سے ہے۔

شاعری جس طرح جذبات قومی کے نشر و اعلان کے لئے ایک ذریعہ مخصوص ہے اُسی طرح مذہب کے اثرات کو سامعت گزیں اور دل نشیں کرنے کا بھی ایک خاص وسیلہ ہے۔ نصیحتیں جو نثر میں کی جاتی ہیں وہ اصلاحی نظموں سے زیادہ اثر آفریں نہیں ہوتیں نثر عبارتیں خواہ کیسی ہی خوش ترکیب کیوں نہ ہوں زبانوں سے نکل کر دلوں میں محفوظ نہیں رہتیں مگر ایک درد میں ڈوبا ہوا شعر مدتوں آغوشِ سامعت میں جھولا کرتا ہے اور اس کی موجیں فضائے شوق سے باہر نہیں نکلتیں۔

پچھلے دنوں جب خدام وطن کی جماعتیں، سودائے حریت بسر، اور رایت ملت بدست بغرض مظاہرہ نکلتی تھیں جن کے پیچھے پیچھے شیدایان وطن کا ایک محشر ہوتا تھا۔ تو ان کی زبانیں کسی نہ کسی شاعر ہی کی ماتم خیز نوائے موزوں سے آشنا ہوتی تھیں۔ اور اُن کے ہلالی رایت کے بلند پھریرے پر بخط جلی لکھا ہوتا تھا۔ کہ "ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا"

قوم کے ناہموار اور غیر مستعلیق مذاق میں یہ شعریت پیدا کرنا اگر شاعروں کی دماغی محنت کا نتیجہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ رزمگاہِ انگورہ کی خوں بداماں وادیوں سے پوچھئے کہ اُس کے مناظرِ خاموش میں جس نے جزر و مد کا ایک طوفانِ عظیم پیدا کر دیا وہ کون تھا۔ شاعر اور صرف شاعر!!

یہ نصرتی کا فیض سخن ہی تھا، جس کی حوصلہ افزا رجز نے غازیانِ اسلام کے تیور بدل دیئے انکے ٹھہرے ہوئے جوش اور سکون طلب جذبات کو حرکت میں لاکر ابھار دیا۔ اور اُن کے دلوں کو

شوقِ شہادت وجذبۂ فدائیت سے لبریز کر دیا۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ آج انگورہ گو دار الخلافہ نہیں تاہم دار الخلافہ کی مقدس شانیں اپنے آغوش میں لئے ہوئے عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں سجدہ گاہِ عقیدت بنا ہوا ہے۔

موجودہ قوانینِ جنگ کے ماتحت، ہر فوج اور ہر لشکر کا مقدمۃ الجیش ایک فوجی نغمہ ہوتا ہے جس کی لبریزِ جوش صدائے دلکش ایک نظمِ منضبط کا عکس ناطق ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ نہیں ہوتے مگر صرف ایک پُرجوش موسیقی۔ بغیر اس نغمہ کے کوئی فوج میدانِ جنگ میں معرکہ آرا نہیں ہو سکتی۔

جب نظموں کی صوت بے لفظ میں یہ اثر ہے تو پھر اصلی نظموں کے تاثر کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اور جب نظموں کا درجہ اس قدر بلند ہے تو پھر ناظموں کے مدارج کا کیا پوچھنا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اگر آج ساری دنیا کا ایک لشکرِ عظیم تیار کیا جائے۔ تو شعرا بطور مقدمۃ الجیش اس کے آگے آگے ہوں گے۔ اور اس کی فتحیابی و کامرانی، حرکت و روانی، صرف شعرا کی اثر آفرینی اور گرم نوائی پر موقوف ہوگی۔

شاعری کی قسمت ہمیشہ ملک کی قسمت کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا، تو شاعری کا عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد پر نظر آ رہا تھا۔ اب ہندوستان زوال کے خطوطِ انتہائی پر آ پہونچا ہے۔ تو روایاتِ شاعری بھی اسی نسبت سے انحطاط پذیر ہیں لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ جس وقت ہندوستان کا ستارہ چمکے گا، اس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نورباری کرتا نظر آئے گا۔ اور جہاں تک قرائن کی گنجائش ہے، ہندوستان کی ترقی، اور عروج و کمال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہی شاعری ہوگی۔ جو اپنے طلسمی اثر سے دردمندانِ ملک و قوم کو ایک دن ضرور کامیابِ مقاصد بنا دے گی۔

یاد رکھئے، ایک شاعر، اگر اسے اپنے فرض کا احساس ہے، اور وہ زمانہ کا نبض شناس ہے تو ہزاروں جری اور نبرد آزما جوانوں سے بہتر ہے۔

ہماری ملکی اور قومی انجمنوں کو ہنوز شاعر اور شاعری کی عظمت و اہمیت کا احساس نہیں۔ ورنہ جس طرح آج کانگریس کے پنڈال میں یہ قومی مشاعرہ منعقد ہوا ہے، اگر اسی طرح ہر سال منعقد ہوتا رہے تو نہ صرف قومی شاعری کے رواج میں ترقی ہو سکتی ہے بلکہ قومی و ملکی انجمنوں کے مقاصد و

عزائم کے پروپیگنڈے میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔ اور عام شاعری کا رجحان رطب ویابس کی طرف سے سمٹ کر قومی تعمیر کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

شاعر سماج کا ایک رکن عزیز ہے۔ ایک مضبوط ستون ہے۔ ایک ترجمانِ حقیقی ہے۔ اُس سے بے نیاز رہنا سماج کو علمی و ادبی قوتوں سے محروم رکھتا ہے۔ کسی حقیقی شاعر کا ایک شعر متعدد مقررین کی طویل تقریروں سے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ ملکی انجمنوں کی تاریخ میں یہ حقیقت موجود ہے کہ شعرا کی گرم نوائی نے جذبات انسانی میں تحریک کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اور سرد سے سرد ماحول کو بھی گرم و پرجوش بنا دیا ہے۔ مگر آج ہمارے ملک کی سب سے بڑی سیاسی مجلس شاعری کی ان معجزانہ قوتوں کو نظرانداز کئے ہوئے ہے۔ اگر وہ ڈھونڈے تو اسی ہندوستان میں اُسے آج بھی والٹیک اور نفرتی مل سکتے ہیں۔ اگر وہ آواز دے تو آج بھی گنگا اور جمنا کے کناروں سے بیسیوں وہیٹیو اور بائرن اُس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ مگر وہ بحث و مباحثہ تائید و تردید ریزولیشن اور ایجنڈا کی رسمی تقلید میں گرفتار ہے اور اُسے شاید کسی نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ ان چیزوں سے زیادہ اثر آفریں ملک میں بیداری پیدا کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی ہے۔ اور وہ شاعری ہے تقریروں کے درمیان کبھی کبھی نظم پڑھنے کا رسمی دستور اب بھی ہے مگر وہ ایک غلط دستور ہے۔ جس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور شاعر کی آواز "صدا بصحرا" ہو کر رہ جاتی ہے۔ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ قومی انجمنوں کے دوش بدوش قومی مناظمے منعقد کئے جائیں۔ اور ان مشاعروں میں بجائے غزلوں کے کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جائیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس مناظمے میں تمام ہندوستان کے شعرگو حضرات کو دعوت دے کر غلط مبحث کے لئے راستے کھول دیئے جائیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ خاص خاص شعرا کی ایک کافی تعداد اس مقصد کے لئے مدعو ہو۔ اور ان کی نظم خوانی کے لئے ایک خاص دن اور وقت اُسی پنڈال میں مقرر کیا جائے جو سیاسی مباحث طے کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ ہمارے ماحول میں ترقی و تعمیر کے وسائل و اسباب موجود ہیں۔ مگر ہماری محدود نگاہیں انھیں نظر یاب نہیں ہونے دیتیں۔ شاعر موجودہ زمانے کی نئی دریافت نہیں۔ وہ اسی ہندوستان میں صدیوں

سے گونج رہا ہے ۔ گرج رہا ہے ۔ اور اپنے افکار و تخیل کی بلندیوں سے انسانی پستیوں میں بیداری برسا رہا ہے ۔ اُسے آواز دو ۔ اُسے بلاؤ ۔ اُس کا خیر مقدم کرو ۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ غلامی سے آزاد ہونے کا علاج روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے میں ہے ۔ وہ تمہارے سامنے تاریخ ماضی کی شمعیں روشن کرکے رکھ دیگا ۔ اور اپنے پیام سے تمہاری سوئی ہوئی اور گمراہ ذہنیتوں میں بیداری اور صلاحیت کا پیدا کردے گا ۔ اُس میں ایسی کارواں بننے کی صلاحیت تمہارے موجودہ رہنماؤں سے زیادہ ہے ۔ اُس کی ایک نوا تمہارے ذہن کو منور، اُس کی ایک للکار تمہارے جمود کو متحرک، اور اُس کی ایک رجز تمہاری منزل کو قدمبوس کرنے کے لئے کافی ہے ۔

برادرانِ وطن! آپ نے شاعر کو سیاسی معاملات سے الگ کرکے بہت بڑا سیاسی نقصان کیا ہے ۔ آپ نے اپنے وطن کی ۱/۳ آبادی کو عضو معطل سمجھ لیا ہے ۔ اور آپ نے علم و ادب کی قوتوں سے دانستہ چشم پوشی کرلی ہے ۔ اگر آج یہ متروک جماعت آپ کے اجزائے عمل سے مربوط ہو جائے تو میں نہایت آزادی کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "منزلِ آزادی" کے حصول میں آپ اپنی توقع سے پہلے کامیاب ہو سکتے ہیں ۔

قومی انجمنیں تو ہمارے پُرتکلف اسٹیج ہیں ۔ جہاں تکلف اور صنعت کے سایہ میں، اطمینان و آرام کے ساتھ ٹھنڈا پانی، یا گرم چائے پی کر ہم دھواں دھار تقریریں کرلیتے ہیں ۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہمارے مقرر مُہر بر لب اپنے گھروں کی سب سے زیادہ اندرونی کوٹھری میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں "تا بہ میدانِ جنگ کہ رسد" مگر "شاعر" "شمع بزم" ہونے کے ساتھ ساتھ "صاعقۂ رزم" بھی ہے ۔ اُس نے ہمیشہ میدانِ جنگ میں اپنی پامردی کا ثبوت دیا ہے ۔ میدانِ رزم میں پہونچ کر اُس نے اپنی نوا کو شورِ قرنا پر غالب کردیا ہے ۔ اور اس کی ایک موزوں للکار پر قوموں نے کامیابی کے لئے اپنی جانیں لڑا دی ہیں ۔ پھر ایک ایسے ہمہ گیر مردِ میدان کو آپ اپنے ساتھ شریکِ کار کیوں نہیں رکھتے جو بزم و رزم دونوں جگہ آپ کا مشیر و معاون ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اور جو بغیر تیغ و تفنگ بھی براہ راست دلوں پر حملہ کرسکتا ہے؟

ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جہاں ملکی و اجتماعی قوتوں کو ہماری بے پروائی اور تن آسانی نے منتشر اور معطل کر کے کمزور کر دیا ہے۔ ورنہ دوسرے ممالک میں مردوں کے ساتھ خواتین کی بیداری اور سیاسیین کے ساتھ شعرا کی متحد العلمی ہمیشہ بروئے کار رہی ہے اور آج تک ہے۔ اجتماعیات کے اس مسئلے کو جتنی جلد حل کر دیا جائے اتنا ہی فلاحِ ملک و قوم کے لئے اولیٰ تر ہے۔

دوسرا خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب بیکر گارڈن آگرہ

۵۔ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

معزز شرکائے مشاعرہ و اعیانِ وطن!

خطبۂ صدارت کی ترویج

بزمِ ادب میں جو عزتِ صدارت آپ نے مجھے دی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کچھ عرض بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آج بزمِ ادب کے اس جلسۂ رنگین و رعنا میں آپ کو دو نئی باتیں یا بدعتیں نظر آئیں گی۔

(۱) یہ کہ مشاعرہ کا صدر آپ کے سامنے خطبۂ صدارت پڑھ رہا ہے۔

(۲) یہ کہ اس مشاعرے میں مبتدی متعلمانِ شعر کو غزل پڑھنے کا موقعہ دانستہ نہیں دیا گیا ہے۔

میں نے انھیں دو بدعتیں کہا ہے وہ بھی اس لئے کہ اگر بالکل نہیں تو قریب قریب دونوں باتیں سنتِ شعرا میں عام طور پر داخل نہیں ہیں۔ اس لئے ناممکن نہیں کہ بعض قدامت پسند حضرات انھیں بدعت سے تعبیر کریں۔ ورنہ یہ دونوں ایسی امتیازی خصوصیتیں ہیں جو ہمارے مشاعروں کو ممتاز اور منظم کر سکتی ہیں۔ پہلی خصوصیت کے متعلق میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشاعروں کی صدارت کبھی خاموش نہ ہونی چاہئے۔ اور صدر ہمیشہ کسی ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہئے جو اہلِ جلسہ کے سامنے اس کا ثبوت دے سکے کہ اسکے منہ میں زبان ہے اور زبان میں قوتِ بیاں بھی ہے۔ میں نے کسی سیاسی یا قومی مجلس کے صدر کو نہیں

دیکھا کہ وہ اہل مجلس کے سامنے نقش قالین بنا بیٹھا رہا ہو۔ محض عوام کے ساتھ "واہ واہ" میں شریک ہوجانا فرض صدارت سے سبکدوش نہیں کرتا۔ صدر مجلس کا فرض ہے کہ وہ جس مجلس کا صدر بنایا جائے اسکے اساسی مقاصد پر روشنی ڈالے۔ مجلس کا جس موضوع یا فن سے تعلق ہو۔ اس کے متعلق کوئی مفید بیان دے اور کم از کم شرکائے جلسہ پر یہ ثابت کردے کہ جو امتیاز بحیثیت صدر اُسے دیا گیا ہے وہ اس کا اہل ہے۔ میری رائے ہے کہ آئندہ نہ صرف ہمارے شہر میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا مشاعرہ منعقد نہ ہونا چاہیے جس کا صدر کوئی غیر متاثر ہو۔ اور کبھی کسی ایسے شخص کو منصب صدارت نہیں دینا چاہیے جو ہماری رہنمائی اور افادہ پذیری کے لئے اپنی زبان کو تکلیف جنبش نہ دے سکے۔

مبتدی اور منتہی شعرا کی شارکت

دوسری خصوصیت آج کے مشاعرہ میں مبتدی حضرات کی عدم غزل خوانی ہے۔ مبتدی کی تعریف یہ ہے کہ وہ نو آموز ہو اور اس کی عمر کی طرح مشق سخن کی عمر بھی زیادہ نہ ہو۔ ایسے طلبائے شاعری کے لئے مشاعروں میں شریک ہو کر غزل پڑھنے سے زیادہ مفید یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگانِ وطن اور مشاہیر شعرا کا کلام غور و فکر کے ساتھ سنیں اور اُن کی کہنہ مشقی، تجربہ کاری اور معلومات سے فائدہ اُٹھائیں۔

اساتذہ کے دوش بدوش بیٹھ کر غزل پڑھنا اور پھر داد سخن کا مطالبہ، میری رائے میں ایک قسم کی بے ادبی ہے جو طالب علمانہ جذبہ ظاہر نہیں کرتی اور جس سے مساویانہ ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے مبتدی اگر اپنے مشاعرے علیحدہ مقرر کریں اور اپنی حوصلہ افزائی کے لئے کہنہ مشق شعرا کو احترام و عزت کے ساتھ اپنے مشاعروں میں مدعو کریں تو یہ ایک مستحسن طریقۂ کار ہے۔ اس صورت میں کہنہ مشقانِ سخن کے لئے ناروا نہیں کہ وہ مبتدی شعرا کے کلام کی داد دے کر اُن کا دل بڑھائیں۔ اور اُن کے عیوب و محاسن سے بطریق احسن انھیں آگاہ کریں۔ مگر ان کی محفلوں میں اپنے لئے کوئی متکلمانہ حیثیت بہ اعتبار غزل گوئی اختیار کرکے اُن سے داد لینے پر حریص ہونا کسی طرح مناسب نہیں اگر استادانہ حیثیت سے مبتدی حضرات کے سامنے معیاری کلام مختصراً پیش کرنا ضروری اور لابد ہو تو چنداں معیوب نہیں لیکن مبتدی اور منتہی شعرا کی باہمدگر غزل سرائی بے جوڑ اور نامناسب ہے۔

آگرے کی شاعرانہ فضیلت برادرانِ وطن! آگرہ پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں فضلا، علما اور شعرا کا مرکز بن چکا تھا ازمنۂ مابعد میں بھی آگرہ نے زبان کی نشوونما اور پرورش میں نمایاں حصّہ لیا۔ تیسرے دور تک جو صہبائے سخن ہندوستان میں لنڈھائی گئی وہ اُسی بادہ کہن کا ایک جرعہ تھی جس کا میخانہ اکبر آباد یا آگرہ تھا۔ دورِ اکبری تک شاعری کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ تھا مگر ہندی آمیز اُردو، اور اُردو آمیز فارسی کا رواج عہدِ جہانگیر سے شروع ہوگیا۔ شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں شہزادۂ دانیال کے تذکرے میں ضمناً لکھتے ہیں کہ:-

"بہ نغمۂ ہندی مائل بودگاہے بزبانِ اہلِ ہند باصطلاحِ ایشاں شعرے می گفت۔"

"بدنبودے۔"

داراشکوہ کے منشی چندربھان برہمن اکبرآبادی بھی اُردو ہندی مخلوط زبان میں شعر کہتے تھے۔ گو فارسی میں ان کی مشقِ سخن بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جن شعرا کے ادبی کارناموں سے دارالسلطنت دہلی کی فضا مدتوں گونجتی رہی اُن میں اکثر اکبر آبادی تھے۔ میر، غالب، نظیر، اسیر وغیرہ اساتذۂ سخن آگرے ہی میں پیدا ہوئے۔ جن کے نام سے ادبی دنیا کا بچہ بچہ آج تک واقف ہے۔ میں اس اجمال کی تفصیل آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق بیان کرکے بطور واضح کردینا چاہتا ہوں۔

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تین حیثیتوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

(۱) جغرافیائی حیثیت سے،

(۲) تاریخی حیثیت سے،

(۳) اس حیثیت سے کہ دہلی کے زمانۂ شعر و شباب کی شہرت و عظمت میں شعرائے اکبر آباد (آگرہ) نے کتنا حصّہ لیا؟

جغرافیائی حیثیت سے، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ آج سے چند سال پہلے تک ایک ہی صوبے کے تین ممتاز شہر تھے، ممالکِ متحدہ میں انھیں تین شہروں کو وقتاً فوقتاً دارالسلطنت بننے کا موقع ملا ہے اور یہی

تین مقام مرکزِ ادبِ اُردو رہے ہیں۔

انتقال دار الصدر کے بعد بھی جغرافیائی حیثیت سے آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین تھا اور ہے اس لئے دہلی اور لکھنؤ کو آگرے سے وہی تعلق رہا جو کسی نہال کے برگ و بار کو اصل سے ہوتا ہے، ہندوستان کے نقشے میں اب بھی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کے محاذی خطوط کا وسطی حصہ ہے۔
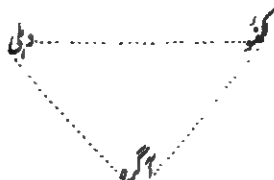
لہذا جغرافیائی اعتبار سے ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں اور لسانی حیثیت سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہونا چاہیئے۔

تاریخی توضیح یہ ہے کہ آگرہ سکندر لودی، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد سلطنت تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے اور اُردو زبان ان میں سے آخری تین بادشاہوں کے زمانوں میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے۔

عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا اُسے "اُردو"[۱۵] کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا وہاں لین دین بدستور اسی زبان میں ہوتا تھا، شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی، یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً اور تعظیماً "اُردوئے مُعلّے" کہلاتا تھا اس لئے اس نئی زبانِ مرکب کا نام بھی اُردوئے معلّے رکھا گیا۔

صاحب "ظہیر الانشا" کے اس بیانِ محقق سے ظاہر ہے کہ اس مخلوط زبان (اُردو) کی بنیاد سب سے

---

[۱۵] ظہیر الانشا۔

پہلے قلعۂ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا (ہندی اُردو) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اُردو شاعری وجود میں آئی۔

جلال الدین محمد اکبر کے عہد سے عہد شاہجہاں تک فارسی شاعری زیادہ مقبول و مروج تھی جسے مغل سلطنت اپنے آبائی وطن سے ساتھ لائی تھی، اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعرا موجود تھے۔ مثلاً شیخ ابو واجد فارغی، علامہ فیضی بن ملا مبارک، میر خشمی ملا صبوحی چغتائی، ملا شیدا، محمد امین ذوقی، عبداللہ سحری وغیرہ وغیرہ، لیکن اُردو شاعری کا رواج بتدریج عہد اورنگ زیب عالمگیر سے شروع ہوتا ہے۔

عہد شاہجہاں میں جب بعض سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت کا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل ہوگیا تو آگرہ کے ادبا اور شعرا نے بھی دہلی کا رُخ کیا، حتیٰ کہ جب دہلی سے کاروانِ ادب لکھنؤ پہنچا تو میر کارواں میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے۔

اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹلی اور نواب لطف اللہ خاں صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی خلف مرزا جان علوی آگرے ہی کی شاعر خیز خاک سے اُٹھے اور دہلی میں صدر الصدور بن کر بیٹھے۔

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا مولد گوالیار تھا لیکن اگر میر و غالب کی زادگاہ آگرہ ہونے کے باوجود انہیں دہلوی مانا جاسکتا ہے تو آبرو کو اکبر آبادی کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ جنکی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور جو عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں۔

عہد محمد شاہ میں (۱۷۲۰ء) میر باقر علی تخلص اکبر آبادی نے نقلِ وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیئے۔

خانِ آرزو کے ارشد تلامذہ میں میاں شرف الدین علی پیام اکبر آبادی بھی اسی عہد کے ممتاز شاعر تھے، بیشتر فارسی میں اور کمتر اُردو میں شعر کہتے تھے، یہ بھی آگرے ہی سے دہلی گئے، اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

اسی طرح میر باقر علی جعفر اکبر آبادی برادر زادۂ نظام الدین ممنون آگرے میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں دہلی چلے گئے۔

میر باقر حزیں اکبر آبادی مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد اور سپاہی پیشہ آدمی تھے، سادات آگرہ سے تھے، یہ بھی آگرے سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے بنگال چلے گئے۔

میر تقی میر میر عبد اللہ اکبر آبادی کے فرزند اور ہمشیر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر اپنے باپ عبد اللہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں راجہ ناگرمل کی رفاقت میں کچھ دن بسر کئے، دہلی اب اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اس لئے دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا، اور وہاں سے دوسرے شرفا اور اُدبا کی طرح آپ بھی لکھنؤ چلے گئے۔

محمد عارف عارف اکبر آبادی، میر تقی میر کے دوست تھے شیخ شرف الدین مضمون[۵۱] کے شاگرد تھے۔ رفوگری پیشہ کرتے تھے جب میر تقی میر دہلی گئے تو عارف اپنے دوست کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترکِ وطن کر کے خود بھی دہلی چلے گئے۔

مغل سلطنت کے آخری تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبر آبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد آگرے سے دہلی پہنچے۔ مرزا رفیع سودا میر اکبر آبادی کی طرح دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، مگر ان کے شاگرد رشید شاہ نصیر اور شاہ نصیر کے شاگرد ابراہیم علیخاں ذوق دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالب اکبر آبادی نے اپنا پرچم سخن ایسا لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

۱۸۶۹ء یعنی مرزا غالب کی وفات تک، آگرہ اور دہلی کا اتحاد و تعلق شاعرانہ اسی نوعیت سے تھا جس کا ذکر مجملاً میں کر چکا ہوں یعنی آبرو اکبر آبادی، آرزو اکبر آبادی، مظہر اکبر آبادی، مخلص اکبر آبادی، پیام اکبر آبادی، جعفر اکبر آبادی، حزیں اکبر آبادی، میر اکبر آبادی، عارف اکبر آبادی اور غالب اکبر آبادی، یہ سب آگرے ہی کی خاکِ پاک کے تربیت یافتہ تھے۔ آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان

۵۱ ان کا مولد قصبۂ جاجو ضلع آگرہ ہے اس لئے انہیں بھی اکبر آبادی ہی کہنا چاہئے۔ (مخزن نکات)

پڑھے میں تعلیم پائی، یہیں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر تاریخ ادب اُردو کا ہیرو بنا دیا۔

یہ میرا خیال یا بیان نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے مطالعہ کے تحت نکات الشعرا، مآثر الامرا، تصویر الشعرا، آبِ حیات، مخزنِ نکات، منتخب التواریخ، خزانۂ عامرہ، ظہیر الانشار، نتائج الافکار، تذکرۂ سرخوش، مرآۃ العالم، گلشنِ بیخار اور تذکرۃ الانساب وغیرہ کتابیں اور تذکرے موجود ہیں، ان تذکروں کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے جو کچھ کہا ہے میں اسے ایک تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں۔

آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق انہیں اربابِ فضل وکمال کی ذاتِ گرامی سے پیدا ہوا اور مرزا غالب اکبر آبادی ثم الدہلوی کے عہد پر کچھ عرصے کے لئے ختم ہو گیا۔

آگرے میں مرزا غالب کے کئی شاگرد تھے، جن سے مرزا کا سلسلۂ اصلاح ومکاتبت تمام عمر جاری رہا، منشی ہرگوپال تفتہ اکبر آبادی، رائے بہادر شیو نرائن آرام اکبر آبادی (سکریٹری میونسپل بورڈ متوفی سنہ ۱۸۹۹ء) مرزا تفضل حسین خاں تفضل اکبر آبادی (جو آگرہ میں کتب واری کرتے تھے پھر ریاست الور میں ملازم ہو گئے تھے) مولوی سید مددعلی تمیش اکبر آبادی، شیخ عبدالمجید سوا اکبر آبادی، بابو ہرگوبند سہائے نشاط اکبر آبادی یہ سب مرزا غالب کے عزیز شاگرد تھے، ان میں اکثر دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔

مرزا غالب، دہلوی بن جانے کے بعد بھی اپنے مولد و وطن آگرے کو نہیں بھولے وہ اکثر دہلی سے آگرے آتے رہتے تھے خصوصاً جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی خلف منشی حسین بخش اکبر آبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کی سخن فہمی کے متعلق مرزا غالب خود فرماتے ہیں:۔

> اس فرزانۂ یگانہ (یعنی نبی بخش حقیر) کو کس درجہ سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں، اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر میں نے جب تک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں جانا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ (اردوئے معلیٰ)

مرزا غالب کا اکثر آگرے آنا، اُن کے شاگردوں کا دہلی جانا، اور سلسلۂ مکاتبت و اصلاح برسوں جاری رہنا بھی دہلی اور آگرے کے تعلق شاعرانہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری دور برطانوی حکومت کی تاسیس و تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب حکومت کو مرکزیت حاصل نہ ہو تو ادب و شعر کی مرکزیت کہاں قائم رہ سکتی ہے؟ مغل سلطنت کے زوال سے جو عظیم سیلاب بے سکونی اٹھا وہ اپنے ساتھ ادبی رجحانات کو بھی بہالے گیا، مرزا غالب کی موت درا صل آگرے اور دہلی کے رابطۂ شاعرانہ کی موت تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۹ء تک دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تاریخ کے کسی صفحہ سے ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام زمانے میں آگرے اور دہلی کی بساط سخن شعراء سے معمور تھی، مگر ان میں پہلے سے ربط و اتحاد کا فقدان تھا، آگرہ میں ۲۹، ۳۰ سال تک شاعرانہ طوائف الملوکی رہی، شعر سے ذوق رکھنے والے آگرے ہی کے کسی دیرینہ مشق شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے رہے گر تیر و میرزا نے آگرے سے لکھنؤ اور دہلی پہونچ کر آگرے کا جو نام پیدا کیا تھا اسے باقی رکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔

فطرت کو آگرے اور دہلی کا یہ قطع تعلق منظور نہ تھا، آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۸ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کر کے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ آج "آگرہ اسکول" "دہلی اسکول" کی طرح ایک علیحدہ ادارہ فکریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرزا غالب آج بھی ہندوستان کے ادبی معیار کا آخری نقطۂ نگاہ ہیں۔ تیر، سوز و گداز، سادگی بیان اور تاثرات کی مصوری میں آج تک عدیم النظیر ہیں۔

میاں نظیر کو ہندوستان کا شیکسپیئر ماننے میں ہندوستان کیا یورپ بھی ہم آہنگ ہے۔

شعرائے آگرہ سے اپیل

متقدمین کی اس طول و طویل فہرست کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو متاخرین میں، حضرات مہر، ماہ، رسا، غریب، اصغر، رئیس، واصف، نثار، عالی (نور اللہ مرقدہم) نے بھی آگرہ کا ادبی امتیاز قائم رکھنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ ہم سب انھیں کے نام لیوا ہیں۔ انھیں کے سجائے ہوئے اور آباد کئے ہوئے گلزار سخن میں نوا سنج ہیں۔ آج بھی یہاں کے اکثر شعرا اطراف ہند میں مشہور ہیں۔ جن کے اقوال نہایت احترام و اعتبار کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ دور

بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ اور اُنکے بعد آپ ہی لوگوں میں سے اُن کے جانشیں چُنے جائیں گے۔ اگر آپ کو ذوقِ شاعری ہے تو استعداد و ذہانت کی پوری قوتوں کے ساتھ فنِ شاعری میں دستگاہ حاصل کرنی چاہئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ زمانے کی رفتار کیا ہے۔ زمانہ کو ہر جا رہا ہے۔ آپ سے کس قسم کی شاعری کا مطالبہ ہے اور آپ کس طرح زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں؟

غرور و ناز کی ضرورت نہیں خود نمائی و خود رائی کا موقع نہیں۔ کام کا وقت ہے کام کیجئے۔ نام خود چمک جائے گا۔ اگر آپ کے قلم میں قوت، طبیعت میں جودت، خیال میں وسعت اور کلام میں جاذبیت ہے تو دنیا آپ کا لوہا خود مان لے گی۔ اور زمانہ آپ کی اہلیت کا خود اعتراف کرلے گا۔

آج دُنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت تنازع للبقا میں سرگرم ہے۔ آپ کو بھی ایسی ہی کوشش کرنی چاہئے کہ آپ کا کلام اور آپ کا نام باقی رہے۔ اور جس طرح آج آپ متقدمین و متاخرین کو یاد کر کے اُن کے کارناموں کا احترام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آیندہ نسلیں آپ کے نام اور کام کی عزت کریں اور آپ کو بقائے جاوداں حاصل ہو جائے۔

حضرات مشاعرہ کی داد و تحسین کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس رسمی مطالبۂ نفس کی پروا نہ کیجئے قدرتِ کلام یہ ہے کہ جب شعر کاغذ پر آئے تو پڑھنے والا چند منٹ تک اپنی نگاہ اُس سے ہٹا نہ سکے۔ اس کی نگاہوں میں اس کا دل سمٹ کر آجائے۔ اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ نگاہوں کے راستے دل میں اُتر جائے۔

میں امید کرتا ہوں کہ میری آواز ضرور سُنی جائے گی اور ملک میں وہ دَور بہت جلد آجائے گا کہ ملک کو شاعر کی ضرورت محسوس ہوگی اور شاعر اپنے ملک کا ایک ممتاز پیشوا تسلیم کرلیا جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم شاعری کو من حیثیت الشاعری اور شعر کو من حیثیت الشعر کام میں لائیں۔ ہمارا کوئی اصول ہونا چاہئے۔ ہمارا کوئی نصب العین ہونا چاہئے۔ اور ہمارا کوئی نقطۂ نگاہ ہونا چاہئے صرف غزل گوئی ہمارے جادۂ عمل کو منزل رس نہیں بنا سکتی۔ قدما کی بات اور تھی اُن کا شاہانہ اور رنگین ماحول اُن سے وہی مطالبہ کرتا تھا جسے وہ اپنا لائحہ عمل بنائے ہوئے تھے۔ حکومت

قدر شناس تھی - ملک میں علم و ادب کی تحصیل کا ذوق و شوق تھا - مگر اب زمانہ بدل چکا ہے - آپ کی شاعری غیر شاعر گر تعلیم یافتہ طبقے میں مفید نہیں سمجھی جاتی - اس کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے - اسے "کارِ بیکاراں" کہا جاتا ہے - آپ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے - خدا کے لئے اپنی شاعری کو کارآمد بنایئے - اور اس الزام کو شاعری کے سر سے دور کر دیجئے کہ وہ ملک کے لئے مفید نہیں ہے.

میں قدیم طرزِ شاعری اور تغزل کے خلاف نہیں - خود بھی اسی کا پابند ہوں - مگر تھوڑی سی تجدید کے ساتھ - اگر ہم اپنا محاذِ شاعری واقعات و حادثات عالم کے دوش بدوش قائم کر دیں - اس طرح کہ جب کوئی حادثہ ظہور پذیر ہونے والا ہو تو ہمارا شاعر اس کی بھی مدافعت کر سکے جب ملک پر جمود و خمود طاری ہو تو ہمارا شاعر بیداری و حرکت کا صور پھونک سکے اور جب کوئی سانحہ شریکِ وقت ہو جائے. تو ہمارا شاعر اس کی چارہ فرمائی کے لئے قلم دردست نظر آئے اور اپنی فکر و نوا سے قوم و ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے - اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ میرے ہم وطن شعرا غزل گوئی کے علاوہ اصلاحی، اخلاقی، قومی ملکی اور سیاسی نظمیں کہنے کی عادت ڈالیں - اپنا کلام موقت الشیوع اخباروں اور رسالوں میں بھیجیں اور اس دائرۂ عمل سے ایک قدم آگے بڑھائیں جو ہمارے اکثر گوشہ نشیں اور گمنامی پسند وطنی بزرگوں کا اب تک مسلک رہا ہے -

مناظمے اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جہاں مقامی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں وہاں "مناظمے" بھی منعقد کئے جائیں اور کوئی موضوع دے کر اس پر شعرا کو بصورت نظم طبع آزمائی کی دعوت دی جائے.

شاعری کا تعلق لسانیات سے ہے - شاعری ہماری زبان میں وہ خزانے جمع کر رہی ہے جو اب سے پہلے بکھرے ہوئے پڑے تھے - شاعری ہماری شرقی روایات کی محافظ ہے - اس لئے شاعری کو تفریحِ محض اور مشاعروں کو بھی تفریح گاہ بنا دینے کی ضرورت نہیں - جہاں تک تہذیب و اخلاق معاشرت اور جذبات کا تعلق ہے ہم اپنی شاعری کو بصورت "اصلاح" پیش کر کے ملک کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور ہم اس شاعری سے وہ کام لے سکتے ہیں جو مہاتما گاندھی سول نافرمانی اور دول یورپ آتش بار جنگوں سے نہیں لے سکتیں -

تیسرا خطبہ

مشاعرہ امراوتی (برار)

۲۹- نومبر ۱۹۳۰ء

میرے بزرگو، دوستو، اور بچو!

میں آپ کی اس عنایت آمیز کشش کا معترف ہوں جو مجھے اپنے صوبہ سے کھینچکر آج صوبۂ برار کے ایک ایسے خوش سواد شہر میں لے آئی ہے جس کا نام میں نے اکثر سنا تھا۔ لیکن جس کی آب و ہوا اور فضائی لطافتوں سے میرے احساسات آشنا تھے۔ میں اسے بھی آپ کے ذوق کی نوازش سمجھتا ہوں کہ آپنے مجھے اپنے ادبی جلسہ کی صدارت تفویض فرما کر میری عزت بڑہائی جو میرے لئے بہرحال سبب افتخار ہے۔ یہ علمی ماحول مجھے بیشتر ارباب علم و کمال سے آباد نظر آرہا ہے۔ اور میرے لئے سب سے بڑی تسکین اس میں ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں اپنے ماحول کی اہلیت سے مایوس نہیں ہوں۔ امراوتی جغرافیائی حیثیت سے ایک ایسے صوبہ میں واقع ہے جس کے چاروں طرف کم و بیش تاریخی آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ہمسایہ صوبوں میں دکن کے علاوہ کوئی اور صوبہ ایسا نہیں جس نے لٹریچر میں، اور خصوصاً اردو لٹریچر میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔

برار جو آپ کا صوبہ ہے تاریخی حیثیت سے ہمیشہ صوبۂ دکن کے ماتحت رہا ہے۔ جہاں سلاطین بہمنیہ کے عہد میں، نیز قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں علم و ادب کے بیش از بیش چرچے رہے ہیں۔ اور جہاں اردو نے بھی دو آخری دوروں میں اپنے لئے ابتدائی گنجائشیں پیدا کی ہیں مگر جنوبی ہند میں صوبۂ

برار ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس کا نام اُردو شاعری کی تاریخ میں بارھویں صدی ہجری تک نظر نہیں آتا۔ اور یہ ایک حیرت ناک بات ہے۔ کیونکہ دکن ۱۰۱۵ھ میں اُردو شاعری کی نو آفریدہ شعاعوں سے درخشاں ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت وجیہ الدین وجدی دکنی کی دو مثنویوں پنچھی نامہ اور تحفۂ عاشقاں سے ملتا ہے۔

ان مثنویوں کی زبان آجکل کی اُردو سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ فارسی نہیں کہی جا سکتی۔ اشعار میں جا بجا کو کی بجائے کوں ہمیشہ کی جگہ نت، دیوانہ کی بجائے دوانہ اور کی بجائے ہور اور کسی کی جگہ کسو استعمال کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ تمام الفاظ قدیم اُردو کی ابتدائی شکلیں ہیں جن میں سے بعض میر کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں وجدی کے بعد ولی دکن کا مشہور شاعر ہوا۔ اور گو ولی کے کلام میں بھی قدامتِ الفاظ باقی رہی تاہم اس کے مشق یافتہ قلم سے بعض اشعار ایسے بھی نکل گئے۔ جو اگر آج کہے جاتے تو غالباً ان میں کسی مزید تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۵۵ھ ہجری تک اُردو شاعری کا صحیح مذاق دکن میں پہونچ چکا تھا اور اس کے بعد زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا۔ آصف جاہی دورِ حکومت کیساتھ ساتھ اُردو نے اور اُردو شاعری نے بھی ترقی کی یہاں تک کہ آج سلطان العلوم اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہٗ کے دورِ سلطنت میں دکن کا پایۂ تخت، حیدر آباد، اُردو کی ایک یونیورسٹی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسا خصوصی امتیاز ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے صوبہ کو ابتک میسر نہیں ہوا۔

میرا مقصد یہ ہے کہ ادب گاہِ دکن سے اس درجہ قریب ہونے کے باوجود بھی برار، ادب کے اُس لطیف ترین شعبے میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہ کر سکا۔ جس کا نام فنِ شعر ہے۔

مجھے بظاہر اس کا ایک ہی سبب نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ برار کا ماحول بدقسمتی سے ہمیشہ غیر شعری رہا ہے۔ مرہٹی۔ گجراتی اور دکنی زبانوں کے غلبے نے اُردو کو یہاں اُبھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اُردو صرف تجارتی اور معاشرتی ضروریات کے مطابق شائستہ حصول سمجھی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب زبانِ اُردو کا مذاق ہی نہ تھا۔ تو ادبِ اُردو کی نشو و نما کیونکر ہو سکتی تھی، مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ

اب ایلچ پور، اکولہ اور امراؤتی وغیرہ مقامات میں شاعرانہ مذاق پیدا ہو چلا ہے اگر اس مذاق کی نشوونما احتیاط و انضباط کے ساتھ ہوتی رہی تو مجھے یقین ہے کہ صوبۂ برار بھی ایک دن صوبۂ دکن کی طرح ادب اُردو کا گہوارہ بن جائے گا۔

حضرات! میں اُس انحطاط و زوال سے اچھی طرح آگاہ ہوں جو فن شعر پر طاری وساری ہے۔ میں اُس عام غیر دلچسپی سے بھی لاعلم نہیں جو اُردو داں طبقہ کو اس فن لطیف سے ہوتی جارہی ہے۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ یہ انحطاط، یہ زوال، اور یہ عدم دلچسپی ہماری ہی بے توجہی کے نتائج ہیں ہم نے خود اس فن لطیف کو اپنی سہل پسندیوں سے اس قابل بنادیا ہے کہ آج سوائے ذہنی تفریح کے شاعری کا کوئی اور مقصد معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہے، صورتِ حال اس کے خلاف ہے اُردو شاعری نے نظامِ حیات پر جس قدر احسان کیا ہے وہ بجائے خود ایک مبسوط تاریخ ہے۔ شاعری ہمارے تمدن میں، ہماری معاشرت میں، ہماری سیاست میں، اور ہماری عمرانی زندگی کی رگ رگ میں جذب ہو چکی ہے۔

مردہ قوموں کو اُبھارنا، بجھے ہوئے احساس کو مشتعل کرنا، اور عساکر کے قوائے عمل میں جزرومد پیدا کرنے کے علاوہ الفاظ کے مخارج منضبط کرنا، زبان کے محاورات محفوظ کرنا۔ سوئی ہوئی فضاؤں کو جگانا، جاگنے والوں کو عمل کے لئے تیار کرنا اور تخیل کو اُن ارتقائی خطوط پر پہونچا دینا۔ جہاں دوسرے فنون لطیفہ کی رسائی ناممکن ہے، صرف شاعر کا کام ہے۔

معزز حضرات، شاعری اور شاعر کا یہ درجۂ عروج، اور یہ ہمہ گیری موجودہ ارتقائی دور کا کوئی نیا معجزہ نہیں۔ بلکہ آپ تاریخ عالم کے صفحات اُلٹئے آپ کو معلوم ہوگا کہ ازمنۂ قدیم میں بھی مذہبی احکام نظم ہی میں قلمبند کیے جاتے تھے۔ سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکمت کا اشاعتی کام نظم ہی سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا ہزاروں اشعار اہلِ عرب کو زبانی یاد تھے۔ اُردو کی تخلیق سے صدیوں پہلے ہندوستان میں شاعری موجود تھی۔ کرشن اور بودھ کی مقدس تعلیم کا کافی حصہ قدیم ایرین زبانوں میں منظوم موجود تھا۔ ان

زمانوں کے بعد والمیک اور تلسی داس کی دل موہنے والی نظمیں اور حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے والے منظوم کارنامے آج بھی عہد گزشتہ کی پاکیزہ اور کبھی نہ مٹنے والی یادگاریں ہیں۔ کالیداس اور کبیر کے منظوم رشحات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی خلقی شاعر ہونے کے اعتبار سے، عرب کائناتِ ادب میں کتنے ہی سابق اور ممتاز کیوں نہ ہوں لیکن یہ کہنا ایک تاریخی غلطی ہے کہ ان کے سوا ساری دنیا اس عالمگیر جذبۂ شعری سے خالی تھی۔ گو وہ اپنے سوا ساری دنیا کو عجم ہی سمجھتے تھے۔ ہندوستان کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ یورپ کے متعلق بھی تحقیق ہو چکا ہے۔ کہ وہاں سب سے پہلا شاعر چاسر تھا۔ جس کا زمانہ یورپ کے عہدِ بیداری سے صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہے۔

اردو شاعری اپنی ہمسایہ زبانوں کی شاعری میں سب سے چھوٹی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں۔ کہ اردو شاعری نے اپنی تمکاس، دل آویزی اور جذبات آفرینی میں حتی الامکان دوسری زبانوں کی شاعری کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور آج اردو شاعری محاکات آفرینی، خیالات پیدائی۔ اور جذبات آرائی میں کسی زبان کی شاعری سے پیچھے نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اردو اس وقت پیدا ہوئی جب کہ دوسری زبانیں اپنے شباب کی منزلیں طے کر چکی تھیں۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ واضعانِ زبان نے اسے فارسی کا تقلیدی رنگ دینے اور فارسی اسلوب پر ڈھالنے میں بہت جلدی کی، اور حقیقت یہ ہے کہ ماحول کی مجبوریوں کی وجہ سے کوئی دوسرا رنگ دیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اسلامی سلطنت اور مسلمان، جس معاشرت اور تمدن سے متاثر تھے اسی سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ حالانکہ مقامی اور فطری اعتبار سے، اسے ہندی شاعری سے متاثر ہونا چاہیئے تھا۔

یہ تقلیدی رنگ اس قدر گہرا ہوتا چلا گیا، کہ گو ملک میں اردو کے ملک الشعرا اور خاقانیٔ ہند پیدا ہوئے لیکن صدیاں گزر جانے پر بھی کوئی مجدد یا مجتہد پیدا نہ ہو سکا۔

ہماری شاعری کی اساس، عربی عروض پر قائم ہے، موضوعات ایرانی شاعری کے مقروضِ منت ہیں۔ معاملات اور واردات میں شعرائے متاخرین، غالب، داغ، امیر اور جلال نے ایرانی معاشرت

سے بچ کر ایک راستہ ضرور نکالا لیکن وہ کبھی خطِ رخسار، بند قبا، اور کاکل و کلاہ سے اپنے موضوع کو آزاد نہ کر سکے۔ جو ایرانی مذاقِ شاعری کے عناصرِ ضروری تھے گو زمانہ ترقی کر گیا ہے، مغربی حکومت نیز ادبیاتِ مغرب کے اثرات سے ذہنیتوں میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے اور ملک میں شعرا کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کی شاعری اصولی طور پر فطری کہی جا سکتی ہے۔ تاہم شعرا کی اکثریت، اور شاعری کی دنیا آج بھی اسی تقلید میں ایک بڑی حد تک آلودہ ہے۔

اس قسم کی شاعری، جس میں تقلید اور غیر فطری جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ایک رواجی بدعت، ایک بے اصولی۔ اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے۔ جس میں عام اور پست نیز قدیم ترین معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ وصل، وصال ہم خوابی و ہم آغوشی، بوس و کنار اور ایسے ہی مخربِ اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ پھر رونا یہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اُس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لہجے میں ظاہر کئے جاتے ہیں جس سے تقلید اور نقالی تو ظاہر ہو جاتی ہے لیکن حقیقت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اگر اس قسم کی شاعری پر ملک کا تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ قہقہے بلند کرتا ہے تو میرے خیال میں وہ حق بجانب ہے اس لئے کہ ایرانی معاشرت، اور ایرانی شاعری جس سے اُردو شاعری اوّل اوّل متاثر ہوئی تھی۔ اور آج تک متاثر ہے خود اس درجہ انقلاب پذیر ہو چکی ہے کہ اگر آج طہرانیوں کے سامنے حافظ یا نظیری کے تتبع میں کوئی غزل پڑھی جائے تو وہ بھی ایک غمازِ تبسم کے علاوہ کچھ اور شاعر کی خدمت میں پیش نہ کر سکیں گے۔

ہندوستان کے اُردو شاعر کی سادہ لوحی اور پریشان خیالی کا اندازہ یوں فرمائیے کہ ایران میں زلفوں پر مقراض چل چکی بند قبا ٹوٹ چکے، کجکلاہی کا دور ختم ہو چکا، مگر ہمارا ہندوستانی شاعر ابتک خیالی زلفوں کی درازی سے طولِ شبِ ہجر کی پیمائش کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

جب طولِ شامِ غم سے بڑھیں دل کی وحشتیں   سایہ سمجھ لیا تری زلفِ دراز کا

حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کے طالب علم کی زندگی اصولاً غلط شروع ہوتی ہے۔ شاعروں

کی لائسنس سے مستثنیٰ اشرکت سے اس کے دل میں ایک تحریصی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ شعر کہنے لگتا ہے، ابتدائی نقائص واغلاط سے نپٹنے اور آگاہ ہونے کے لئے اُسے کسی ماہرِ فن سے استمداد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اس میں بھی بہت جلد کامیاب ہوجاتا ہے مگر اب اس کے رجحانات اور خیالات اخلاقی طور پر تابع اور محدود ہو جاتے ہیں۔ وہ ادب اور احترام کے اُس جذبہ سے مجبور ہوکر، جو مشرقی اقوام کا خاصۂ فطرت ہے اُسی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے جس پر اُس کا اُستاد یا رہنما اُسے لیجاتا ہے۔

کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسمِ منزل ہا

ایک عمر اسی پیروی میں گزر جاتی ہے۔ اور وہ ایک مصنوعی جہانِ خیال میں عمر کا کافی حصّہ گذارنے اور ایک طویل مشق کے بعد انھیں فرسودہ موضوعات کو کسیقدر پختگی کے ساتھ ظاہر کرنے لگتا ہے یہ گویا اُس کی معراج ہوتی ہے۔ اس معراج کے بعد جو اکثر تیس یا چالیس برس کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اختصارِ عمر اور قربتِ فنا کے تخیل سے اس کے قلب میں مذہبی یا صوفیانہ یا روحانی قسم کا ایک جذبہ فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ حقیقی شعرگوئی کا جذبہ ہوتا ہے۔ جس کی تکمیل کے بعد اُس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ حالانکہ یہ آخری منزل شاعر کی پہلی منزل ہونی چاہیے تھی۔ یعنی ایک شاعر کے لئے پہلی منزل منزلِ احساس، دوسری منزل، منزلِ تاثر، اور تیسری منزل، منزلِ تفکر ہوتی ہے۔ ان منازل سے گذر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اتنا موثر اور دل دوز ہوتا ہے کہ کائنات اُس کے استقبال کے لئے دل بدست نظر آتی ہے۔ غالب اسی مقام کی تفسیر اس طرح کرتا ہے ؎

ہے پرے منزلِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اسی سلسلہ میں، میں چاہتا ہوں کہ غزل اور تغزل کی تشریح بھی کردوں تاکہ یہ مسئلہ تاریکی میں نہ رہے، غزل فارسی اور اردو اصنافِ نظم میں ایک ایسی صنف ہے جس کا پتہ دوسری زبانوں میں نہیں ملتا۔ ایک غزل کی جامعیت بعض اوقات ہزاروں نظموں سے بڑھ جاتی ہے۔

تغزل اُس رنگ اور اسلوبِ بیان کو کہتے ہیں جو غزل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تغزل کا تعلق انسان کی لطیف ترین روحانیت اور نفسیات سے ہے۔ حسن و عشق، یاس و امید، وصل و فراق،

اضطرار و کامیابی اور اسی قسم کی مختلف فطری حالتوں کو گہرے تاثر کے ساتھ مصوّر کرنے کا نام تغزل ہے۔ غزل کی تعریف میں "با معشوق سخن گفتن" اور تغزل کی تعریف میں "معاملہ بندی" کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہئے۔ تغزل کے مختلف اسکول ہیں۔ لیکن عشقی تغزل وہی ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم کی گئی ہوں۔ اور جس میں ابتذال و رکاکت کا شائبہ تک نہ ہو۔

میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں۔ لیکن شاعری کو تغزل محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا میں جانتا ہوں کہ اردو شاعری میں "غزل" اس وقت ایک مدقوق مریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر اسے صحیح صورت میں زندہ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔

دنیا چلا رہی ہے زمانہ چیخ رہا ہے کہ خدا کے لئے تقلید محض کی لعنت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر پھینک دیجئے اگر تقلید ہی کرنی ہے تو عرب اور یورپ کی تقلید کیجئے جہاں شاعری کا موضوع کم از کم غیر فطری تو نہیں ہے۔ اور جہاں مناظر فطرت کی تصویر کشی اور حقیقی جذبات کی ترجمانی کا نام "شاعری" ہے۔ عام اس سے کہ اس کا تعلق حسن سے ہو یا محبت سے، معاشرت سے ہو یا معیشت سے۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی جگالی کے لئے مجبور کیوں کئے ہوئے ہیں اور ہم بیگانوں کے نقش قدم پر چلنے کو تدبیر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ اور تخیلی تشنگی کو نہیں بجھا سکتا؟ کیا ہندوستان کا سواد شعریت آفریں اور شعر نگار نہیں ہے۔ کیا گنگا اور جمنا کی موجوں میں، نیل اور نہر رکن آباد کا پرکیف تموج نہیں پایا جاتا؟ کیا ہمارے ملک کے جنت فریب باغوں میں بلبل سے بہتر کوئی خوش الحان طائر موجود نہیں؟ کیا ہم کوئل اور پپیہے کو محض اس تعصب کی وجہ سے اپنی شاعری میں دعوت شرکت دینا نہیں چاہتے کہ ہندی یا بھاشا شاعری میں اُن کے نغمے گونج چکے ہیں؟ کیا جمالیاتی ذوق کی نشو و نما تکمیل، اور مصرف صحیح کے لئے معیار نظر پر

صبیح اُترنے والا جمال، اس سرزمین حسن و محبت میں موجود نہیں؟ کیا ایران کے فرہاد و شیریں۔ نجد کے قیس و لیلےٰ۔ مصر کے یوسف و زلیخا۔ اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر روان، کنگ اور تارا، نل اور دمن۔ ہیر اور رانجھا کے وطنی افسانوں میں نہیں ملتا۔ کیا ذکر تجلی کے لئے حضرت موسیٰ بن عمران اور طور سینا مخصوص ہیں؟ اور بودھ یا کرشن یا ایسے ہی دوسرے عرفاں یافتہ انسانوں کا ذکر کرنا عیوب کلام کی کوئی شاخ ہے؟ اور کیا دار و رسن کی روایات زندہ کرنے کے لئے ہیں منصور حلاج کے علاوہ کوئی ملکی مثال کسی عہد میں نہیں ملتی؟

میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم آج اپنی شاعری کے تقلیدی موضوعات بدل دیں اور اپنے وطنی ماحول کے سرد و گرم اور رطب و یابس سے متاثر ہو کر نشاطیہ یا المیہ اشعار کہیں تو ہماری شاعری دوسری زبانوں کی شاعری سے نہ صرف ممتاز ہو سکتی ہے بلکہ آج بھی ہم میں، ہمارے ملک میں، اور ہماری جماعتی وسعت میں، حسان، فردوسی اور شیکسپیر سے بہتر شاعر پیدا ہو سکتے ہیں۔

بنگالی، سنسکرت، بھاشا، مرہٹی۔ گجراتی غرض کہ کسی زبان کی شاعری کو لے لیجیے، کسی میں اتنے غیر فطری، غیر ضروری، اور غیر حقیقی جذبات نہ لیں گے۔ جتنے آج ہماری اردو شاعری میں بھر دیئے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہماری نقالی، ہمارا بہروپیا پن۔ یعنی ہماری تقلیدی ذہنیت ہمیں ارباب علم و فضل کی نگاہوں میں ذلیل کر رہی ہے۔ اور ہم اپنی اس ذلت، اس توہین۔ اور اس تذلیل و تضحیک کو اپنے پندار کی غلطی سے سبب نازش سمجھ رہے ہیں۔

"العمدہ" عربی زبان میں تنقید کی ایک مسلمہ کتاب ہے اس میں شعر کی تعریف یہ ہے کہ "شعر فنون لطیفہ کی بہترین صنعت ہے جس میں مادیت نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلق روحانیت ہوتی ہے۔" ارسطو نے بھی اپنی کتاب تنقید میں شعر کی تعریف یہی کی ہے کہ اُسے مادی خیالات و رجحانات سے بالاتر ہونا چاہیے شعر کے علاوہ جس قدر فنون لطیفہ ہیں، یہاں تک کہ موسیقی بھی سب کی اساس مادیت پر قائم ہے۔ لیکن شعر الہام کی اعانت سے براہ راست شاعر کے دماغ میں وارد ہوتا ہے اور خیال اسے مرتسم کر لیتا ہے۔ جب شعر مطلق روحانیت اور ایک زائیدۂ الہام چیز ہے تو گیا اُس کے متکلم کو، اور اُس کے مصنف کو اس

مادی دنیا میں، تمام عالم اور تمام کائنات پر حاوی نہ ہونا چاہئے؟

افسوس کہ ایسا نہیں ہے ——— کیوں نہیں ہے؟ صرف اس لئے کہ ہم نے شعر کی روحانیت میں مادی اختلاط سے ایک غلط چیز کا اضافہ کرلیا ہے۔ ہمارے خیالات ردیف و قافیہ کی پابندیوں میں محدود ہیں۔ ہمارے ذہن کا رُخ الہام کدۂ حقیقت کی طرف نہیں۔ ہم صنم کدۂ مجاز میں اپنی جبینِ فکر، رواسم، رواج، تقلید، اور تائید کے خود ساختہ بتوں کے سامنے رگڑ رہے ہیں۔ ہمارا سر جھکا ہوا ہے۔ ہماری نگاہیں نیچی ہیں۔ اور ہم نے بالکل بھلا دیا ہے کہ اس فضائے پست کے علاوہ جو ہمارے ذہن و خیال کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی بلند فضا اور بھی ہے۔ جہاں ہمارے خیالات و احساسات کو پرواز کرنے کی اجازت ہے۔ اور جہاں ان خذف پاروں سے زیادہ قیمتی، تاروں کی معصومیت سے پیدا شدہ گوہر شاہوار ہمیں مل سکتے ہیں۔ اور ہم روح القدس کی امداد و تائید سے ظلمت کدۂ عالم کو منوّر و متجلی کر سکتے ہیں۔

مجھے اکثر یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں کے مشاعروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا ہے ایسے ہر انسٹی ٹیوشن، اور ایسی ہر درسگاہ میں مجھے طلباء سے توقع رہی ہے۔ کہ وہ میرے سامنے اور تمام مہذب و تعلیم یافتہ سامعین کے سامنے، انتہائی بلند خیالی، اعلیٰ ترین اخلاق، اور پاکیزہ ترین معیارِ ذوق کے نمونے پیش کریں گے مگر مجھے کس قدر مایوسی ہوئی جب اُن کے اساتذہ اُن کے پروفیسروں ان کے اعزا، اُن کے احباب اور سنجیدہ سے سنجیدہ سامعین کی موجودگی میں، میں نے ان کی زبان سے اس قسم کے اشعار سُنے کہ؎

وصل کی رات ہے اب شرم و حیا رہنے دو
اپنے سینے پہ مرا ہاتھ ذرا رہنے دو

خیال کی عمومیت و رکاکت، شعر کی عام فہمی، اور وقتی تفریح پر ہر طرف سے "واہ واہ سبحان اللہ" کی سقف پاش آوازیں بلند ہوئیں۔ اور صاحبزادے جھک جھک کر سعادت مندانہ سلیقہ کے ساتھ ہر آواز پر سلام و آداب کرنے لگے۔

حضرات، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا مصیبت ہے، کیا طلبا کی ادبی تعمیر و تہذیب کا یہی طریقہ ہے۔ اور کیا اس تخریب کی اصلاح ضروری نہیں؟

میں مقتدر شعرا، اور معزز طلبا سے معافی خواہ ہوں کہ میں نے اُن کی بہت سمع خراشی کی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے اُن کا وقت ضائع نہیں کیا۔ اس موضوع پر ہنوز تشریحی تقریر کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ میں نے اُن کے سامنے شاعری کے موجودہ انحطاط کے مختصر اسباب بیان کر کے اختصار و اجمال کے ساتھ انھیں بتایا ہے کہ ہماری شاعری اگر بدنام ہے تو اس کا سبب ہماری ہی غلط روی ہے۔ ہم دانستہ اپنے ماحول کو گمراہ اور برباد ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی شاعری کو تنگ خیالی، پستیٔ فکر، اور غیر فطری رجحانات میں مقید کر دیا ہے۔ لیکن ہم جب چاہیں ان حدود و متعینہ سے جست کر کے باہر نکل سکتے ہیں ہم جب چاہیں اپنی ذہنیت کو ارفع، اپنے خیالات کو بلند، اور اپنے احساسات کو بلند تر بنا سکتے ہیں۔

اس تمام تقریر کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ فطری۔ ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیئے۔

ہماری ہر نظم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق، اہلِ ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیئے، اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذباتِ عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیئے جس میں ہمارے نوجوان، ماضی، حال، اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں، جو ہمیں تدبیرِ منزل اور شاہراہِ ترقی بتا سکے اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے۔

چوتھا خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب۔ ڈیرہ دون

۱۳۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

معزز حضرات!
میں اُس عظمت کے اعتراف میں آپ کا شکرگزار ہوں جو اس ادبی مجلس میں بصورت صدارت آپ حضرات کی طرف سے مجھے عطا فرمائی گئی ہے۔ کسی شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ میں کامل ۳۶ سال سے ادب اُردو کی خدمت کر رہا ہوں مجھے حق ہے کہ میں اپنے ناچیز خیالات آپ حضرات کے سامنے پیش کروں، ایسے خیالات جن کا تعلق ادب اور شعر سے ہے۔

جہاں تک میری ناقص یادداشت مجھے مدد دیتی ہے، مشاعروں میں خطبہ خوانی کا محرکِ اوّل میں ہوں۔ اور سب سے پہلا خطبہ سنہ ۱۹۲۲ء کے آل انڈیا مشاعرۂ گیا میں میں نے پڑھا ہے۔

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح وہ میں ہوں ۔ ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

آپ خود غور فرمائیں کہ جب مجلسِ مشاعرہ ایک ادبی مجلس ہے جب شعر و شاعری علم و ادب کی ایک صنف ہے تو دوسری سیاسی، معاشرتی، اخلاقی قومی اور تعلیمی مجلسوں کی طرح مجلسِ مشاعرہ کا افتتاح بھی خطبۂ صدارت سے کیوں نہ ہو؟ کیا ضرورت ہے کہ حکومت کا کوئی فرد، ضلع کا کوئی سرمایہ دار شہر کا کوئی شائق، یا ملک کا کوئی اور مشہور شخص جو غیر شاعر ہو۔ ہماری شعری اور ادبی مجلس کا صدر

بن کر ہم پر خاموش حکومت کرے۔ کیا ہماری جماعت میں خطیبوں اور رادیوں کی کمی ہے۔ اور کیا ہم میں اپنی جماعتی مجالس کی صدارت و قیادت کی اہلیت نہیں ہے؟

وجاہت و امارت کی مرعوب کن شان کے ساتھ مسندِ صدارت پر ایک غیر شاعرانہ حیثیت سے کسی معزز شخصیت کے برائے نام رونق افروز ہونے سے بہتر یہ ہے کہ ایک غریب شاعر جو اس فن لطیف پر عبور رکھتا ہو جو ادبی دنیا کے مالۂ و ماعلیہ سے واقف ہو ہمارا صدر بنے اور صدر بننے کے بعد ہمارے سامنے اپنے تجارب اور ذخائرِ معلومات سے کچھ ایسی باتیں پیش کرے جو ہماری ادبی اور فنی ترقیوں میں مدد دے سکیں۔ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے مشاعروں میں "خطبہ خوانی" کے رواج کو، اپنی پوری قوتوں سے، اپنے جرائد کی قوتوں سے، اور اپنے احباب و تلامذہ کی قوتوں سے وسعت دینے کا کام عملاً شروع کر دیا ہے اور آپ سُن کر مسرور ہوں گے کہ میں اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوں۔

غالباً آپ بھی میری تائید فرمائیں گے، اور آئندہ کبھی کسی ایسے نمائشی مشاعرہ میں شریک نہ ہوں گے جس کا صدر کوئی غیر شاعر ہو یا جس میں خطبۂ صدارت پڑھے جانے کا یقین نہ ہو۔ اور جس کا مقصد صرف غزلخوانی اور رسمی داد و تحسین تک محدود ہو۔

حضرات! میں آپ کا عزیز اور قیمتی وقت جو آپ نے آرام دہ لحافوں گرم کردں، اور میٹھی نیندوں کا ایثار کر کے اس ادبی مجلس کے لئے وقف کیا ہے، اُردو شاعری کی اولیات۔ مراکزِ ادب کی تعیین و تخصیص، گل و بلبل کے ترک کرنے کی حدیث کہن اور اُردو کی داستان دیرین سنا کر ضائع نہیں کروں گا۔ بلکہ میں آپ کے سامنے ایک ایسی بات پیش کروں گا۔ جو آپ کے لئے باعتبار موضوع نئی ہوگی۔ اور جس کے سُننے کے بعد آپ کا ذہن غور و فکر کے لئے مجبور ہو جائے گا۔

آج ہماری اُردو شاعری کی پیدائش کو تقریباً تین سو برس گزر چکے ہیں، اس تمام عرصہ میں ہماری شاعری عرب اور ایران کی مقلد رہی ہے۔ اور کس قدر تعجب و حیرت کی بات ہے کہ اس طویل مدت میں آج تک کوئی مجدد اور کوئی مجتہد ایسا پیدا نہ ہو سکا جو ہماری شاعری کو "ہماری شاعری" بنا کر

کم از کم موضوعی اور اساسی تقلید ہی سے آزاد کر دیتا۔

فن شاعری کی اساس علم عروض پر قائم ہے۔ اور عروض خلیل ابن احمد اور ابو الحسن اخفش عربی کی ایجاد ہے۔ جو بحریں اہل عرب نے ایجاد کیں ان کا اتباع فارسی شعرا نے بھی کیا۔ لیکن یوسف نیشاپوری۔ اور بزرجمہر وزیر نوشیرواں نے اُن میں بعض تصرفات کئے اور بعض عربی بحریں ترک کر دیں۔ ہم نے بھی عربی اور فارسی ایجادات میں ترک و اختیار سے کام لیا۔ لیکن کبھی ہمیں اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ ہم اپنی شاعری کے لئے اپنی بحریں ایجاد کرتے، اپنی زبان میں اوزان مرتب کرتے، اور فنی اصطلاحیں وضع کر کے ہندوستانی ذہنیت کی خلاقی کا ثبوت دیتے۔

ہندوستان کی ہر قدیم زبان میں شاعری موجود ہے۔ لیکن ہر زبان کے ذاتی قواعد بھی موجود ہیں۔ اُن کے ذاتی مصطلحات بھی موضوع ہیں۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ مشہور زبان ہندی کو لے لیجئے۔ گو اس کے وجود سے پہلے سنسکرت ایک کل زبان ہونے کی حیثیت سے ملک میں موجود تھی اور سنسکرت شاعری کے قواعد بھی منضبط تھے۔ لیکن ہندی شاعر نے اُس کا محتاج اور مقلد ہونا پسند نہ کیا۔ اور شاعری کے لئے اپنے ذاتی قواعد و قوانین الگ بنا لئے۔ جن کا نام "کوتا" رکھا گیا۔ اسی اعتبار سے ہندی میں شاعر کو "کو" اور شعر کو "کوت" کہتے ہیں مصرع کو "پد" اور نظم کو "پد" لکھتے ہیں۔ دوہا، چوپائی، سورٹھا، ترونگ چھند، من ہرن چھند، لاونی، کنڈلیا، سویا، وغیرہ نظم کی سیکڑوں قسمیں وضع کی گئیں اور مصرع طرح کے لئے "سمسیا" ایک خاص لفظ مقرر کیا گیا۔

ہندی میں تقطیع کرنے کے لئے ارکان کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تقطیع صرف ماتراؤں اور لَے یعنی بحر کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ہرسو اور دیرگھ۔ دو قسم کی ماترائیں ہیں۔ دونوں مصرعوں میں ہم تعداد ماترائیں لانے سے ایک خاص دُھن میں ہندی شعر مرتب ہو جاتا ہے۔ پھر اصناف نظم کا تسمیہ یوں کیا جاتا ہے کہ چار ٹکڑوں کا ایک شعر جس کے ہر مصرعہ میں ۱۶ ماترائیں ہوں "چوپائی" کہلاتی ہے اور چار ٹکڑوں کا ایک شعر جس کے آخر میں قافیہ ہو "دوہا" کہلاتا ہے۔ اگر قافیہ درمیان میں آجائے تو

سور تھا ہے ۔ ۲۴ حروف کا چھند ہو تو اُسے سویّا کہتے ہیں ۔ کبھی "وزن" یعنی الفاظ کی یکسانی اور ہم تعدادی سے بھی شعر کا وزن قائم کیا جاتا ہے ۔ ایسے شعر "ورن چھند" کہلاتے ہیں اور دوسرے "ماترا چھند"۔

اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک موزوں طبع ہندی شاعری کا طالب علم، لَے اور ماتراؤں کے ذریعے نہایت آسانی کے ساتھ بے تکلف ہندی شعر مرتب کر لیتا ہے اور اُسے ہماری طرح "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن" کی گردان نہیں کرنی پڑتی۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے مگر اردو شاعری کی بساط پر وہی پرانے مُہرے گھسے جا رہے ہیں ۔ جو ابتداءً صرف اس لئے استعمال کئے گئے تھے کہ اردو زبان نامکمل تھی ۔ کلاسیکل نہ تھی ۔ اور اس کا خزانہ تعمیری سامانوں سے خالی تھا۔

اودھ کے دورِ عروج و اقبال میں، جب نواب سعادت علی خاں تختِ حکومت کی زینت تھے، انشاء اللہ خاں انشاؔ کو سب سے پہلے اردو میں یہ کمی محسوس ہوئی اور انشاؔ نے اردو شعر کی تقطیع کے لئے بعض اردو ارکان وضع کئے ۔ مثلاً "مفاعیلن" کے لئے "پری خانم"۔ "فعلان کے لئے "بی جان" "فعلن" کے لئے "خانم" وغیرہ وغیرہ ۔ اس طرح اگر انہیں اپنے اس مصرع کی تقطیع کرنی ہوتی کہ "مجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں" تو وہ بجائے "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" کے "پری خانم پری خانم پری خانم پری خانم" کہہ کر اس ضرورت کی تکمیل کر سکتے تھے ۔ لیکن یہ اختراع مزاح کا پہلو لئے ہوئے تھی ۔ اس لئے کہ جب عروض و ضرب یا صدر و ابتدا کو مقبوض و مکفوف کیا جاتا تھا تو کہیں "پری خ" رہ جاتا تھا اور کہیں "پری خاں" ہو جاتا تھا ۔ لہٰذا خوش وقتی کے لئے نوابی دربار میں "عروضِ انشائی" کچھ عرصہ تک جاری رہی ۔ اور چونکہ یہ اختراع کوئی علمی اختراع نہ تھی اس لئے باقی نہ رہ سکی، نہ اسے کسی نے رواج دینے کی طرف توجہ کی۔

بیشک عربی اور فارسی مسلمانوں کی قدیم قومی زبانیں ہیں ۔ جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آئی ہیں، اس لئے عقیدت کی طرف سے یہ تنبیہ کی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں زبانوں کی تقلید ہمارے لئے منتہائے سعادت مندی ہے ۔ لیکن یہاں

عقیدت کا سوال نہیں، علم و فن کا سوال ہے۔ ہم عقیدتاً اور مذہباً عربی و حجازی مراسم کی تقلید کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں لیکن جب وطنیت کے اعتبار سے لسانی سوال پیدا ہوتا ہے تو ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم فنی نقطۂ نگاہ سے اردو شاعری کے قواعد بھی اپنے ہی بنائیں۔ تاکہ ہماری زبان اور ہماری شاعری کسی دوسری زبان کے قواعد و ضوابط کی محتاج اور پابند نہ رہے۔

پھر ہندوستان میں اردو شاعری صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ دوسری قومیں بھی اردو میں شعر کہتی ہیں اور اچھے شعر کہتی ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے کہ وہ بھی آپ کی عقیدت و ارادت کا اتباع کر کے عربی اور فارسی قواعد کی پابندی پر مجبور ہوں۔

مجھے معاف فرمایا جائے اگر میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ اس مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان شعرا میں بھی آج اکثر ایسے ہیں جو عربی کے منتہی نہیں اور بیشتر ایسے ہیں جو فارسی بھی نہیں جانتے۔ لیکن انہیں شعر کہنے کا فطری ذوق ہے انہوں نے میزان و منشعب کا مطالعہ بھی نہیں کیا نہ وہ عربی صرف و نحو سے واقف ہیں۔ اور یہ بھی محض اس لئے ہے کہ ہندوستان میں عربی و فارسی تعلیم کا رواج باقی نہیں رہا ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عربی و فارسی جس طرح تعلیم کی جاتی ہے وہ ایک طالب علم کے لئے فاضل عربی بننے کے لئے ہرگز کافی نہیں اور تبدیلیٔ فضا سے قدرتی طور پر ان علوم کے ساتھ ایک بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ پھر آپ اُن سے کہتے ہیں کہ

جگا دیتی ہے دُنیا کو صدائے الاماں میری

کی تقطیع یوں کرو "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" آپ اُنہیں بتاتے ہیں کہ اس بحر کا نام "ہزج مثمن سالم" ہے۔ وہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں۔ لیکن میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر اُن سے مثمن اور سالم کے معنی پوچھے جائیں تو وہ منہ تکنے کے سوا اور کوئی جواب نہ دے سکیں گے یہ اُن مشکلات کا ایک جزوی نمونہ ہے جو عروض کے عربی میں ہونے سے لاحق ہیں۔ اگر فی صدی ایک شاعر ماہر فن ہو تو اس سے ان ہزاروں اردو شعرا کی دشواریوں کا حل نہیں ہوتا جو شعر

کہتے ہیں۔ مگر شعر کہنے کے قاعدے صرف اس وجہ سے نہیں جانتے کہ وہ قاعدے اُنکی زبان میں نہیں ہیں۔
اس کے علاوہ عربی عروض میں بعض غیر ضروری قیود ایسی بھی ہیں۔ جو واضع نے کسی وقتی ولسانی ضرورت سے وضع کی تھیں، اگر قواعد کے ساتھ وہ بھی جزوِ شاعری بن کر ہم تک چلی آئیں، مثلاً ایک ایطا ہی کو لے لیجئے جسے فصاحت کا سب سے بڑا عیب تسلیم کیا گیا ہے۔
ایطا قافئے میں کلمۂ آخر (متحد المعنی) کی تکرار کو کہتے ہیں۔ یعنی اگر اُس کلمہ متحد المعنی کو قافیوں سے الگ کر دیں تو جو کچھ باقی رہے وہ الفاظ بامعنی ہوں اور اُن میں حرف روی قائم نہ ہو سکے۔ جیسے مطلع کے ایک مصرع میں "دردمند" ہو اور دوسرے میں "حاجتمند" "مند" جو دونوں قوافی میں ایک ہی معنی رکھتا ہے اگر نکال ڈالا جائے تو "درد" اور حاجت بامعنی الفاظ رہتے ہیں۔ اور ان میں حرف روی مشترک نہیں ہے۔ اس لئے یہ "ایطا" ہے۔
عربی شعراء ایطاسے نہ بچتے تھے، فارسی شعرا بچتے رہے۔ اور اُردو شعرائے متقدمین ومتاخرین بھی اسی احتیاط کے اسیر نظر آتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایطا سے مطلع کی کیفیات اور معنویت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ روی کے بعد قافیہ بامعنی باقی رہے یا بے معنی۔ آخر اس قید سے اور شاعری سے کیا تعلق؟ مگر نہیں۔ اگر آپ ایسا کوئی مطلع کسی ماہر فن شاعر کے سامنے پڑھیں گے۔ تو وہ آپ کی فنی قابلیت سے ضرور منکر ہو جائے گا۔ اور منہ پر نہیں تو دل میں ضرور سمجھ لے گا کہ "قدر قادر الکلامی معلوم شد" شاعری کا تعلق حقیقت میں روحانیت سے ہے۔ اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ وجدانی ہونا چاہئے اور اگر وجدانی نہ ہو تو کم سے کم ایسی غیر ضروری قیود اور پابندیوں سے تو اُسے ضرور آزاد ہو جانا چاہئے جو اُس کے پیکر لطیف پر آہنی زنجیروں سے زیادہ گراں معلوم ہوتی ہیں۔
اگر سوسائٹی کا دباؤ تیور بدل کر آنکھیں نہ دکھاتا اور اُردو شعرا کے مذہب کی اساس روشن خیالی پر ہوتی تو میں آج سب سے پہلے اعلان کرتا کہ ایطا کا ترک اختیار کر لیا جائے۔ اور اس غیر ضروری قید کو شاعری سے اُٹھا دیا جائے۔ مگر مجھے اپنے ایک دوست کا یہ قول ہمیشہ یاد رہے گا

کہ "انسان کا ضمیر اُس کے ماحول میں رہتا ہے"۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ماحول ابھی تاریک ہے، اور قدامت اپنی تمام سخت گیریوں کے ساتھ ہنوز کارفرما ہے۔ گو ہمارا تمدن ہمارا لباس اور ہماری معاشرتی ضروریات زمانہ کے لحاظ سے بدل چکی ہے اور اُسے غیر ملکی تمدن و معاشرت سے اب کوئی تعلق نہیں رہا ہے لیکن اُردو شاعری ابھی اپنے اُسی محور پر ناچ رہی ہے جو آج سے تین سو برس پہلے اُس کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

گرامی حضرات! میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح تقلید سے اجتہاد کی طرف بڑھنا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری جماعت میں فاضل و عالم اور ارباب کمال زیادہ سے زیادہ موجود ہیں۔ جب ان میں سے بعض کو عربی فن عروض پر کامل عبور حاصل ہے تو وہ اُسی سے اُردو عروض کی تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔ اور قواعد شاعری اپنی ہی زبان میں مرتب فرما سکتے ہیں۔ ایسے قواعد جو ہندوستان کے ہر طبقہ میں بآسانی سمجھے جائیں جن کے سمجھنے کے لئے ہمیں کسی دوسری زبان کا منت کش نہ ہونا پڑے جو ہماری لسانی اور ماحولی ضرورتوں کے مطابق ہوں۔ اور جن میں ایطا جیسی غیر ضروری قیود قطعاً نظر انداز کر دی جائیں۔

یہ کام کسی ایک شخص کی کوشش سے انجام نہیں پا سکتا۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک مجلس شوریٰ کی ضرورت ہے۔ جس کے ارکان باہم تبادلۂ خیال اور آپس کے مشوروں سے اردو بحریں، اُردو اوزان اور اردو اصطلاحات قائم کریں۔ اور اُردو شاعری کی اساس ایسے آسان قاعدوں پر رکھیں جو اس اسکول کے طلبا کے لئے موزون و مناسب ہوں۔

مجھے تعجب ہے کہ "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن" نے بھی اس خصوص میں اب تک کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت، طبیعیات اور اکثر علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم ہوئے اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ لیکن "فن عروض" کی تمام مصطلحات علیٰ حالہا عربی میں قائم رہیں۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو اُردو یونیورسٹی کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یا کسی نے اُسے اس طرف متوجہ نہیں کیا۔

عدم توجہ کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہندوستان کی شاعری اور شعرا دونوں انحطاط و زوال اور بے قدری و کس مپرسی کی پستی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری محض ذریعۂ تفریح اور شاعر صرف نقال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آپ کسی شاعر کا تعارف کسی فلاسفر یا فاضل سیاست سے کرائیں تو وہ ایک واضح اور بامعنی تبسم کے ساتھ گردن ہلا کر شاعر سے مصافحہ کرے گا اور اس تبسم کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اس کی نگاہوں میں شاعر کی کوئی خاص وقعت و عظمت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فلاسفر سے ایک مورخ یا سیاست داں متعارف ہوگا تو دونوں کے تیوروں سے ایک خاص سنجیدگی برستی ہوئی نظر آئے گی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جانبین کو ایک دوسرے کے کمال کی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہے۔

تو کیا واقعی شاعری اس قدر ذلیل اور غیر وقیع چیز ہے؟ ہرگز نہیں، شاعری ایک بہترین عطیۂ فطرت ہے، ایک لطیف ترین روحانی جذبہ ہے۔ جو خصائص السنۂ مغربیہ اور السنۂ مشرقیہ کی شاعری میں جدا جدا موجود ہیں وہ بیک وقت قدرت نے اردو شاعری کو ودیعت فرمائے ہیں۔ عرب اپنی رزمیہ شاعری کے لئے مشہور ہے۔ مغرب اپنی فطرت نگاری پر نازاں ہے۔ ہندی شاعر جذبات کا خالق ہے۔ یونان فصاحت کا مبلغ ہے جرمنی نفسیات کی تحلیل پر حاوی ہے ایران قومیات کی تبلیغ کا علم بردار ہے۔ مگر میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اردو شاعری میں رزم بھی ہے بزم بھی۔ فطرت نگاری بھی ہے۔ رومان بھی ہے۔ تحلیل نفسی بھی ہے اور جذبات کی ترجمانی بھی۔ قومی تبلیغ بھی ہے اور سیاسی تلقین بھی۔ یہ صرف ہماری سہل پسندیاں اور غفلت کاریاں ہیں کہ اردو شاعری روبہ زوال نظر آرہی ہے۔ ہم قافیہ پیمائی۔ معاملہ بندی۔ نیوٹ۔ مبالغہ۔ تکلف اور آورد کی دلدل میں اس طرح پھنس گئے ہیں کہ ہمیں نکلنے کے لئے راستہ نہیں ملتا۔ اگر ہم فکر و تامل سے کام لیں تو اسی خارزار قدامت و تقلید سے ایجاد و اختراع کے پر بہار چمن پیدا ہو سکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اب ہمیں تقلید کی تاریکیوں سے نکل کر تجدید کی روشنی میں آجانا چاہئے۔ ہمیں اپنی ایک جمعیۃ جلد از جلد قائم کر لینی چاہئے جو تقسیم کار کے اصول پر کاربند ہو کر اس فن لطیف

سے قدامت و عمومیت کے حجابات اٹھا دے اور ہمارے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کر دے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اُردو شاعری کو عصر موجود کی سب سے لطیف اور سب سے اہم صنف بنانے پر قادر ہو جائیں - اور جب ہمیں - ملٹن - ہومر - شکسپیر اور گوئٹے کا نام لے کر مرعوب کیا جائے - تو ہم بجا طور پر کہہ سکیں کہ آج ہندوستان میں بھی اُن کی مثالیں موجود ہیں - جب ہمیں - اصمعی - قیس - یوسف معلقہ اور اخفش کے ادبی کارنامے سنائے جائیں تو ہم بتا سکیں کہ ہندوستان میں بھی اس ذہنیت کے حامل نایاب نہیں ہیں - اور جب ہمارے سامنے نظامی - فردوسی - عرفی - قاآنی - ظہیری اور خیام کا نام لیا جائے تو ہم یقین دلا سکیں کہ ہندوستان میں بھی اُن کے معنوی جانشین موجود ہیں -

مشاعروں میں شریک ہونا - کسی مصرع طرح پر غزل لکھ لینا اور اُس کے صلہ میں "واہ واہ" کی لفظی داد حاصل کر لینا آج ایک مبتدی اور نومشق طالب علم شعر کے لئے بھی آسان ہے - لیکن آپ حضرات میں سے جو لوگ اپنی عمریں اس فن شریف و لطیف کی نشو ونما میں صرف کر چکے ہیں اب اُن کا کام کچھ اور ہونا چاہئے - اُن کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ شاعری اور شعراء کے لئے اجتہاد کے دروازے اپنے آزمودہ کار قلم کی قوت سے کھول دیں - اور اُردو شاعری کو اُس ارتفاع پر پہنچا دیں جس کے لئے وہ حقیقت میں بنائی گئی ہے -

مشرق میں ایران صدیوں انہیں موضوعات شاعری کا مقلد رہا جس پر ہمارے تغزل کا دارومدار ہے - لیکن آخر ایک زمانہ ایسا آیا کہ احمد شاہ کجکلاہ کی غفلتوں اور عیش پسندیوں نے ایران کی سیاسی فضا کو تیرہ و تار کر دیا - اور یہی وہ وقت تھا کہ ایرانی شاعر کی ذہنیت نے بھی ایک نئے انقلاب کو دعوت دی - ایرانی شاعر جدید احساسات اور جذبات زندگی کے ساتھ اپنا قلم لیکر اُٹھا - ایک قائد ملک کی طرح گرجا اور ایک الہامی ہادی و مبلغ کی طرح گونجا - اُس نے اپنے زائیدہ ہائے طبع سے وطنی سیاست میں ایک عظیم ہیجان پیدا کر دیا - جس سے ایران کا بچہ بچہ متاثر نظر آنے لگا آخر اسی روحانی آواز کی قوت سے ایران کی سیاست نے ایک پلٹا کھایا - ہر شخص دور کجکلاہی کو ختم کرنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ آمادہ جہد ہو گیا - جس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج ہمارے

سامنے ہے۔

کیا آج ہندوستان کا کوئی ایک شاعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے موجودہ وطنی تحریک کی موافقت یا مخالفت میں کوئی ایک نظم بھی ایسی کہی ہو جس نے ہندوستان کی سیاسی فضاؤں میں ہیجان پیدا کر دیا ہو اور جو آج بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہو اور اگر کوئی ہے بھی تو اتنا در "کالمعدوم"

حکومت مشوش ہے۔ ملک میں انقلابی آثار نمودار ہو چکے ہیں مگر ہم ہیں کہ شمع کے سامنے دو زانو بیٹھ کر اپنے فرضی موضوعات نہایت افتخار کے ساتھ دوسروں کو سنا کر خوش ہو رہے ہیں، اور ایک فرضی محبوب یا ممول پر جذباتی الفاظ کی قبا راست کر کے کہہ رہے ہیں کہ ؎

مزہ دے رہی ہیں ادائیں تمہاری
ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمہاری

صاحبو! زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اب مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیئے۔ ہم شاعر ہیں ہیں فطرت کے الہام کدے سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں تنوع پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہیئے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے اور جو ہمارے لئے، ہمارے ملک کے لئے اور فرزندانِ وطن کے مستقبل کے لئے ایک ابدی پیام بن سکے۔

اگر ہم من حیث الشاعر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اگر ہمیں اپنی شاعری کو ایک زندہ قوم کی شاعری بنانا منظور ہے تو ہمیں اپنی موجودہ ذہنیت، موجودہ تخیل، اور موجودہ قواعد و ضوابط میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ موجودہ شاعری اپنے موضوعات، قواعد اور رسمی فوائد دھواند کیا تو نہ صرف خود فنا ہو جائے گی۔ بلکہ ایک دن اپنے ساتھ ہمیں بھی فنا کر دیگی۔

مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ میرے بزرگوں اور دوستوں کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اور شمالی ہند کا یہ مشہور شہر جو حسن اتفاق سے جناب کیف گنگوہی،

جناب حیا گنگوہی۔ جناب شوق بریلوی۔ جناب اخگر صاحب اکبرآبادی جیسے ارباب کمال، صاحب ذوق اور مشاق اہل سخن کا مستقر ہے۔ اپنی آئندہ روشِ عمل سے ہندوستان کو ثبوت دے گا کہ اُس کے تعلیم یافتہ اور خوش ذوق باشندوں میں ادبی اصلاح و تہذیب کی بیش از بیش اہلیت موجود ہے۔

پانچواں خطبہ

مشاعرۂ ڈبائی

۲۶ - دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء

سپاس و تحدیثِ نعمت

معزز حضرات، و اراکینِ بزمِ ادب،

میں آپ کی قوتِ شوق اور کمالِ ذوق کی گیرائیوں کا معترف ہوں، کہ آپ نے مجھے چند در چند مصروفیتوں اور گوناگوں مشاغل کے حصار در حصار موانعات سے کھینچ کر "ڈبائی" کی مردم خیز و شعر آفریں فضا میں ایک بار پھر حاضر ہونے کی دعوت دی۔ اور آپ کی اس عزت افزائی کا شاکر ہوں کہ "بزمِ ادب" کے سالانہ مشاعرے کی صدارت کا اعزاز بھی اپنے اصرار کی پوری قوتوں سے مجھے عطا فرمایا۔

خطبہ خوانی کا غلط مصرف

جب سے مشاعروں میں خطبہ خوانی کی ترویج پر میں نے اپنی علمی و فکری توجہ منعطف کی ہے، یہ میرا دسواں خطبۂ صدارت ہے جسے میں آج ایک علم دوست، روشن خیال، اور اصلاح پسند مجلس کے سامنے پیش کر رہا ہوں، اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مشاعروں کی صدارت کے لئے "قرعۂ فال" "بنامِ منِ دیوانہ" اس کثرت سے پڑے گا تو شاید میں خطبہ خوانی کی ترویج پر اتنا زور نہ دیتا، مجھے یقین تھا کہ اس تحریک کی کامیابی کے بعد مصلحانِ فن کو اظہارِ خیال کا موقع ملے گا۔ اور شاعری و خطابت کے اتصال سے فنی د

تحقیقی نکات کی نقاب کشائی ہوتی رہے گی۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن اکابر جماعت کو اس کا موقع دیا گیا اُن میں سے اکثر نے اس وقت تک شاعری کی تاریخ، نشو و نما، اور شہری و صوبوی اختلافات کے افسانوی جھگڑوں کے سوا کوئی ایسی بات نہ کہی جو فنِ شعر کے لئے کوئی اجتہادی یا کم از کم اصلاحی میدان پیدا کرتی۔

مجھے ادبی مجالس میں ترویج خطبہ خوانی کے بعد متعدد خطبے سُننے، اور کاغذ پر پڑھنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میری سماعت ہمیشہ متجسس رہی کہ میں ذمہ دارانِ صدارت کے لب و دہاں سے کوئی ایسی تحریک، ایسی تجویز، اور ایسا مشورہ سُنوں جو ملک کی موجودہ فضائے شعر و ادب میں ایک مفید انقلاب کا ذریعہ ہو۔ لیکن اسالیب شاعری کے اُلٹ پھیر، زبان کی سادگی و شوکت کی تردید و تائید، اور شاعری کی لطیف و ادیبانہ تعریف کے علاوہ مجھے کوئی نیا درس نہیں ملا۔

اُردو شاعری

اُردو شاعری کی دریافت ہمارے دور سے سوا تین سو سال پہلے ہوئی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہمارے شاعر نے اپنی زندگی و ہمت کا کوئی نمایاں ثبوت نہیں دیا۔ اگر اس عرصۂ مدید میں دو چار یا دس پانچ شاعر اپنی قوتِ فکریہ کے سہارے اُبھرے بھی تو اُن کی ترقی و تجلی ملک کی تمام اجتماعی زندگی پر کوئی خاص اثر نہ کر سکی، اور یہ متفکرین مثلِ شہابِ ثاقب کی طرح اپنے انوار کی جھلک دکھا کر ہماری آنکھوں سے روپوش ہو گئے۔

"اردو شاعری" جس کی تخلیق پر اتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ آج بھی اپنے قواعد کے لحاظ سے اہلِ عرب کی مرہونِ قلم، موضوع کے اعتبار سے اہلِ فارس کی مقلد، اور امثال و اسالیب کی حیثیت سے مغربی شعرا کی دست نگر ہے۔

غلط نظریہ

جب خصوصیات شاعری پر کہیں بحث ہوتی ہے تو ملٹن، شیکسپیر، اور ہومر وغیرہ مغربی شعرا کے نظریات بیشتر ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور ہم اپنی شاعری کو مغربی شعرا کے اصولِ تنقید پر پرکھنے اور جانچنے کے خوگر نظر آتے ہیں۔ گویا ہمارے یہاں گزشتہ تین یا پانچ صدیوں میں کوئی ایک باکمال شاعر بھی ایسا نہیں گزرا جس کا نظریہ شاعری کے متعلق ہمارا خضرِ راہ ہوتا

ہم میر و غالب، ناسخ و آتش، اور داغ و امیر کو دنیائے شاعری کا خدا سمجھنے میں اپنے معتقدات کی نشاط سمجھتے ہیں لیکن اُنکے اقوال و ملفوظات پر ہمارا ایمان اتنا بھی نہیں کہ ہم مغربی شعرا کے نظریوں ہی سے کم از کم بے نیاز ہو جائیں۔

حالی و شبلی، جو ہماری قوم اور ہمارے ملک کے علمائے محققین مانے جاتے ہیں وہ بھی جب خصوصیاتِ شاعری کی بحث چھیڑتے ہیں تو ملٹن اور ہومر کے نظریوں کو اپنا موضوعِ بحث بنانے ہی میں اصابتِ رائے کی تسکین پاتے ہیں، اور آج بھی اگر کوئی ادیب اس بحث پر قلم فرسا ہوتا ہے تو وہ مغربی نظریات ہی کو اساسِ بحث بنانا تسکین خیال سمجھتا ہے۔

غلامانہ ذہنیت

جب تک ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت رہی، مغربی شعرا کو ہماری تنقید و تحقیق میں اتنا دخل نہ تھا۔ اور جامی و نظامی، سعدی و عرفی، قاآنی، و خاقانی، حافظ و خیام، اور بیدل و صائب کے مسلّمات ہماری شاعری کے جزو و کل پر حاوی تھے، مگر جب سے ہماری غلامی کا دور آیا، ہماری ذہنیت پر بھی غلامی مسلط ہو گئی۔ اور ہم فاتح قوم کے شاعروں کو عرب اور ایران کے شعرا پر ترجیح دے کر اُن کی تعلیم و تلقین، تحقیق و توضیح، اور معلومات و تاثرات کے غلام بن گئے، اور مذہب شاعری میں بھی انھیں اپنا امام تسلیم کر لیا۔

شاعری اور مصوّری

اس غلامانہ اور تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو شاعر مجموعی طور پر آج تین سو سال کے بعد بھی ارتقا و اجتہاد کی برکات سے محروم ہے، ہماری موجودہ شاعری کو ہماری معاشرت سے دُور کا تعلق بھی نہیں، ہم بدستور اپنے اشعار میں دوسروں کے جذبات یا محسوسات کی ترجمانی اور نقالی کر رہے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعری مصوری ہے۔ شاعری اور مصوری میں بہت نازک فرق ہے۔ جس طرح ایک مصور مختلف مناظر و مواقع اور محسوسات کی تصویر کھینچتا ہے اور وہ تمام تصویریں اس کے ذاتی حالات و واقعات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اسی طرح ایک شاعر بھی جذبات و حسیات کی ترجمانی میں اپنی ذاتی کیفیات کا مصور بہت کم ہوتا ہے۔ اور جب وہ خارجی جذبات و احساسات کی تصویر اپنی فکر کے الہامی مُوقلم سے کھینچتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تمام کیفیات

اُسی پر طاری و ساری ہیں) لیکن میرے بزرگو، اور میرے دوستو، اگر ان الہامی تصاویر میں حقیقت کا عنصر غالب اور یقینی ہو، اور اگر یہ فکری تصویریں ہماری معاشرت، اور ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں ہوں تو کیا ہماری شاعری حقیقی شاعری نہیں کہی جاسکتی۔ اور کیا اُسمیں بلحاظ واقفیت زیادہ اثر و قوت پیدا ہو جانے کا امکان نہیں؟

شاعری کے مدارج بلحاظ اثر

شعرائے عرب نے بلحاظ اثر شاعری کو پانچ اقسام پر منقسم کیا تھا۔ مرقص، مطرب، مقبول، مسموع اور متروک، انہیں سب سے بڑا درجہ شعر مرقص کا تھا۔ جس کے سُننے سے انسان وجد و رقص کرنے لگے۔ اس کے بعد شعر مطرب تھا۔ جو سامع کے دل و دماغ کو طرب ناک بنا دے۔ پھر شعر مقبول، جس کا اثر ماہرین فن کی داد و تحسین تک محدود ہو اس کے بعد شعر مسموع، جو صرف سُن لیا جائے اور کوئی اچھا یا بُرا اثر نہ کرے۔ پانچواں متروک، جسے سُن کر سماعت میں ناگواری پیدا ہو۔

ہندوستان میں جس قسم کی شاعری مروج ہے، اور صدیوں سے مروج ہے، اُسے صرف مقبول یا متروک کا درجہ دیا جاسکتا ہے، یعنی عام طور پر ہماری شاعری کا ما حصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ سوسائٹی اُسے سُنے اور "واہ" یا "آہ" کہہ کر بھول جائے۔

مشاعرے اور دورِ آزادی

رہے مشاعرے، تو ان کا رواج ہمیشہ شاعری کے ساتھ ساتھ رہا ہے، لیکن آج کل ہمارے مشاعرے صرف لفظی و ہنگامی تفریح گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری ادبی مجالس، دوسری ملکی و قومی انجمنوں کی طرح بااثر اور مفید نہیں، آج بھی جبکہ ہمارا ملک ایک نئے انقلاب کی طرف بہا چلا جا رہا ہے اور ہر قوم نے اپنی تمام تفریحات و مطائبات کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے، ہماری شاعری کا وہی اسلوب ہے جو ہماری سلطنت کے زمانے میں تھا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور بڑی بڑی انجمنوں کی طرف سے سالانہ مشاعرے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں مگر کسی انجمن اور کسی مجلسِ شعر میں کوئی ایسا مشورہ پیش نہیں کیا جاتا جو اردو شاعری اور اردو شاعر کو بھی تاریخ دورِ آزادی

میں جگہ دے سکے۔ اور مورخ کو مجبور کر سکے کہ جب وہ عہد موجود کی تاریخ میں اکابر و اعیانِ ملک کا نام لکھے تو کسی "وطنی شاعر" کے لئے بھی اُس میں تھوڑی سی جگہ محفوظ کرلے۔

اسبابِ قبولیت

ہماری قوم اپنی ذہنی و طبعی خصوصیات سے ساعت کی تفریح و شگفت کا سامان آخر کب تک کرتی رہے گی؟ عربی و عجمی شعرا کا نام کیا آجتک صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ لہراتی ہوئی زلفوں اور لچکنے والی کمر کی تعریف میں رطب اللسان تھے؟ کیا مغربی شعرا کی فضیلت آج صرف اس لئے مسلّم ہے کہ وہ ہجر و وصال اور حسن و جمال کی تصویریں کھینچنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ کیا فردوسی و نظامی اور سعدی و عرفی آج ہماری سوسائٹی میں صرف اس لئے مقبول ہیں کہ اُن کا کلام نفسیاتِ محبوب کی ترجمانی تک محدود تھا؟

تاریخ کے صفحات اُلٹیے، عراق و حجاز کے کسی محاذِ جنگ پر تصور کی قوت سے کچھ دیر بیٹھنے کی تکلیف کیجیے، اور دیکھیے کہ تلواروں کی چمک، بندوقوں کی گرج، اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پر غالب آنے والی چیز صرف عربی "شاعر" کی رجز ہے۔ اُس کے دل و دماغ سے نکلے ہوئے کچھ پرجوش اشعار ہیں، جنھیں نقیب رزمیہ لحن میں پڑھ رہا ہے اور اُس کے ہر شعر پر عساکر کا خون سمندر کی طوفان خیز موجوں کی طرح میدانِ جنگ کی وسعتوں کی آبرو ہے۔

مگر کیا آج ہندوستان کا شاعر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُس کے زائیدہ ہائے فکر نے کبھی کسی محاذِ جنگ پر آگ برسائی ہے؟ کبھی کسی قومی میدان میں جذبات کی تلواریں چمکائی ہیں، اور کسی کاروانِ غافل کے سر پر کھڑے ہو کر کوئی "نغمۂ بیداری" گایا ہے؟

رسمی و نشاطی شاعری

مولانا حالی عمر بھر شعر کہتے رہے، ایک باخبر اُستاد کے شاگرد تھے، کلام میں پختگی تھی۔ مگر ایک متغزل کی حیثیت سے اُنھیں کبھی قبولیتِ علم میسر نہ ہوئی، یکایک سرسید علیہ الرحمۃ نے ہندوستان میں ایک نیا صورِ عمل پھونکا، شبلی و آزاد نے اُن کی ہمنوائی کی، اور مولانا حالی نے بھی ایک غیر فانی "قومی مسدس"

"کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا"

لکھ کر اپنے لئے حیاتِ ابدی کا سامان کرلیا۔ آج حالی مرحوم صرف اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" اور ایک "مسدس" کی وجہ سے شعرائے ہند میں متعارف و مقبول ہیں، اس کے علاوہ کیا اُن کے تمام سرمایۂ فکر کی کوئی ایک کڑی بھی ایسی ہے جو لوگوں کی زبان پر یا دماغ میں محفوظ کہی جاسکتی ہو۔ اسی طرح اور بھی معدودے چند شاعر ایسے ملیں گے جو روایتی و رسمی شاعری کی حدود سے گزر کر تہذیب و اصلاح کی طرف مائل ہوئے۔ مگر ان کے نام صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

ہمارے معزز شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ تفریحی و نشاطی شاعری کی ترصیع و تہذیب میں بدستور مصروف و منہمک ہیں وہ شاعری اور مشاعروں کو صرف تحفظِ محاورہ و زبان کا ذریعہ سمجھ کر اُن کے احیا کی کوشش میں ٹکر آزما ہیں، مگر اپنے محور و ماحول سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہی اُن کی شاعری ہے۔ وہی شاعرے ہیں، اور وہی ردیف و قافیہ کی طرف رنگنا ہے۔ ان میں سیکڑوں اپنی عمریں ختم کرچکے۔ ہزاروں ختم کرنے والے ہیں، لیکن اُن کے مدارج و مناصب جہاں تھے وہیں ہیں۔ اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو شعر کہتے کہتے مرگئے لیکن آج کوئی اُن کے نام سے بھی واقف نہیں۔

مشاعروں کی اصلاح

حضرات، یہ نتائج ہمارے لئے درسِ عبرت ہیں، ہمنے اپنی عمریں تقلیدی شاعری کی ترویج و تبلیغ میں ضائع کردی ہیں، اور اگر ہم آیندہ بھی اسی تاریکی میں پڑے رہے تو ہماری آیندہ نسلوں کی عمریں بھی رائیگاں ہوجائیں گی۔

مشاعروں کا رواج شاعری اور زبان کے تحفظ و احیا کا ایک ذریعہ ضرور ہے۔ اور میں بھی اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا نہیں چاہتا مگر میری یہ تمنا بھی ہے کہ ہماری شاعری اور ہمارے مشاعروں کا موجودہ اسلوب بدل جائے۔ ہمارا تغزل بلند ہو۔ ہمارے خیالات متین ہوں۔ اور ہمارے احساسات پاکیزہ ہوں۔ تاکہ ہماری شاعری فنونِ لطیفہ میں پھر ایک فنِ لطیف و شریف سمجھی جانے لگے اور ہم اپنے افکار و خیالات کو "تفریحِ محض" سے کوئی زیادہ بلند درجہ دے سکیں۔

عام شاعری اور مشاعرے

رسائل و جرائد میں ملک کی موجودہ شاعری پر جو تنقیدیں

ہوتی رہتی ہیں، ان پر نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر طبقات میں ہماری شاعری پر تخریب کے الزامات لگائے جارہے ہیں۔ اُسے مخرب اخلاق کہا جارہا ہے۔ اور تمام ملک سے آٹھ دس شعرا کو مستثنیٰ کرکے عام شاعری کے متعلق اچھے خیالات قائم نہیں کئے گئے ہیں۔ اس الزام تخریب کا سبب تعصب نہیں بلکہ عام شعرا کی خود روی اور خود پسندی ہے۔ ہماری ادبی دنیا میں کوئی ایسا محکمۂ احتساب قائم نہیں جو عام شعرا کی صحیح رہنمائی کرسکے۔ نہ ہماری جماعت منظم ہے۔ نہ ہماری کوئی مرکزی انجمن ہے۔ جس کی طرف ہم ضروریات کے وقت رجوع کرسکیں۔ اور جو ہمیں غیر جانب دار طبقے کی تنقیدوں، اور تبصروں کی اطلاع دے سکے۔ خود ہمارے صوبہ میں سیکڑوں ادبی انجمنیں موجود ہیں۔ ان کے کارکن بھی قابل ہیں۔ لیکن ان کا نصب العین "انعقاد مشاعرہ" کے سوا اور کچھ نہیں۔

سال بھر میں صرف ایک مشاعرہ منعقد کرکے خدمتِ ادب کے فرائض سے سبکدوش ہوجانا ایک عجیب وغریب واہمہ ہے۔ میں ان تمام انجمنوں کو ایک مرکزیت سے وابستہ کردینے کا حامی ہوں۔ اور میں اس انتشار کو مٹادینا چاہتا ہوں جو شعرا میں ایک مدت مدید سے موجود ہے۔ نیز اس نظریہ کو منسوخ کرنا چاہتا ہوں کہ شعرا کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہوسکتے۔ اپنی اس تمنا کے ماتحت میرا نظامِ عمل حسب ذیل ہے۔

جدید نظامِ عمل

(۱) میں چاہتا ہوں کہ ایک آل انڈیا جمعیۃ الشعرا کی تاسیس وتشکیل کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) میں چاہتا ہوں کہ ہمارے معزز شعرا اظہارِ خیال میں متانت ورفعت اختیار کریں اور اپنی قوتِ فکریہ سے وقت کا ساتھ دیں، ملک کا ساتھ دیں، قوم کا ساتھ دیں، اور حالات وواقعات کا ساتھ دیں۔ یعنی بحیثیت شاعر قوموں کو اُبھارنے، ملک کو بیدار کرنے، اور جمود وخمود کے پردے چاک کرنے میں اپنی الہامی قوتوں کو بروئے کار لائیں۔

(۳) میں چاہتا ہوں کہ مشاعروں کو زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ، اور زیادہ کارآمد بنایا جائے، اور ادبی مجالسِ ملک کو اہمیت وافادیت کی طرف بڑھنے کا موقع دیا جائے۔

(۴) میری خواہش ہے کہ ملک میں مشاعروں کے ساتھ ساتھ "مناظموں" کا بھی رواج ہو۔ اور ہر "مناظمہ" ضرورتِ وقت کے لحاظ سے ایسے موضوعات پر منعقد ہو جو شاعری کو ہماری نظروں میں نہیں بلکہ دوسروں کی نگاہوں میں بھی معزز و مفید بنا دے۔

آپ خود اندازہ فرمائیے کہ سالانہ مشاعروں میں معزز سامعین اپنے اماکن و مساکن، راحت و آرام اور ضروری کام چھوڑ کر شریک ہوتے ہیں، ساری رات شعرا کا کلام سنتے ہیں۔ اچھے اشعار سے متاثر ہو کر داد دیتے ہیں، ان کے داغوں پر واہ اور آہ کی ضربیں صبح تک متواتر پڑتی رہتی ہیں، مگر جب وہ اپنے گھر واپس جاتے ہیں تو ان کے ذہن و خیال میں اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا کہ فلاں شاعر نے اچھا شعر پڑھا۔ اور فلاں شاعر کامیاب یا ناکام رہا۔ روپیہ کے صرف، وقت کے ایضاع، اور بیداری شبینی کی تکالیف کے مقابلہ میں کیا مشاعروں کا یہ نتیجہ گراں معلوم نہیں ہوتا؟

ماضی و حال برادرانِ گرامی، اب میر و غالب اور داغ و امیر کا زمانہ نہیں رہا۔ حکومت ہماری شاعری کی قدر داں نہیں، امرائے قوم کو اپنی عیش پسندی سے فرصت نہیں کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں۔ سوسائٹی کا مذاق روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے۔ جس نے ہماری شاعری کو ایک "جنس کاسد" بنا کر تفریح و تضحیک کی پستیوں میں پھینک دیا ہے۔ میر و غالب کے جو اشعار احساس میں آگ لگا دیتے تھے، سامعین پر اثر و کیف طاری کر دیتے تھے، وہ آج صرف ہونٹوں پر تبسم پیدا کر سکتے ہیں، شاعر اس دور کا وہ بیکس انسان ہے جس کی جگہ قوم و ملک کے کسی ایوان میں نہیں۔ سیاسی اور اخلاقی فضا میں اس کی آواز دخل در معقولات سمجھی جاتی ہے۔ وہ صرف تفریحی مشاعروں کا ایک آلۂ ناشر الصوت بن کر رہ گیا ہے۔ اور اس کا حاصل کار صرف یہ ہے کہ مشاعروں میں غزل پڑھے، طرفدارانہ یا رسمی داد و تحسین لے اور اپنے گھر چلا جائے۔

یہی شاعر اپنے گزشتہ دور میں قوم کا نقیب تھا، ملک کا معتمد علیہ تھا۔ بادشاہ اس کا استقبال کرتے تھے۔ حکومت اس کی عزت کرتی تھی۔ دنیا اسے نظر وقار سے دیکھتی تھی۔ اس نے اپنی قدرتِ کلام سے عوام و خواص کے قلوب پر اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ شاعر کی صدائے موزوں ملک کے تمام افراد کی

اجتماعی صدا، اور وقت کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہماری گزشتہ عظمتوں میں یہ انقلاب دو بار کیوں رونما ہوا۔ اور ہم سے وہ تمام عظمتیں کیوں چھین لی گئیں جو ہمیں فطرتاً ودیعت ہوئی تھیں؟

انقلابِ حکومت اس کا سب سے پہلا سبب ہے، اس کے بد معترضین کا یہ الزام ہے کہ ہم نے سلاطین کی غلط مدح سرائی کر کے اور ان کے سامنے نشاط انگیز و ہوس ناک شعر خوانی کر کے انھیں معاقبات کے احساس اور دور اندیشیوں سے غافل کر دیا۔ ہم اس جرم کے مرتکب ضرور ہیں۔ بے شک ہم نے مبالغہ اور تعلّی سے سلاطین و امرا میں قوت و سطوت کا غلط احساس پیدا کیا۔ بے شک ہمنے اُن کے گھوڑوں کو برق رفتار، فلک خرام، اور جبرئیل احتشام کہہ کر انھیں آسمان پر چڑھانے کی مجرمانہ کوشش کی۔ بے شک ہم نے ان کی تلواروں کو کوہ شکن، برق تراش، صاعقہ پیکر اور دستِ قضا کہہ کر اُن کے جنگی انتظامات کو زنگ آلود کر دیا اور اُنکے تخت کو تختِ سلیماں بنا کر اُن میں غرور و نخوت کی ہوا بھر دی، غرض کہ اسی طرح مختلف غلط احساسات پیدا کر کے ہم نے انھیں انتظامِ حکومت، تدبیرِ مدافعت، اور تہذیب سیاست سے واقعی محروم کر دیا۔

افسوس یہ ہے کہ اگر یہ انقلاب ہماری ہی ذہنی و فکری سازشوں کا نتیجہ تھا، تو آج بھی ہمارا ذہن، ہماری فکر، اور ہمارا خیال انھیں فروعات و مفروضات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اور ان کے زہریلے اثر سے اب ہم اپنی تعمیر کے انہدام کا اپنے ہاتھوں سے خود انتظام کر رہے ہیں۔

میں نہایت صاف الفاظ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین، اور مہذب و با اثر نہ بنائیں گے، جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظم میں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی، اور اپنے ادراکات میں ترفع پیدا نہ کریں گے ہمیں دنیا میں زندہ رہنے، اور اپنی ادبی روایات کو زندہ رکھنے میں کبھی کامیابی نصیب نہ ہو گی۔

شاعر کی عظمت

ابھی آپ کو اپنی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ و احساس نہیں۔ آپ کی قوم پیغمبروں کی قوم ہے۔ آپ کے دماغ پر خورشیدِ الہام براہِ راست ضیاباری کرتا ہے۔ آپ خدائے سخن آفریں کے شاگرد رشید کہلاتے ہیں۔

ادب آپ کے نفوسِ جاریہ کی صدا ہے۔ زبان آپ کے کلمات و ملفوظات سے عبارت ہے۔ آپکا ایک شعر ہزاروں صاحبِ دل صوفیوں کو "موتو قبل ان تموتو" کا درس دے کر حیاتِ جاودانی سے بہرہ اندوز کر سکتا ہے۔ آپ قوم قالب ہیں، ملت داغ ہیں، پھر آپ کو یہ کیا ہوگیا ہے کہ آپ اپنے موجودہ انحطاط اور کس مپرسی کو دور نہیں کر دیتے، ذرا اقدامت و تقلید کے حجابوں سے نکل کر باہر تو آیئے آپ کو انسانوں میں فرشتوں کا منصب عطا ہوگا۔ آپ کے پیغامات کائنات کے لئے درسِ عمل ہوں گے۔ اقوام و ملل میں عزت ہوگی، جیوش و عساکر کے آپ مقدمۃ الجیش بنائے جائیں گے۔ اور وہ تمام اقتدارات آپ کو تفویض ہوں گے جو ایک حقیقی شاعر کے لئے ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔

تلخ نوائی کی معذرت

معزز حضرات، میرا آج کا خطبہ فنی و تحقیقی نہیں بلکہ اصلاحی ہے۔ میں شاعرِ عالم کی اصلاح کے لئے اپنے دل میں ایک تڑپ اور ایک مسلسل بے چینی محسوس کرتا رہا ہوں۔ میرا اقدام غلط اور ناقابلِ عمل نہیں۔ میری نوا تلخ ہے مگر اس کے اثرات بہت شیریں نظر آتے ہیں۔ اگر آج آپ نے ایک اصلاحی قدم آگے بڑھایا تو کل آپ کو شعرا کی ایک لاتعداد جماعت میدانِ حیات میں سرگرمِ عمل نظر آئے گی۔ اگر آپ نے آج میری کمزور آواز پر "لبیک" کہا تو کل آپ کی آوازیں الہامی منادی بن کر ملک کی تمام وسعتوں میں گونجیں گی۔ اور آپ اپنے وطن کے حقیقی شاعر، معزز پیامی، مقدس پیامبر، اور مبارک معلم سمجھے جائیں گے۔

میرے وطن عزیز یعنی ہندوستان میں اہلِ علم کی کمی نہیں، سخنوروں کا قحط نہیں، ماہرینِ فن کا فقدان نہیں، یہ سب آپ کے رُجحان میں ایک انقلاب کے منتظر ہیں۔ اگر آپ نے اپنی شاعری اور اپنے شاعروں میں انقلاب پیدا کرنے کی ہمت کی تو ان کی مجتہدانہ قوتیں، اور علم و کلام کی قدرتیں، اس انقلاب کو خوشگوار، مضبوط اور کامیاب بنانے کے لئے ہمیشہ مستعد ثابت ہوں گی۔

چھٹا خطبہ

شاعری اور مشاعرے کی اصلاح

مشاعرۂ انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۷۔ فروری سنہ ۱۹۳۲ء

میرے معزز بزرگو، اور دوستو!

مجھے بیحد مسرت ہے کہ آج انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ مشاعرے کے بعد مجھے "شاعری اور مشاعرے کی اصلاح" پر اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ میں اس موضوع کی مبادیات اور تفصیلات میں پڑ کر آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ شاعری اور مشاعرے ایک رسم جاریہ کی طرح صدیوں سے ہندوستان میں مروج ہیں۔ لیکن فی زمانہ اُن کی اصلاح و تہذیب کی طرف حامیانِ زبان و ادب کی توجہ بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ نگارخانۂ ادب جو مختلف النوع نقادوں سے وقتاً فوقتاً آراستہ ہوتا رہا ہے۔ اب اپنی گراں سامانی اور ہمہ گیری کے باعث اس قابل ہوگیا ہے کہ ہم اس کا تجزیہ کرکے ہر چیز کو سلیقے اور طریقے سے محل اور موقع دیکھ کر ترتیب دیں تاکہ وہ انتشار جو امتدادِ ایام سے انڈنگ سخن میں پیدا ہو چکا ہے منظم اور مرتب ہو جائے۔

انجمن "خیابانِ اردو" کے دعوت نامے کی تمہید ہی موضوعِ زیرِ بحث کی اساس ہے جس کے

الفاظ یہ ہیں:-

"اردو زبان جس کو ادبی حیثیت، اور علمی فضیلت محض اہلِ قلم کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ آجکل"
" بعض غفلت آمیز بے اعتنایوں کے سبب سے بے وقعت اور جہل مرکب بنتی جارہی ہے"
" ضرورت ہے کہ اُن روایاتِ کہن کو ہمیشہ تازہ رکھا جائے۔ جن کا مٹ جانا چمنستانِ ادب"
" کو پامالِ خزاں ہوجاتا ہے"

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اردو زبان کو ادبی حیثیت اور علمی فضیلت اہلِ قلم نے دی ہے۔ مگر آج اہلِ قلم ہی اپنی زبان اور اُس کے متعلقات سے اس قدر غافل اور بے پرواہیں کہ اگر زبان جہلِ مرکب بنتی جارہی ہے۔ تو شاعری بھی یکسر مضحکہ بن گئی ہے۔ علی العموم آج شاعری کا نصب العین صرف تفریح رہ گیا ہے۔ وہی شاعری جو کبھی ملک و قوم کے روحانی سکون کا باعث اور اطمینانِ قلب کا سبب سمجھی جاتی تھی، آج بحیثیتِ مجموعی بے نتیجہ، بے کار اور بے اثر ثابت ہورہی ہے۔ ہر چند یہ دَورِ شاعری کا وہ ارتقائی دور ہے جس کی قوم و ملک کو اس عہدِ زوال میں ضرورت تھی۔ اور ہم میں چند ایسے آتش نوا موجود ہیں۔ جن کے دل سوز نغموں سے خرمنِ حیات کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی ہیں لیکن اس امر کے متعلق صحیح فیصلہ اکثریت اور اقلیت کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور اُن طریقوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن کے ذریعہ سوسائٹی میں اس کی تشہیر ہوتی ہو۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مشاعرے تشہیرِ لسانی اور ترویجِ شاعری کے بہترین ذرائع ہیں اس لئے اس خصوصی صورتِ حال کو نظر انداز کرنے کے بعد مجھ کو اکثریت کے نقطۂ نگاہ سے اُس "شاعری" پر رائے دینی ہے جو مشاعروں کے ذریعے عوام تک پہونچتی ہے۔

اصولی طور پر شاعری کا صحیح معیار معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے مشاعرے ہی ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ مشاعروں کے علاوہ کوئی اور عمومی صورت ایسی نہیں جہاں شعرا ایک مرکز پر جمع ہوکر اظہارِ خیال کرسکیں۔

لکھنؤ، دہلی، آگرہ، علی گڑھ اور الہ آباد کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں

میں بھی شاعرے پورے اہتمام و انتظام کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں۔ ان تمام شاعروں میں جس قسم کی شاعری ہوتی ہے۔ اُسے مندرجۂ ذیل عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **المیہ شاعری** - جس میں جذباتِ فراق، غریب الوطنی، آہ و فریاد، حسرت و آرزو، درد و اضطراب، مرض اور موت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔

(۲) **نشاطیہ شاعری** - جس میں کیف وصال، اذکار جمال، شراب و مستی، کامیابی، اور بہار وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔

(۳) **اعتباری یا تخیلاتی شاعری** - جس میں صیاد و نشیمن، آشیان و بلبل، باغبان، دام، قفس، اسیری، دشت وغیرہ، پر شاعرانہ اعتبار سے اظہار خیال ہوتا ہے۔

(۴) **جذباتی شاعری** - جس میں مختلف انسانی جذبات کی اثر آفریں طریقوں سے ترجمانی ہوتی ہے۔

(۵) **نیچرل شاعری** - جس میں فطرت کے مشاہدے سے مناظرِ قدرت کی مصوری کی جاتی ہے (حالانکہ نیچرل یا فطرتی شاعری کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اُسے مناظر نگاری تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ نیچرل شاعری کا مفہوم "حقیقی شاعری" سے ادا ہوتا ہے۔ اگر مناظر نگاری کے ساتھ شاعر نے اپنے دل کا تازہ خون صرف نہیں کیا ہے۔ تو اُس کی نظم ایک سفید و سیاہ کاغذ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔)

(۶) **قومی شاعری** - جس میں شاعر اپنی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل سے بحث کرتا ہے۔

(۷) **مولویانہ شاعری** - جو صرف خشک پند و نصائح پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۸) **سوقیانہ شاعری** - جس میں مبتذل اور رکیک خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

(۹) **فکاہی شاعری** - جو ہزل گو حضرات کا مطمح نظر ہے۔ اور جس میں صرف عامیانہ مذاق اور بازاری لہجۂ کلام اختیار کیا جاتا ہے (حالانکہ اس قسم کے ماتحت تند و تیز طنزیات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جا سکتا ہے اور مزاح سے تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ لسان العصر اکبر مرحوم نے لیا۔

لیکن آج کل اس سے بھی غلط کام لیا جا رہا ہے اور پھکڑ نویسی کو مزاح نویسی سے غلط تعبیر کیا جا رہا ہے)

یہ موجودہ اُردو شاعری کی متداول و متعارف قسمیں ہیں جن سے ہندوستان کے مشاعرے آئے دن گونجتے رہتے ہیں۔ اور جو شاعر کو "فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیمُوْنَ" کا مصداق بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مروجہ اقسام سے ہماری شاعری بے نیاز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ شاعری جذبات و احساسات کی ترجمانی ہی کا نام ہے۔ اور جب انسان مختلف جذبات و احساسات کا حامل ہے تو اُس کی شاعری کو بھی تنوع و اختلافِ خیال کا مرکز ہونا چاہئے۔ لیکن با ایں ہمہ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ موجودہ شاعری کا عملی نتیجہ بجز وقتی تفریح اور ہنگامی نشاط کے اور کچھ نہیں۔

مروجہ اقسام شاعری میں بعض قسمیں بہت اعلیٰ اور ارفع ہیں مگر (وجوہ جو کچھ بھی ہوں) آج کل مذاق بقدر پست ہو گیا ہے کہ اکثریت کسی ایسے شعر کو سُن کر خوش نہیں ہوتی جو باعتبارِ تخیل بلند اور باعتبارِ ترکیب مرتفع ہو۔ مجھے معاف فرمایا جائے میرے خیال میں مختلف وجوہ کے علاوہ اس کی پہلی اور آخری وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشاعروں میں استفادہ کے خیال سے افراد شریک نہیں ہوتے۔ بلکہ تھیٹر اور سینما کی طرح مشاعروں کی شرکت سے تفریح محض ان کا مقصودِ اصلی ہوتا ہے۔ اور یہی وہ صورتِ حال ہے جسمیں شاعر اور مشاعرہ دونوں کی توہین مضمر ہے۔

فطرتاً ایسے مواقع پر انسانی ذہنیت غور و فکر کی تکلیف اُٹھانا نہیں چاہتی۔ اس لئے پست جذباتی شاعری میں لوگوں کو زیادہ لطف آتا ہے۔ اور سنجیدہ اشعار سے ساعت تسکیف نہیں ہوتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعری ایک انقلاب عظیم کی طرف رواں دواں ہے۔ اور اس میں بہت کچھ انقلاب ہو بھی چکا ہے تاہم لکیر پیٹنے کا مرض باقی ہے۔ اور ہنوز شاعری کا عام رنگ مذاق عوام سے متوازن ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اوقات اُردو شاعری کو مخرب اخلاق، اور تہذیب سوز کہنے میں ایک نقاد کو تامل نہیں ہوتا۔

یہ ایک مسلّمہ فیصلہ ہے کہ شاعری زبان و محاورے کے انضباط و تحفظ کا بہترین ذریعہ ہے مگر میرے خیال میں یہ کام شعرائے متقدمین و متاخرین ایک بڑی حد تک پورا کر چکے ہیں۔ میرؔ سے لیکر مرزا داغؔ

دہلوی تک کوئی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے زبان کے محاورے اپنے اشعار میں نظم نہ کئے ہوں۔ دورِ آخر میں فصیح الملک مرزا داغ دہلوی، مولانا راسخ دہلوی، مفتی امیر مینائی لکھنوی، اور حکیم ضامن علی جلال لکھنوی نے تو اس قدر اُردو محاورے اپنے کلام میں نظم کر دیئے ہیں کہ وہ مثال و نظیر کے لئے بہت کافی ہیں۔ ہم انھیں کی تقلید میں ان محاورات کا استعمال کرتے ہیں۔ اِن بزرگانِ فن کے بعد شاید اس وقت تک کوئی ایسا مجتہد شاعر نہیں آیا جس نے فہرستِ محاورات میں اضافہ کیا ہو۔

محاورات، مصطلحات، اور اسالیب بیان کی تکرار و تواتر کے لئے "شاعری" کی بقا ضروری ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اکثریت کی بد مذاقی اور طلبائے فن کی کثرت و خود روی سے شاعری میں جو غلط بحث اور افراط و تفریط پیدا ہو گئی ہے اُس کا انسداد کیا جائے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" کی حیرانیاں باقی نہیں رہی ہیں۔ آج ہر اسکول، ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرے ہوتے ہیں جن میں طلبا دلچسپی یا غیر دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ مگر اُن کے سامنے جو شاعری ہوتی ہے وہ اُن کی اعلیٰ سیرۃ، پاکیزہ اخلاق، بلند فطرت، اور ترقی یافتہ مذاق کے لئے کوئی تعمیری پروگرام پیش نہیں کرتی۔ اگر شعر کا اثر سامع کے قلب و دماغ پر واقعی ہوتا ہے۔ اور شعر کریکٹر کے بگاڑنے بنانے میں ممد ہو سکتا ہے تو مجھے کہنے دیجئے، کہ فیصدی ۹۵ نغمے جو موجودہ شعرا کے ہونٹوں سے نکل کر طلبا کی سماعتِ معصوم میں جذب ہوتے ہیں، وہ کبھی اور کسی طرح طلبا میں اعلیٰ سیرۃ اور بلند مذاق پیدا نہیں کر سکتے۔

اُردو شاعری کا بیشتر حصہ ایسے پست خیالات و جذبات کا حامل ہوتا ہے کہ ایک شاعر بیٹا ایک بزرگ باپ اور اپنی محترم ماں کے سامنے اپنے اشعار آزادی سے نہیں سُنا سکتا۔ اور رازِ سربستہ کی طرح اپنی بیاضِ شعر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپائے چھپائے پھرتا ہے۔

میں اسے بغیر کوششِ تردید تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ شاعری کی اساس، فارسی شاعری کی تقلید میں، اُسی قدیم شاعری کے نقوش پر قائم ہے۔ جو شعرائے سلف کا مایۂ نازش تھی۔ لیکن

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اخلاف نے تقلید میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کو اصولِ عمل نہیں بنایا۔ اور آنکھیں بند کر کے جس کی تقلید چاہی شروع کر دی۔

میرؔ و سوداؔ اور غالبؔ و مومنؔ کے کلام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مذاق کی پستی شاذ پائی جاتی ہے جو النادر کالمعدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ، روح کو چھونے والے جذبات اور فطرت و حقیقت کو بے حجاب کرنے والے مرتفع خیالات و احساسات سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس مصحفیؔ و انشاؔ اور آتشؔ و ناسخؔ کے کلام میں دوسری قسم کے خیالات کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ چونکہ پست مذاق عموماً کانوں اور دل کو آسانی سے متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لئے بعض متاخرین نے ان شعرا کی تقلید کر کے اپنے لئے شعر گوئی کو آسان تو کر لیا۔ مگر اس طرح اردو شاعری کی اساس غلط پڑتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۵ فی صدی طلبائے فن اسی ابتذال و پستی کو سرمایۂ ادب سمجھنے لگے۔

ضرورت ہے کہ اساتذۂ متقدمین کے تمام دیوان مناسب انتخاب کے بعد از سرِ نو شائع کئے جائیں اور وہ تمام اشعار نکال دیئے جائیں جو سامع کے رجحانات کو عریانیٔ احساس کی طرف رجوع کر کے غلط تقلید و اتباع کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ تقلید اگر کوئی ضروری چیز ہے تو اسے اسلوب بیان اور خصائص زبان تک محدود رہنا چاہیئے، لیکن پست جذبات اور معمولی خیالات کی تقلید حقیقت میں ایک ایسی کورانہ تقلید ہے۔ جو مقلد کی علمی و ادبی ذہنیت کی طرف سے ناقد کو مایوس کر دیتی ہے۔ اور اس غلط تقلید کا سلسلہ درجہ بدرجہ استاد سے شاگرد اور معلّم سے متعلّم پر منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں نہیں کہتا کہ اپنے زمانے کے مذاق اور ماحول سے متاثر و مجبور ہو کر متاخرین میں مرزا داغؔ، جلالؔ، اور امیرؔ نے بھی ایسی کوتاہیاں نہیں کی ہیں۔ ان سے بھی یہ کوتاہیاں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن انکی اشاعت کا بارِ الزام بھی ان کا کلام شائع کرنے والوں پر ہے۔ اور یہ حضرات اس لئے قابلِ درگزر ہیں کہ ان کی کوتاہیوں کے مقابلے میں ان کا تعمیری کام بہت زیادہ ہے۔ جو انھوں نے تحقیق و تدوینِ محاورات اور اصلاحِ زبان کے متعلق کیا ہے۔

بہرحال تحریبی مواد اُردو شاعری میں کچھ تو پہلے سے موجود تھا اور کچھ ہمارے سعادت مند شعرا نے اپنی کوشش و محنت سے اب بڑھا لیا ہے۔

یہ حال تو موجودہ اردو شاعری کا تھا۔ اب مشاعروں کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے "مشاعرے" ایک عرصہ دراز تک مشرقی روایات قدیم کے مطابق ہندوستان میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ مگر اب ان میں بھی بہت سی بدعات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً

(۱) مبتدی و منتہی شعرا کی شرکت۔

(۲) غیر شاعر حضرات کی صدارت۔

(۳) عدم پابندیٔ اوقات۔

(۴) طوالت وقت۔

(۵) بسیار خوانی۔

(۶) دادِ بیجا اور بالکنایہ حملے۔ وغیرہ وغیرہ

مندرجۂ بالا نقائص پر اگر میں مفصل تنقید کروں تو مجھے اندیشہ ہے کہ میری تقریر بہت طویل ہو جائیگی اس لئے بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں مشاعروں کا نصب العین تفریح اور تضیع اوقات کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اوّل شب سے آخر شب تک مسلسل غزلخوانی اور دماغ کاوی کا کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہو تو مجھے بتایا جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہی تحفظ زبان ان مشاعروں کا مقصد ہے تو میں عرض کر دونگا کہ زبان آج کل کے مشاعروں میں بنتی نہیں بلکہ بگڑتی ہے۔ مبتدی شعرا غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں، اکثر و بیشتر نظم کر جاتے ہیں۔ سننے والے سنتے ہیں۔ مگر کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ان اغلاط کی اصلاح کی طرف توجہ کرے اور ہمت سے کام لے کر زبان یا محاورے کی غلطی پر روشنی ڈالے عوام کو تو ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں، رہے منتہی شعرا، تو وہ اس خیال سے خاموش ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی کے شعر میں کوئی نقص نکال دیا جائے تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ اور عیب جو، عیب بیں، حاسد، کینہ توز، خود پسند، نکتہ چیں، اور خدا جانے کیا کیا گالیاں سرِ محفل سننی پڑینگی۔

جب سوسائٹی کا یہ حال ہے تو فرمائیے اصلاح کیونکر ہو؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دعوتِ اصلاح نعرۂ منصور نہیں ہے۔ صیح مشاعرہ داعی کے لئے دار و رسن کا حکم لے کر نمودار نہ ہوگی۔ اس لئے بلا خوف لومتہ لائم آپ کے سامنے اظہار حقیقت کر رہا ہوں۔ میرا جذبۂ اصلاح یہاں تک حوصلہ مند یا گستاخ ہے کہ اگر اس سلسلے میں دار و رسن کا فتویٰ بھی کسی کی طرف سے مل جائے تو میں بخوشی لبیک کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن اپنی سالہا سال کی ادبی خدمات کا حاصل یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شاعری اور مشاعروں میں ایک ایسا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے جو اردو شاعری اور ادبی مشاعروں کو ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنا دے۔

بتدی و منتہی شعرا کی مشارکت پر میں اپنے پہلے خطبوں میں اظہار خیال کر چکا ہوں مشاعروں میں خطبہ خوانی کی ترویج میرے زیر ادارت شائع ہونے والے رسالۂ "شاعر" کے ذریعے باحسن الوجہ ہو چکی ہے۔ اب صوبہ متحدہ میں خصوصاً اور دوسرے صوبوں میں تدریجاً خطبۂ صدارت پڑھنے کا رواج ہوتا جا رہا ہے میری یہ بھی تجویز ہے کہ مشاعرے صیح مشرقی انداز پر منعقد ہوں۔ میں مصرع طرح کے اعلان کا بھی مؤید نہیں ہوں۔ پنجاب نے اس خصوص میں ایک نیا عملی قدم اٹھایا ہے۔ وہاں مشاعرے کے لئے کوئی مصرع طرح تقسیم نہیں کیا جاتا۔ مصرع طرح دے کر شاعر کے ذہن و خیال کو مقید کر دینا کوئی مفید طریقہ ثابت نہیں ہوا۔ گو اس طریقہ سے قوتِ فکر کا مقابلہ ضرور ہو جاتا ہے مگر جب تک مصرع میں خاص شگفتگی اور گہرائی نہ ہو یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ داد دینے اور سننے کا طریقہ بھی قابل ترمیم ہے، وقت کی پابندی، اختصارِ کلام، اور طولِ مشاعرہ کے متعلق بھی فکر و غور کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی تہذیب و اصلاح ضروری معلوم ہوتی ہے اور جن پر جریدۂ "شاعر" میں برابر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ مگر شاعری یا مشاعروں کی اصلاح، کسی ایک شخص کا کام نہیں یہ کام پوری جماعت کا کام ہے۔ جبتک کوئی جماعت اپنی اصلاح و تہذیب کے لئے متفقہ کوشش نہیں کرتی اُس وقت تک انفرادی کوششیں کامیاب ثابت نہیں ہوتیں۔ بدقسمتی سے ہمارے شعرا کا یہ حال ہے کہ وہ جتنے نازک خیال ہیں، اُتنے ہی دیر احساس بھی ہیں آج ایک معمولی شاعر سے لے کر منتہی تک موجودہ شاعری اور موجودہ مشاعروں

کے رواج سے بددل اور بیزار نظر آتا ہے مگر جذبۂ اصلاح کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ یا پیدا ہوتا ہے تو کوئی اُس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ بس ایک رسم ہے کہ جاری ہے۔ ایک رواج ہے کہ نباہا جا رہا ہے۔ اجتہاد کے دروازے چاہے ساری دنیا پر کھلے ہوئے ہوں لیکن ہمارے شعرا پر بند ہیں۔ اگر کوئی نئی اصلاحی آواز کہیں سے اُٹھتی ہے تو اُسے یہ کہہ کر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اساتذۂ متقدمین میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔ یہ قدامت پسند طبقہ اجتہادی قوتوں سے خود بھی عاری ہے اور دوسروں کو بھی اس میدان میں ترقی کرنے سے روکتا ہے۔

شاعری کے متعلق ابھی عرض کر چکا ہوں۔ مشاعروں کے متعلق میرا خیال آپ پر ظاہر ہو چکا ہے اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ جب انفرادی کوششیں ضرورت اصلاح کی تکمیل نہیں کر سکتیں تو پھر وہ کون سی تدبیر ہے جو ہماری شاعری اور ہمارے مشاعروں میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟

آپ حضرات میں سے اکثر کو اس کا علم ہوگا کہ میں ایک عرصے سے "جمعیتہ الشعرائے ہند" کے قیام کی بھی تحریک کر رہا ہوں۔ اس آل انڈیا ادبی کانفرنس کی تاسیس و تشکیل کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ ہر صوبے سے دو مشہور شاعروں کو کسی مجلس میں دعوت شرکت دی جائے اور انکی موجودگی میں جمعیتہ کی تاسیس کر لی جائے۔ لیکن اب میرا خیال کسی قدر بدل گیا ہے "جمعیتہ الشعرائے ہند" کی تاسیس و تخلیق کے لئے صرف اُن صوبوں کے نمایندوں کی ضرورت ہے جو اہلِ زبان ہیں یا جنکی علمی و ادبی جدوجہد نے اُنھیں اہلِ زبان سے قریب تر کر دیا ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جمعیتہ کی اساس صوبۂ متحدہ میں رکھی جائے اور پھر اس کے دامن تمام صوبوں کے لئے وسیع کر دیئے جائیں۔

بلحاظ موضوع بیان جمعیتہ الشعراء کے ذکر سے میرا مقصد یہ ہے کہ جمعیتہ کا قیام ہی شاعری اور مشاعروں کی اصلاح کا ایک یقینی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی جمعیتہ کی قوت سے وہ تمام کام لے سکتے ہیں جو افراد کی کوشش سے اس وقت تک انجام پذیر نہیں ہوئے۔ ہم اپنی جماعت کو منظم کر سکتے ہیں۔ اپنی شاعری اور مشاعروں کے لئے اصلاحی و تعمیری پروگرام مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم موجودہ روش شاعری کو مرتفع کر کے ایک ایسی بلندی پر پہونچا سکتے ہیں جہاں تخریب و رکاکت،

اور انحطاط و پستی کی گرد پیچ ہی نہیں سکتی۔ ہم اپنی جماعت کو ایک مرکز پر دعوتِ اتحاد دے کر، اردو شاعری کو افراط و تفریط کی کشمکش سے نکال کر، اپنے شاعروں اور مناظموں کے لئے صحیح لائحہ عمل بنا کر، اپنا معیار نظم و نثر بلند کر کے، اپنے جذبات کے اظہار میں توازن قائم کر کے، اور اپنی ادبی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی مجالس کو دوسری ملکی و قومی مجالس کی طرح ممتاز و مفتخر بنا سکتے ہیں۔

میں چاہتا تو اس سے پہلے ہی اپنے احباب و تلامذہ کی اعانت سے ایک جمعیۃ کی بنیاد ڈال دیتا مگر مجھے اس مسئلہ کی اہمیت کا بطورِ کافی اندازہ ہے۔ میں اس جمعیۃ کو حقیقی معنوں میں "جمعیۃ الشعرائے ہند" بنانے کا آرزومند ہوں۔ اس لئے میری ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ کسی بڑے سالانہ مشاعرے میں جہاں شعرا اور ادبا کا کافی اجتماع ہو۔ میں یہ تحریک پیش کروں۔

امسال "انجمن خیابانِ اردو" کے دعوت نامے میں "شاعری اور مشاعرے کی اصلاح" کا عنوان پڑھ کر میرا جذبۂ عمل انگڑائی لینے لگا۔ اور یہاں آنے کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے خیالاتِ پریشاں کو آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ اور ایک خادمِ ادب ہونے کی حیثیت سے عرض کروں کہ "انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ" کے آخری سالانہ مشاعرے میں میری اس تحریک کی اساسی تمہید ڈال دی جائے تاکہ "جمعیۃ الشعرائے ہند" کی تاسیس کا سہرا اسی مرکزِ علوم و فنون کے سر رہے جو ہمیشہ ایسی تحاریک و تجاویز کا مرکز رہا ہے۔

در اصل جمعیۃ الشعرا کی تاسیس و ترتیب کوئی ایسا امر دشوار نہیں لیکن جمعیۃ کے قیام کے بعد اس کی قوتوں کو بروئے کار لانا واقعی مشکل کام ہے۔ اراکین جمعیۃ کا انتخاب، مجلس عاملہ کی تعیین، نظامِ عمل کی تدوین، ملک کی تمام ادبی مجالس کا مرکزی "جمعیۃ الشعرا" سے الحاق، شعبوں اور اداروں کی تقسیم، شاخہائے جمعیۃ کا قیام، غرض کہ ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی تکمیل کے لئے وقت اور مردانِ کار کی ضرورت ہے اگر آج علی گڑھ کی سرزمین فضل و علم میں "جمعیۃ" کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو میں اسے "شاعری اور شاعروں کی اصلاح" کا ایک اہم ترین عملی اقدام سمجھوں گا۔ کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کچھ لوگ اسے خیال سے عمل میں لانے کے لئے اپنی ہمدردانہ اور پر خلوص کوششوں کے ساتھ آمادہ نہ ہو جائیں اسی طرح "شاعری اور شاعروں کی اصلاح" دس ہزار تقریروں اور

تحریروں سے بھی نہیں ہو سکتی جب تک قول وفعل کے امتزاج سے ایک نیا مزاج پیدا کر کے اس ہیولے میں نئی جان نہ ڈالی جائے۔ بس یہی مجھے عرض کرنا تھا اور اسی معروضہ کی تکمیل کے لئے میں آپ کی زبان کی جنبشوں، منصب کی ذمہ داریوں، اور علمی وعملی قوتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ حضرات اپنی امکانی اعانت سے اس تحریک میں آج ایک ایسی روح پیدا کر دیں جو اس تحریک کی زندگی اور اردو شاعری کی معنوی بقا کی ضامن ہو۔

ساتواں خطبہ

مشاعرہ بزمِ ادب جہلم (پنجاب)

۱۶ - اپریل ۱۹۳۳ء

گرامی حضرات!

آج میں بیحد مسرور ہوں کہ صوبۂ پنجاب کے مشہور شہر جہلم کے ایک ادبی و علمی اجتماع میں مجھے بحیثیتِ صدر اپنے ہزیانات پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں اُن تمام حضرات کا بےحد ممنون و شاکر ہوں جو اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر میری یاوہ گوئی کی سماعت کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ صوبۂ پنجاب سے میرا معنوی تعلق ہے اور اس حیثیت سے میں جہلم کو جہاں میرے تین عزیز شاگرد موجود ہیں اپنا گھر سمجھتا ہوں، اس لئے میں جو کچھ عرض کروں گا اُسے "حکایتِ بیگانہ" نہیں بلکہ "حدیثِ خانہ" سمجھنا چاہیے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں "علم و ادب" پر کچھ اظہار خیال کروں،

علم و ادب علم، اصل ہے اور ادب فرع ہے، علم سرچشمہ ہے اور ادب اُس کی ایک لطیف موج، علم ایک چمنستان غیر محدود ہے اور ادب اُس کی بہارِ معطر۔ علم کے معنی "دانستن" یعنی جاننا ہیں۔ موجودات کی گوناگوں نوعیات کے لئے گوناگوں علوم بھی ہیں۔ مثلاً علم الاشیاء۔ علم الانسان۔ علم اللسان وغیرہ وغیرہ۔ یہاں نفسِ موضوع علم اللسان سے متعلق ہے اور ادب اُسی کی ایک شاخ ہے۔ علم اللسان، ہر ملک کی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسے درسگاہوں، یعنی مکاتب، اسکولوں،

کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر ادب ذہن و دماغ کا وہ جوہرِ گرانمایہ ہے جو اکتسابِ علوم و فنون کے بعد صرف ادراک و معارف کی قوت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ہیں درسگاہوں میں ادب اِلالسنہ کے نمونے تو مل سکتے ہیں مگر وہ دماغ، جو ادب کا خلاق ہو، صرف فطرت کی ودیعت ہی کا رہینِ منت ہے۔ اور کسی نوعیت سے بھی اکتسابی نہیں کہا جا سکتا۔

زبان کی دو قسمیں ہیں۔ تحریری و تقریری۔ تقریری زبان علمی زبان سے وابستہ ہے۔ علم جسقدر وسیع ہوگا تقریر میں اتنی ہی قوت ہوگی۔ تحریری زبان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ رسمی اور ادبی۔ رسمی تحریر، تجارت، مکاتبت اور روزانہ زندگی کی ضرورتوں میں کام آتی ہے۔ اور ادبی تحریر صرف شاعری یا انشائے لطیف کے لئے مخصوص ہے۔

ادب ہر زبان میں موجود ہے۔ انگریزی، لاطینی، یونانی، فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، غرض کوئی زبان ایسی نہیں جس کا ایک حصۂ فائقہ، عام اور معمولی زبان سے علیحدہ کر کے "ادب" کے نام سے موسوم نہ کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ جب ہم "اُردو ادب" کہتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اُردو کے اُس اختراعِ فائقہ یا لِسانی ارتقا کا ذکر کر رہے ہیں جو اُردو کے ایک خاص اسلوب سے متعلق ہے۔

کسی زبان کا ادب، زبان کے ساتھ عزتِ تخلیق نہیں پاتا۔ بلکہ زبان جس قدر منجھتی اور سلجھتی جاتی ہے، اور اُس میں جس قدر قوت و وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اُس میں اُتنا ہی ادبی سامان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ الفاظ کی فراوانی، محاورات کا انضباط، اسالیب کا تعیّن، فصاحت و بلاغت کی تحدید، ہر زبان کے ادب کے لئے ضروری اجزا ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسباب کسی زبان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتے بلکہ پیدا کئے جاتے ہیں۔

ادبِ اردو

مثلاً ادبِ اُردو کو لے لیجئے۔ ۔۔۔ سے ہندوستان میں اُردو کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ اُردو کے سب سے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اہلِ دکن وجدی کو اُردو کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں جس کا

زمانہ ۱۰۱۵ھ ہے۔ لیکن چونکہ حضرت امیر خسروؒ کا زمانہ ساتویں صدی ہجری ہے۔ اور اُن کا کلام فارسی آمیز اُردو میں یا ہندی آمیز اُردو میں ملتا ہے۔ اس لئے ہم وجدی کو سب سے پہلا اردو شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو ۱۰۱۵ھ سے ۱۳۵۱ھ تک ساڑھے تین سو برس ہوتے ہیں، جنھیں سات دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان ادوار کی تفصیل اس جدول میں ملاحظہ فرمائیے۔

مشہور شعرائے اُردو کے چھ دَور

بہ لحاظ ترقیٔ زبان

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت

امیر کاروانِ سخن حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۶۷۵ھ ، ۶۰۵ھ

پہلا دَور

(عہد سلاطین لودی سے آخر عہدِ اورنگ زیب عالمگیر تک)

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
نوری دکنی	۹۱۱ھ	۱۰۹۸ھ	وجہی اور جنیدی وغیرہ شعرا بھی اسی دَور کے شاعر تھے
غواصی دکنی	۱۰۱۲ھ	۱۰۳۷ھ	
ابن نشاطی دکنی	.	۱۰۷۶ھ	
نصرتی دکنی	.	۱۰۹۵ھ	

دوسرا دَور

(آخر عہدِ اورنگ زیب سے عہد عالمگیر ثانی تک)

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
ولی دکنی	سنہ ۱۰۷۹ھ	سنہ ۱۱۵۵ھ	
مضمون اکبرآبادی	.	سنہ ۱۱۵۸ھ	
شاہ مبارک آبرو	.	سنہ ۱۱۶۱ھ	ناجی اور یکرنگ بھی اسی عہد کے شاعر تھے
داؤد دکنی	.	سنہ ۱۱۶۸ھ	
خان آرزو اکبرآبادی	سنہ ۱۱۰۲ھ	سنہ ۱۱۶۹ھ	
سراج دکنی	.	سنہ ۱۱۷۷ھ	
فغاں	.	سنہ ۱۱۸۶ھ	تیسرے دور میں انتقال ہوا
مرزا مظہر	سنہ ۱۱۱۰ھ	سنہ ۱۱۹۴ھ	
حاتم	سنہ ۱۱۱۱ھ	سنہ ۱۱۹۶ھ	

تیسرا دَور

عہدِ شاہ عالم

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
مرزا سودا دہلوی	سنہ ۱۱۲۵ھ	سنہ ۱۱۹۵ھ	
خواجہ میر درد دہلوی	سنہ ۱۱۳۳ھ	سنہ ۱۱۹۹ھ	
قائم	.	سنہ ۱۲۱۰ھ	

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
تاباں دہلوی	.	سنہ ۱۲۱۱ھ	تک زندہ تھے۔
میر سوز دہلوی	سنہ ۱۱۳۳ھ	سنہ ۱۲۱۳ھ	
میر تقی میر اکبر آبادی	سنہ ۱۱۳۶ھ	سنہ ۱۲۲۵ھ	چوتھے دور میں انتقال ہوا
میر حسن دہلوی	سنہ ۱۱۴۰ھ	سنہ ۱۲۰۱ھ	

چوتھا دَور

(عہدِ شاہ عالم)

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
جرأت لکھنوی	.	سنہ ۱۲۲۵ھ	
انشا لکھنوی	.	سنہ ۱۲۳۳ھ	حسرت اور ممنون بھی اسی عہد کے شعرا ہیں
مصحفی امروہوی	سنہ ۱۱۶۴ھ	سنہ ۱۲۴۰ھ	
نظیر اکبر آبادی	.	سنہ ۱۲۴۶ھ	پانچویں دور میں انتقال ہوا
رنگین	سنہ ۱۱۶۹ھ	سنہ ۱۲۵۱ھ	پانچویں دور میں انتقال ہوا

پانچواں دَور

(عہدِ اکبر شاہ ثانی سے عہد بہادر شاہ ظفر و زمانۂ ایسٹ انڈیا کمپنی تک)

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
شاہ نصیر	.	سنہ ۱۲۵۴ھ	
ناسخ لکھنوی	سنہ ۱۲۰۴ھ	سنہ ۱۲۵۴ھ	

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
آتش لکھنوی	•	سنہ ۱۲۶۳ھ	شیفتہ، اسیر، امانت- خواجہ وزیر- صبا قلق، رند اور منیر شکوہ آبادی بھی اسی دور کے شاعر تھے
ذوق دہلوی	سنہ ۱۲۰۳ھ	سنہ ۱۲۷۱ھ	
غالب اکبرآبادی	سنہ ۱۲۱۲ھ	سنہ ۱۲۸۵ھ	
نسیم دہلوی	سنہ ۱۲۱۴ھ	سنہ ۱۲۶۹ھ	
مومن دہلوی	سنہ ۱۲۱۵ھ	سنہ ۱۲۶۸ھ	
میرانیس لکھنوی	سنہ ۱۲۱۷ھ	سنہ ۱۲۹۱ھ	
مرزا دبیر لکھنوی	سنہ ۱۲۱۹ھ	سنہ ۱۲۹۲ھ	

چھٹا دور

(عہد کوئن وکٹوریہ سے عہد جارج پنجم تک)

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
تسلیم لکھنوی	سنہ ۱۲۳۹ھ	سنہ ۱۳۲۹ھ	ظہیر، انور، رسا، مجروح، سرور جہان آبادی، شاد عظیم آبادی- ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی اور مضطر خیرآبادی مرحوم کا بھی اسی دور سے تعلق تھا
امیر مینائی لکھنوی	سنہ ۱۲۴۴ھ	سنہ ۱۳۱۸ھ	
داغ دہلوی	سنہ ۱۲۴۶ھ	سنہ ۱۳۲۲ھ	
جلال لکھنوی	سنہ ۱۲۵۰ھ	سنہ ۱۳۲۵ھ	
حالی پانی پتی	سنہ ۱۲۵۳ھ	سنہ ۱۳۳۳ھ	
اکبر الہ آبادی	سنہ ۱۲۵۶ھ	سنہ ۱۳۴۰ھ	

ساتواں دَور، موجودہ دَور ہے۔ جس کے متعلق ہنوز کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی تا آنکہ فضائے ادب و شعر حشو و زوائد سے پاک ہو کر صرف ایک حقیقت رہ جائے۔ اور اس پر مستقبل قریب میں کوئی فیصلہ کن محاکمہ کیا جاسکے۔

اب خیال فرمائیے کہ اُردو زبان کی اساس گو ساتویں صدی ہجری میں پڑچکی تھی تاہم اُسکی ادبی حیثیات کا ارتفاع بارہویں صدی ہجری سے پہلے نہ ہوسکا۔ یہ خصوصیت بھی صرف اُردو ہی کو نصیب ہے ورنہ دوسری زبانوں کے ادبی زبان بننے میں اس سے بھی زیادہ وقت صرف ہوا ہے۔

اُردو کو شاعر تو عالم طفلی ہی میں مل گئے، مگر محقق بہت عرصے میں ملے چنانچہ لغت اُردو کی تدوین سب سے پہلے سترھویں صدی عہد عالمگیر میں (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) ہوئی۔ جس کا سہرا مُلا عبدالواسع ہانسوی کے سر رہا اور اُس پر نظر ثانی سراج الدین علی خاں آرزو نے کی۔

میں آپ حضرات کے سامنے ادب اُردو کی تاریخ بیان نہیں کروں گا اس مختصر تمہید سے میرا مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ زبان و ادب کی تعمیر و تدوین میں کتنا عرصہ درکار ہوتا ہے اور اُس کے لئے کس قدر سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تمام السنۂ عالم کے ادبیات کی ابتدا شاعری سے ہوئی ہے۔ شعر ایک وہبی قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پہلے ملتا ہے۔ انسانی جذبات کا مظہر اتم دماغ ہے۔ پہلے انسان سوچتا ہے پھر بولتا ہے یا لکھتا ہے۔ جب تک فن تحریر منضبط نہ تھا۔ خیالات کے اظہار و تحفظ کے لئے صرف شعر ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے شعر کو بھی ادب میں جگہ ملی۔ گو ادبی نثر کا رواج بھی اس کے بعد ہو گیا جس کو ادب لطیف سے موسوم کیا گیا لیکن عروس شعر کی چہرہ کشائی آئینہ خانۂ ادب ہی میں ہوئی اور اسی آئینہ خانے میں ادب کے بوقلموں نوادر کا صحیح عرفان و ادراک ہوسکا۔

فارسی کا اثر اُردو پر

علم جس قدر بڑھتا گیا، معلومات میں جس قدر اضافہ ہوتا گیا، ادب پر بھی جلا ہوتی گئی۔ اُردو شاعری میں ادب کی تخلیق عربی اور فارسی الفاظ کی سب سے زیادہ منت پذیر ہے۔ عہد عالمگیر میں جب اُردو شاعری نے ترقی پائی تو سب سے

پہلے فارسی شعرا نے ادہر توجہ کی۔ موسوی خان فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا عبدالغنی قبول وغیرہ فارسی کے مستند اور مشہور شعرا نے اردو میں شعر کہنے شروع کردیئے اور اس طرح فارسی ادب ریختہ اردو کے قالب میں منتقل ہوگیا۔

اردو شعرا کو تجزیۂ ادب کا خیال تو چوتھے ہی دور میں ہوچکا تھا لیکن زبان پر صیقل فی الحقیقت چھٹے دور میں ہوئی۔ مرزا داغ دہلوی نے بامحاورہ سلیس اردو جس میں فارسی کے الفاظ بہت کم اور آسان تھے اختیار کی۔ اور فارسی الفاظ کا وہ شکوہ جو میر کے زمانے سے اردو شاعری پر مسلسل مسلّط تھا۔ کمزور ہوتا گیا۔

اگرچہ اردو شاعری کی خصوصیات ایہام وغیرہ میر، سودا، مظہر اور قائم نے ترک کردی تھیں لیکن تخیل کی پیچیدگی، ادق عربی اور فارسی الفاظ کا اشتراک، میر کے زمانے سے ناسخ و آتش کے زمانے تک موجود تھا۔ مثلاً ناسخ کے یہ اشعار

غیر کو ثر کسی دریا کا میں سباح نہیں — بیشۂ شیر خدا ابن کہیں سیاح نہیں
ظلم طولِ شب فرقت کے تطاول ذکیا — دادرس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

پانچویں دور میں مرزا غالب نے مرآۃ النظیر کی تقلید ترک کرکے جو لکھنوی دبستانِ شاعری کی خصوصیت تھی اور مومن نے علیٰ قدر مناسب، اس رنگ کو نبھایا۔ جلال و امیر نے دونوں رنگ حسبِ ضرورت اختیار کئے۔ اور اس طرح ادبِ اردو کا تجزیہ اس صورت سے ہوگیا کہ اس میں وہ ژولیدگی و پیچیدگی باقی نہ رہی جو پانچویں دور تک موجود تھی۔

ادب کا مواد اور مقصد و منشا

ادبیات کا مواد من حیث المجموع وہ تمام الفاظ و محسوسات ہیں جو انسان کے دماغ میں جلوہ افگن اور زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ اس کا وسیع میدان کسی خاص زمانے سے وابستہ نہیں اور نہ کسی انسانی جماعت کے خاص طبقے یا حصے سے مخصوص ہے۔ جب اور جہاں لبِ انسان سے کوئی صدا ایسی نکلی جو اُس کی وجدانی کیفیات، مناسب اور خوبصورت الفاظ میں دوسروں پر ظاہر کرسکی۔ اس نے اس خیال سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا کہ اس کا بھی غور و فکر سے مطالعہ کیا جائے گا۔ میرے سب سے چھوٹے لڑکے مظہر سلمہ، نے ایک دن اُسکی

والدہ مسلسل اظہارِ عتاب کر رہی تھیں، اور وہ خاموشی سے کھانا کھانے کیلئے آمادہ ہو رہا تھا۔ اثنائے عتاب میں کوئی زیادہ سخت جملہ اُسکی والدہ کی زبان سے نکلا تو اس نے بجائے کہ رو متاثر ہونے کے سر جھکائے بلند آواز سے کہا" سبحان اللہ کیا شعر کہا ہے"؟ ہم سب اُس کا یہ فقرہ سن کر ہنس پڑے اور میں نے دیکھا کہ اُس کی والدہ بھی جن کی نگاہوں سے ابھی غصے کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں، مسکرانے لگیں۔

ادبیات کا منشا و مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مظاہر لسانی میں ایک ندرت، ایک مناسبت، اور ایک ترتیب پیدا کرے۔ ادبیات کی حدود ایک طرف تو لسانیات سے ملتی ہیں دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات سے ایک ادب ناآشنا صرف زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیالات تصور کر کے بحث کرتا ہے، مگر ایک ادیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی حیاتِ باطنی اور جذبات کی غیر آشکار گہرائی کا بھی پتہ لگائے۔ موضوع کے ماخذ کو الفاظ کے طلسم سے ڈھونڈ نکالے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی ماہیت بحیثیت وصفِ انسانی سمجھ سکے اور معلوم کر سکے کہ خیال سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اور ترقی و تربیت دماغ و علم پر اس کا کیا اثر ہے۔

قدیم و جدید ادب

ابھی تک دنیا کی تاریخ میں ادبیات کے تحفظ کا اثر عام طور پر ایک ہی طبقے میں محفوظ رہا ہے۔ ازمنۂ قدیم سے علما اور پجاریوں کا گروہ قومی ادبیات کا والی و وارث اور قومی زبان کی حفاظت کا ٹھیکہ دار بن بیٹھا۔ گو عوام اس سے بیگانہ اور ناآشنا ہوتے چلے گئے۔ تائید عوام سے محروم ہوتے ہی تعلیم و تعلّم کی زبان اپنی قوتِ حیات زائل کرنے لگتی ہے کیونکہ جب ادب کا استعمال عام طور پر نہیں ہوتا اور وہ ایک خاص فرقے کی ملک بن جاتا ہے تو اس کی طبعی اور ضروری نمو کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس طرح ایک ہی قوم میں دو زبانیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ماضی سے ورثے میں ملتی ہے۔ یہ روز بروز دشوار ہوتی جاتی ہے اور اس میں تصنع کا سا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری کو حال پیدا کرتا ہے اس میں ابتداءً غلطیاں اور خرابیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی حیات تندرستی اور قوت سے معمور ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ عالمانہ اور مقدس ادب کو جس سے یہ نکلی ہے جڑ سے اکھاڑ دے

اور اس کی جگہ خود لے لے۔

اصلی حفاظتِ زبان و ادب یہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ اور ارتقائے تہذیب انسانی سے آشنا جمہوریت قائم کی جائے۔ اور کامل و ہمہ گیر تعلیم کے ذریعے تمام جماعت کو اس امر میں ہمنوا بنا لیا جائے کہ ادبِ صحیح کے مسلمات کا مناسب اور مفید تحفظ کیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر کوئی تغیر ناگزیر ہو تو اُس سے بھی تعرض نہ کیا جائے۔

ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اُس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ، نئے معنی، اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لئے اس سے کچھ کم ہی مہلک ہے جتنا کہ ان خطرات کی قطعی روک تھام نہ کرنا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مناسب شرطیں عہدِ قدیم کی ترقی یافتہ اور ادبی زبانوں کے مقابلے میں عصرِ حاضرہ کی ترقی یافتہ اور ادبی زبانیں قریب قریب بالکل پوری کر رہی ہیں۔ اول الذکر کا جو حشر ہو گا وہ آخر الذکر کا نہ ہو گا۔ ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور ادبی سوسائٹیوں میں خالصیتِ زبان کی حفاظت کرنے والی قوتیں جس درجۂ ارتقا پر پہونچ گئی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں بہت ہی موافق کیفیات و حالات کی صورت میں بھی اس درجہ پر نہ پہونچی تھیں۔ زبان کا سوچ سمجھ کر غور و فکر کے ساتھ استعمال کرنے والوں کا، اور خیالات کو مناسبت و مطابقت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانے والوں کا ہر جگہ اور ہر شہر میں ایک گروہ بن چکا ہے۔ جس کے افراد کی تعداد کثیر اور جن کا اثر غالب ہے۔ تعلیم اب اعلیٰ طبقے ہی میں محدود نہیں۔ بلکہ عوام میں بھی پھیل گئی ہے۔ شاعروں کی ترویج، ادبی انجمنوں کے انعقاد، اور ادبی رسائل کے شیوع نے تحریر و تقریر نیز نظم کے اصول قائم کر دئے ہیں۔ عام گفتگو کی وہ ہیئت جس کے بہترین دماغ اور شیریں کلام و خوش نوا اصحاب حامی و مددگار رہیں اُردو پر غالب آ رہی ہے اور دیکھئے، ادبِ اُردو کا مستقبل حال سے بھی کچھ زیادہ روشن اور اُمید افزا نظر آ رہا ہے۔

نموئے ادب کے وسائل ادب میں نشو و نما کی قوت فی نفسہٖ موجود ہے۔ کسی خارجی کوشش

کی چنداں ضرورت نہیں۔ جب تک انسان کی گردن پر سر اور سر میں دماغ موجود ہے۔ الفاظ و خیال کی ہیئتِ ترکیبی سے ادب کی تخلیق ہوتی رہے گی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی نثر و نظم میں ادبی حدود کے نگراں رہیں۔ مالی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ صحیح زمین اور صحیح تخم کاری کا خیال رکھے اور اس کی پروا نہ کرے کہ پودا کیسا نکلے گا اور پھول کس قسم کے کھلیں گے۔ پھولوں کے رنگ و بو کی نفاست، آب و ہوا کی مطابقت، اور فطرت کی تخلیقی ترکیب پر چھوڑ دینی چاہیئے۔

علم اور انسانی دماغ کی کارفرمائیوں کے امتزاج سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے ہم اُس پر کسی طرح قابو یاب نہیں ہو سکتے۔ الفاظ اُس کیفیت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ زبان اس نوائے بے نوا کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ روح اُس کے کیف سے سرشار ہو سکتی ہے لیکن نطق صرف اس کا دھندلا سا نقش صفحۂ قرطاس پر مرتسم کر سکتا ہے۔ اُس کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ایک ایسی روحانی اور لاہوتی کیفیت کے ارتسام کے لئے ہمارے مادی وسائل کیا کام آ سکتے ہیں ؟۔

علم کی قوت سے ہماری روح جس قدر عرفان و حقیقت اور آگاہی و ادراک حاصل کرے گی اتنا ہی ہمارے ادب میں علو اور ارتفاع پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ادب کی نشو و نما کیلئے صرف علم و دماغ ہی وسیلہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور قاعدہ نمونے ادب کے لئے نہیں بنایا جا سکتا۔

شعر میں ادب کی جگہ

شعر میں ادب کی جگہ بہت نازک اور بہت لطیف ہے۔ شعر اور ادب کی مثال تصویر اور رنگ سے ایک حد تک سمجھی جا سکتی ہے۔ تصویر میں رنگوں کا امتزاج اگر غلط اور غیر مناسب ہے تو تصویر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو نظر فریب نہیں ہو سکتی۔ ادب کے لئے نظر فریبی بھی کوئی چیز نہیں۔ ادب وہ ہے جو دلنشیں اور روح فریب ہو۔ اس اعتبار سے ادب کی اہمیت ایک مصور کے شاہکار سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شعر اگر ادب سے خالی ہے تو ایک بے رنگ تصویر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر خیالات کیساتھ بندش بھی سست اور ترکیب بھی کمزور ہے تو پھر شعر ایک ایسی بگڑی ہوئی اور فرسودہ تصویر ہے جس کی کم عیاری مصوّر کو

معصوم کہلانے کا مستحق بھی نہیں رکھتی۔ جو شعر ادب سے خالی ہے ہم اُسے شعر کہنے میں علمی و ادبی اور لسانی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

آؤ آؤ تمہیں خدا کی قسم ۔۔۔ مان جاؤ تمہیں خدا کی قسم

یہ اعتبارِ فن عروض شعر کہا جا سکتا ہے لیکن تعریفِ ادب کے مطابق ایسا شعر کہنے والا سنگسار کرنے کے قابل ہے۔ جہلا کا مذہب یہ ہے کہ وہ ہر ایسے شعر کو جو سلیس اور صاف اردو میں ہو، خواہ اسمیں جذبات کی بلندی، مفہوم کی ندرت، تخیل کی رفعت، اور دلنشینی کی قوت نہ ہو، بہت اچھا سمجھتے ہیں میں نہیں کہتا کہ زبان کی سلاست و فصاحت فنِ شعر میں امرِ محبوب ہے۔ لیکن کیا سلیس زبان میں رفعتِ تخیل کار فرما نہیں ہو سکتی۔ سنئے یہ شعر۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے ۔۔۔ نکلے جب رات کا جاگا ہوا بتخانے سے

پہلا شعر سن کر آپ کے ہونٹوں پر ایک مضحکہ آفریں تبسم کیوں پیدا ہو گیا تھا، اور یہ شعر سن کر آپ کی روح کیوں جھومنے لگی؟ معلوم ہوا کہ شعر وہی ہے جو سماعت سے گذرتے ہی روح کو چھو لے۔ اور جسے بار بار سننے کے بعد بھی سماعت کی تشنگی باقی رہے۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے ۔۔۔ نکلے جب رات کا جاگا ہوا بت خانے سے

اس شعر میں ادب کی جگہ کہاں ہے؟ "برہمن کی صباحت" اور "رات کا جاگا ہوا" "بت خانے سے نکلے" یہ تین مقامات ادب کی بلند نشستیں ہیں۔ اگر کسی شعر میں ایک لفظ بھی ادبی چاشنی کے ساتھ موجود ہو تو ادب کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ چہ جائے کہ تین محاذوں سے ادب نشتر افگن ہو۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہ شعر زبان میں نہیں ہے؟ اور کیا اس کا کوئی ایک لفظ، ایک جملہ، اور ایک ترکیب بھی ایسی ہے جسے حدودِ زباں دانی سے خارج کیا جا سکتا ہے؟ اور لیجئے۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ۔۔۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

اس شعر میں ادب معہودِ ذہنی ہے۔ کہنے والا یہ نہیں کہتا کہ ذرا سرک جائیے۔ ذرا ہٹ جائیے۔ ذرا پاؤں ہٹا لیجئے۔ بلکہ ادبی لہجے میں یوں کہتا ہے "اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی"۔۔۔۔۔ سننے والے کے

ذہن میں شعر کا مفہوم فوراً جاگزیں ہوجاتا ہے۔ پھر کیا یہ شعر زبان کا سیدھا سادہ شعر نہیں ہے اور کیا اس میں بھی کوئی لفظ ایسا ہے جسے "ٹکسال کا سکہ" نہیں کہا جا سکتا؟ اور سنئے۔

تنگ آگئے ہیں اس بتِ ناآشنا سے ہم　　　　فریاد برہمن سے کریں یا خدا سے ہم

ادب جہاں ہے وہیں سے پکار رہا ہے کہ میری یہ جگہ ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح فریاد کرنے والے کے ذہن میں بھی خدا تو پہلے ہی سے موجود تھا مگر "برہمن" کا نام لے کر "بتِ ناآشنا" سے جو نفسیاتی مناسبت پیدا کر دی ہیں اسی کا نام ادب ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ تشبیہ اور استعارے سے "ادب" کی قوت شعر میں کم ہوجاتی ہے میں کہتا ہوں یہ خیال بھی غلط ہے۔ جہاں تشبیہ محض اور استعارہ محض استعمال کیا جائے وہاں یہ دشواری پیش آسکتی ہے لیکن اگر تشبیہ اور استعارے کے ساتھ جذبات کو شریک کر دیا جائے تو "ادب" اپنی جگہ پر ضرور قائم رہتا ہے۔ یہ شعر سنئے۔

بکھرا کے زلف کو نہ جانے پر آئیے　　　　اس تیرگی میں نقش نہ اٹھے گی جائیے

یہاں تیرگی کا استعارہ زلف کے رنگ سے کیا گیا ہے۔ لیکن جذبات کے ساتھ ہے اس لئے شعر کو ایک ادبی شاہکار کا درجہ یقیناً دیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کی سلاست اور شوکتِ الفاظ یہ سب فروعی سامانِ شعر ہیں۔ اصل چیز خیال اور اس کے بعد الفاظ کا برمحل استعمال ہے۔ خیال جس قدر بلند اور اچھوتا اور یہ الفاظ جس قدر چست اور برمحل ہوں گے اسی قدر شعر کا ادبی پہلو زیادہ نمایاں ہوگا ـــــ میر و غالب اور مومن کے یہاں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں زبان کا چٹخارہ نہیں۔ اور الفاظ کی شوکت نمایاں ہے مگر آج دنیائے شاعری ان پر ایمان لائے ہوئے ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　　　آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

اور غالب کا یہ شعر ؎

بساطِ عجز میں اک دل ملا ایک قطرہ خوں وہ بھی　　　　سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اور مومن کا یہ شعر ؎

نقدِ جاں تھا نہ سزا اَدیتِ عاشق حیف　　　　خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

سن کر یوں کہہ دینا کہ ان میں صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں اپنی کم علمی اور بے مایگی کا اعلان کرنا ہے۔ اگر ادب فہمی کا مذاق ہے تو پہلے علم حاصل کیجئے ادب کا عرفان خود بخود ہو جائے گا۔

ملک کی اجتماعی زندگی پر ادب کا اثر

مادّی ہاتھوں میں فنونِ لطیفہ کی جیسی مٹّی خراب ہوئی ہے ناقابلِ بیان ہے۔ خصوصاً شعر و موسیقی کے لئے ہندوستان کا موجودہ دَورِ حیات بہت زیادہ صبر آزما ثابت ہو رہا ہے۔ شعر و موسیقی سے ذہن و دماغ کو محفوظ رکھنے کا وعظ مادیت میں لتھڑے ہوئے طبقات کی خوئے قدیم ہے۔ حکومت کی طرف سے آج تک کسی ایسی درسگاہ کا افتتاح نہیں ہوا جو شعر و موسیقی میں تدریسی شان پیدا کر دیتی۔ قوم کی طرف سے کوئی ایسا مستند اور باقاعدہ مدرسہ اب تک نہیں بنا جو صرف ادبی نشو و نما کے لئے مخصوص ہوتا۔ ان تمام موانعات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ملک پر ادب و شعر کی حکومت ہے۔ کوئی شہر خواہ اُس کا عمرانی اقتدار کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، ایسا نہیں جہاں ایک "بزمِ ادب" قائم نہ ہو چکی ہو۔ مشاعروں کی کثرت، شعرا کی مانگ کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو ادب و شعر کی علی رؤس الاشہاد تکذیب و تضحیک کرتے رہتے ہیں، ادبی اجتماعات میں اُن کی نشست سب سے آگے ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کی صحافت عوام کے طبعی و ذہنی رجحانات کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کوئی حقیر سے حقیر جریدہ بھی ایسا نہیں جو ادبیات کی نشر و اشاعت سے بے نیاز ہو۔ کوئی اخبار اُٹھا لیجئے، کوئی رسالہ لے لیجئے، نثر میں یا نظم میں ادبیات کی جلوہ افروزی ضرور رہے گی۔ معلوم ہوا کہ ہماری اجتماعی زندگی ادبیات کے اثر سے مسحور ہے۔ اور ہم باوجود موانعات و مشکلات ادب کی پذیرائی و گیرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

ادب ہمارے دماغ اور ہماری روح پر اپنی فطری قوتوں کے ساتھ مسلط معلوم ہوتا ہے۔

حیاتِ قومی میں ادبیات کا حصّہ

کسی قوم کی اخلاقی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور اجتماعی زندگی کا پتہ ہمیں صرف اُس کے ادبی کارناموں سے ملتا ہے۔ جن قوموں کا ادب زندہ ہے وہ قومیں آج بھی زندہ ہیں۔ ہم اُن کے ادب سے اُن کی ذہنی کیفیات

اور جذبات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

زندگی کا کوئی شعبہ لے لیجئے، وہ سیاست ہو یا مذہب، ادب موجودہ کے اثرات سے معرا نہیں ہو سکتا۔ ادب زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ ادب اردو کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں مطربان ادب نے ملک کی ہر جہتی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال کر نغمۂ بیداری نہ گایا ہو اور سوئی ہوئی قوم کو جگا نہ دیا ہو۔ ایک ہندوستان کیا عرب و مصر اور یونان و روما کے ایوانوں اور ویرانوں میں تہذیب و تمدن اور ارتقائے انسانیت کے جو غیر فانی نقوش پائے جاتے ہیں وہ بھی ادبی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہیں۔ جس قوم نے اپنی زبان کے ادب کو محفوظ رکھا اُسکی روایات محفوظ رہیں اور جس نے ادب سے بے اعتنائی کی اُن کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پہ باقی نہ رہا

ادب نہ صرف قومی خصوصیات و روایات کے تحفظ کا ضامن ہے بلکہ ماحول اور واقعات و حالات کی تصویریں بھی نگارستانِ ادب میں صدیوں محفوظ رہتی ہیں۔ سنسکرت جو ہندوستان کی قدیم ترین زبان ہے اور جو آج بھی پاٹھ شالاؤں اور بعض یونیورسٹیوں میں ثانوی زبان کا درجہ رکھتی ہے اپنی ہمہ گیری سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جائے لیکن ہندوستان کے عہدِ عتیق کی فضائیں اُس کے ادب میں اس طرح منجلی ہیں کہ گویا اُن کی تصویریں ابھی کھینچی گئی ہیں۔ اور ہم اُن سے بعید ترین آریہ قوموں کے جذبات و احساسات کا صحیح علم حاصل کر رہے ہیں۔

علم و ادب کی تبلیغ و خدمت کے ذرائع

علم و ادب کی خدمتِ تبلیغ و ترویج کی ذمہ داری جہاں خود علما، ادبا اور طالبانِ علم و ادب پر عائد ہوتی ہے وہاں اُس حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے جو کسی ملک و قوم کے اجتماعی انتظام کی ذمہ دار ہو۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیشہ حکومتوں نے علم و ادب کے شعبوں کو اپنی نگرانی و انتظام میں رکھ کر بنی نوعِ انسان کی عظیم الشان ادبی و علمی زندگی کے احیاء و بقا کی مستقلاً کوشش کی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایران میں ایرانی، ترکستان میں ترکی، مصر میں مصری، اور حجاز و عرب میں عربی، یونان میں یونانی، انگلستان میں انگریز اور ہندوستان میں آریہ حکمرانوں نے علوم و فنون

کی گہری دلچسپی کے ساتھ سرپرستی فرمائی، اپنی اپنی زبانوں کے تحفظ و ترقی کے لئے بڑے بڑے علمی و ادبی مراکز قائم کئے۔ اور ادیبوں اور علما کو وظائف دے کر انھیں فکرِ زندگی سے آزاد کیا۔

ابھی تاریخ کے صفحات نے عباسی خلیفہ مامون رشید کے اُس عظیم کارنامۂ علمی اور ذوقِ ادب کو فراموش نہیں کیا ہے جو ایک طویل شدید جنگ کے فیصلے کی صورت میں قیصرِ روم سے اس سمجھوتے پر منتج ہوا تھا، کہ قیصرِ روم یونانی فلسفے کی تمام کتابیں اُس کے سپرد کردے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مامون نے سلطنتِ روم کو محاصرے سے آزاد کرکے صلح کرلی۔

اگر مامون اور اُس کا ذوق اس جذبے کا حامل نہ ہوتا اور اگر وہ بہ اعتبارِ ذوقِ علم اتنا عظیم انسان نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ یونانی فلسفہ اس درجہ اکملیت کے ساتھ عربی زبان میں منتقل ہوجاتا۔ مامون نے اس کی تکمیل کے لئے ایک عظیم الشان دارالترجمہ قائم کیا تھا جس میں عہدِ مامون کے تمام سربرآوردہ علما اور ادبا تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔

ابھی تاریخ نے امی اکبرِ اعظم کے اُس قابلِ رشک ذوقِ ادب کو نہیں بھلایا ہے جس نے فیضی اور ابوالفضل کو سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اور جس کے ذریعے فارسی اور سنسکرت علم ادب میں ایک ایسا تبادلۂ علمی ہوگیا جس نے ہندوستان میں متحدہ قومیت کی مضبوط بنیاد ڈال دی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ کسی حکومت پر جہاں اپنے مقبوضہ ممالک کی حفاظت کے لئے کثیر التعداد فوج رکھنے کی ضرورت ہے، وہاں بطورِ فرض ملکی زبان و ادب کی ترویج و اصلاح اور ترقی و فلاح کی طرف متوجہ ہونا بھی لازمی ہے۔

چنانچہ آج رشیا نے اس اندیشے اور ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ اُس نے اپنے ادبا شعرا اور شاعروں کے لئے ایک علاحدہ مستقر بنادیا ہے جہاں وہ آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کے اخراجات کا تمام بار سلطنت برداشت کرتی ہے۔

ادب و شعر کی یہ گرم بازاری، کہ آج بیشتر افرادِ ملک شعر کہتے ہیں اور شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں

خدمتِ ادب سے ہمیں ذرا بھی بے نیاز نہیں کرتی۔ یہ افراط نہ خود اُن کے لئے مفید ہے نہ ادب کے لئے فائدہ مند کہی جاسکتی ہے۔ جب تک کہ تقسیمِ کار کے اصول پر ہماری شاعرانہ جماعتوں کو تقسیم نہ کردیا جائے

اگر صحیح اعداد و شمار سے کام لیا جائے تو تمام ہندوستان میں کئی ہزار نفوس ایسے نکلیں گے جو خود کو شاعر سمجھتے ہیں اور جو شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اُنھیں عہدِ حاضر کا شاعر نہیں کہا جاسکتا، ہزاروں ایسے بھی ہیں جن کی تمام عمر مشقِ سخن اور خدمتِ ادب میں گذری ہے لیکن اب تک باوجود دیرینہ مشقی و کہنہ سالی اُن کا کوئی خاص درجہ تاریخِ ادبِ اردو میں قائم نہیں ہوا ——— میری رائے میں ایسے لوگوں کو اپنا راستہ بدل دینا چاہئے۔ اور تنازع للبقا کے اصول کے مطابق زندگی کے ایسے نئے محاذ پر نمودار ہونا چاہئے جہاں وہ اپنی عملی کوششوں سے بقائے دوام حاصل کرسکیں۔ بقائے شعر و احیائے ادب کے لئے لازمی نہیں کہ تمام ملک شاعر بن جائے۔ مسندِ شاعری صرف اُسی کے لئے مخصوص ہے جو فطرتاً شاعر ہے، جسے شاعر بنکر جینا، شاعر بن کر مرنا اور شاعری کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہنا مقدر ہو۔

میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ مجھے ادبِ اردو کا مستقبل نہایت زرّیں نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں حقیقی خدمتِ ادب کا ذوق برابر بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ملکی صحافت ادبی جواہر ریزوں سے مستقلاً مالامال ہوتی چلی جارہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ انھیں نوجوانوں میں سے چند نفوس میرؔ و سوداؔ، اور داغؔ و غالبؔ کی فطرت لے کر پیدا ہوئے ہوں۔ اور اُن سے یہ دور ایک غیر فانی ادبی دور بن جائے۔ میں تمام ملک سے بہ آوازِ بلند اپیل کرتا ہوں کہ اُردو ادب کے تحفظ اور روایاتِ ادب کی نگرانی میں کشادہ نظری اور وسعتِ ذہن سے کام لینے کی ضرورت ہے ہم موجودہ دور کے شاعرانہ عروج و زوال کے ضامن ہیں۔ ہمیں مادیات میں گھِر کر ایسی غفلت اور بے اعتنائی سے کام نہ لینا چاہئے جو آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ہمیں مطعون و ذلیل کردے ہمیں اپنے ادبا اور ادب کی سچائی کے ساتھ خدمت کرنی چاہئے تاکہ ہمارا دور، دورِ پیشین و عہدِ آئندہ کیلئے ایک قابلِ تقلید دور ثابت ہوسکے۔

آٹھواں خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب کاندھلہ ضلع مظفر نگر

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء

تحدیثِ نعمت

معزز اراکینِ بزمِ ادب، و گرامی شرکائے مشاعرہ!

فی الحقیقت وہ تفوق و اعزاز ایک نعمت ہے جو کسی کو کسی جماعت یا مجلس کی طرف سے عطا کیا جائے۔ اسلئے اس تفویضِ صدارت کا شکریہ ادا کرنا تحدیثِ نعمت ہی کے مترادف ہے۔ اور "وَ اَمَّا بِنِعمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّث" کی نیازمندانہ تعمیل۔ پھر اُس کے جذبۂ تشکّر کا کیا پوچھنا ہے جو اپنی ناچیز ہستی پر ایسی نعمتوں اور سرافرازیوں کا نزول صرف عطائے ایزدی اور خدا کا کرم سمجھتا ہو۔

اُردو شاعری کی ترقی اور معیار

حضرات! اُردو شاعری مختلف انداز و طراز کے ساتھ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتی رہی ہے۔ السنۂ مشرقیہ میں اُردو کی ہمہ گیری کے باوجود اب اُردو کی ترقی کا کوئی معیار ذہنی متعین نہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آج اُردو شاعری ترقی کی کس منزل پر ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کی رفتار عروج کی طرف ضرور ہے بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں میر و غالب نے ایک خاص معیارِ شاعری معین کر دیا تھا۔ لیکن تیرہویں صدی کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز میں وہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ اور ملک کا اقبال سرد و عیش پسند طبقہ اپنے مذاق کے مطابق شاعری کو کہیں سے کہیں کھینچ لے گیا۔ پھر بھی

ماضی کا مجوزہ و مقررہ معیار، اپنی شوکت و متانت کے اعتبار سے اتنا بودا اور کمزور نہ تھا کہ اس کشمکش سے اس کا اعادہ ناممکن ہو جاتا۔ بالآخر چودہویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں، جب ہندوستان مغربی و مشرقی علوم کا گہوارہ بن چکا تھا۔ وہ ہی میر و غالب کا معیار بروئے کار آیا۔ اور آج اعلیٰ علمی سوسائٹی میں اسی معیار کی پرستش جاری و باقی ہے۔ جن حاشیہ نشینانِ بزم ادب نے افراط و غلو سے کام لیا وہ بدمست ہو کر محفل سے رخصت ہوئے اور اعتدال پسند جماعت اپنی سرمستی کے نغمے بلند کرنے کے لئے اپنے پیش رو بادہ گساروں کی صحیح جانشیں سمجھی گئی۔

مشاعرے

اس طرح اردو شاعری تو کسی نہ کسی درجہ ترقی پر قائم رہی۔ لیکن مشاعروں کی اصلاح و تہذیب کی طرف دماغ و ذہن شاید کبھی متوجہ نہ ہوا۔ مشاعروں کی وابستگی، شاعری کے ساتھ ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب و تمدن کے ورود سے جہاں مشرق کی بیشتر روایاتِ قدیم میں اضمحلال پیدا ہو گیا، وہاں "مشاعرہ" بھی قدیم روایات کا زیادہ پابند نہیں رہا۔ اول اول مشاعرے قلعۂ شاہی میں ہوتے تھے، اس کے بعد امرا بادشاہ کی خوشنودی کے لئے مشاعرے منعقد کرتے رہے۔ اس کے بعد بعض دیگر خواص نے مشاعروں کے انعقاد میں حصہ لیا آخر آخر یہ ایک رسمِ عام ہو گئی۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ معمولی ترین خرچ کر کے بھی مشاعرہ منعقد کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض اوقات بغیر خرچ بھی مذاقِ غزلخوانی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

مشاعرے کا رواج، اپنے نقطۂ آغاز سے جس قدر دور ہوتا گیا اسی قدر اس کی عظمت، اہمیت اور افادیت میں کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ آج اکثر مشاعرے صرف تفریحی، رسمی، اور تطفلاً دماغ فرسا ہوتے ہیں۔ جن میں چند تفریح پسند افراد جمع ہو کر رات کا ایک بڑا حصہ تالیوں اور قہقہوں میں سیاہ کر دیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی مشاعروں کا نتیجہ ہے کہ مشاہیر اور ثقہ شعرا نے مشاعروں میں جانے سے قدم روک لیا ہے۔ ورنہ پہلے بھی مشاعرے تھے جن میں اساتذہ اور منتہی شعرا سر آنکھوں سے شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعروں کے انعقاد کا انتظار "شامِ عید" کی طرح کیا جاتا تھا۔

مشاعرے کا مقصدِ اقصےٰ صرف یہ ہے کہ ایک عہد کے قابل اور دیدہ مشق شعرا ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ

کلام کریں اور اس تباطۂ کلام سے مبتدی اور طلبائے فن فائدہ اٹھائیں یعنی ایک اجتماعی حیثیت سے ادب کی رفتارِ ترقی کا اندازہ ہوتا رہے اور اس کے ساتھ ہی ترقی کی طرف عملی قدم اٹھتا رہے۔ لیکن جہاں اُدبا اور فضلا کا پتہ بھی نہ ہو اور تفریح پسند طبائع زمین و آسماں کے قلابے ملا رہی ہوں، وہاں ادب کی رفتار و معیار کا اندازہ کرنا، اور ترقی کی طرف کوئی مستحسن اقدام کرنا، نقار خانے میں طوطی کی آواز سن لینا ہے۔

اگر مشاعروں سے احیائے ادب اور ترویج و تشویقِ زبان مقصود نہ ہوتی تو دورِ حاضر میں سب سے پہلے ایک دیرینہ خادمِ ادب کی حیثیت سے میں ہندوستان سے بہ منت عرض کرتا کہ مشاعرے قطعاً بند کر دئے جائیں۔

شعرا کی بے قدری و کس مپرسی

عصرِ موجودہ کے مشاعرے نہ صرف ناموسِ ادب کے لئے ننگ و عار ہیں بلکہ ان کے ذریعے ہمارے نام نہاد شعرا کی جیسی مٹی پلید ہو رہی ہے وہ بھی ناقابلِ بیان اور قابلِ ماتم ہے۔ جو مجمع خود ان کے ناخواندہ اور ناخواستہ اجتماع سے برپا ہوتا ہے۔ اس میں ان کی ذرا بھی پرسش نہیں ہوتی۔ ان کا قیام اکثر ایسی کارواں سرائے میں ہوتا ہے جس میں برابر برابر بہت سی شکستہ و ریختہ چارپائیاں پڑی ہوتی ہیں اور یہ شہسوارانِ عرصۂ سخن، مشاعرے کی مہم سر کرنے سے پہلے اور سر کرنے کے بعد اُن پر آرام فرماتے ہیں۔ کھانا انھیں جیسا ملتا ہے غالباً سرائے کے کھانے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تو ان غریبوں کو پھر کوئی پوچھتا بھی نہیں جو سادہ لوح کرایۂ ریل اپنی جیب سے خرچ کر کے "آل انڈیا شاعروں" کے فریب میں آجاتے ہیں اُنھیں واپس ہونے کے لئے اکثر اپنی کلاہ و دستار کا، رہینِ منت ہونا پڑتا ہو گا۔ اس لئے کہ مشاعرے کے بعد بانیان و منتظمانِ مشاعرہ کو اپنی واماندگی و سرخوشی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ان ناخواندہ مہمانوں کی واپسی کا انتظام کریں۔ اس تمام مصیبت و زحمت کے باوجود کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جہاں یہ شہرت پسند جماعت " تو مان نہ مان میں ہوں تیرا مہمان" کا نعرۂ انانیت الاپتی ہوئی نہ پہونچ جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اب مشاعرے قلعۂ معلیٰ میں تو ہوتے

نہیں۔ مختلف شہروں میں چند ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ وہ بھی چندے کرکے مشاعرے منعقد کرتی ہیں بیشک جب مرجوعہ اس قدر خطرناک ہو تو بدنظمی کا سارا بار الزام بانیانِ مشاعرہ کے سر نہیں تھوپا جاسکتا۔

اس کا علاج لیکن جب روایاتِ مشرق کو پسِ پشت ڈال کر مشاعرے بجائے مسند و بساط کے کرسیوں اور اسٹیجوں پر ہونے لگے ہیں اور جب شمع محفل کی جگہ برقی قمقمے آتشِ محفل سمجھے جارہے ہیں تو اس روز افزوں انحطاط کو روک دینے کے لئے بھی کسی مغربی طریقۂ انتظام سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ورنہ سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ ہر مشاعرے میں صرف مخصوص و منتخب شعرا کو دعوتِ شرکت دی جائے۔ اور دعوت ناموں میں صاف لکھ دیا جائے کہ غیر مدعو حضرات کے قیام وطعام یا غرض کذائی کی کوئی ذمہ داری بانیانِ مشاعرہ پر نہ ہوگی۔ اس طرح نام نہاد شعرا کی یہ ہنگامہ آرائی خود بخود کم ہو جائے گی۔ اور مشاعروں میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔

کسی مشاعرے کی کامیابی کا انحصار کم سواد و بد مذاق شعرا کی کثرت اور نااہل سامعین کی ہنگامہ آرائی پر کبھی نہیں ہوسکتا۔ جس میں دو چار ادیب و مشاہیر شریک ہو کر ہمیں اپنے کلام سے مستفیض کریں وہ مشاعرہ یقیناً کامیاب ہے۔ جب اربابِ علم و کمال کی کمی نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ بدنام کنندگانِ ادب کو ایوانِ ادب میں اذنِ باریابی دے کر اشاعتِ فن کے مقصدِ عظیم کو پراگندہ کیا جائے، اور ایک سکون آفریں فضا کو شورش پسند افراد کا اکھاڑہ بنادیا جائے۔

مشاعروں کے مطروحہ مصرعوں کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اکثر مصرعے مذاقِ سلیم سے قطعاً گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور مشاہیر شعرا کی عدم شرکت کی ایک بڑی وجہ مصرع کا بیکار ہونا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے مصرع کی تجویز ہمیشہ صدرِ مشاعرہ کی رائے سے ہونی چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے مذاق و ذوق کے مطابق مشاعرے کا ماحول مرتب کرسکے۔ اور ادبی اجتماع کے لئے ایسا مصرع تجویز کرے جو عظمتِ ذوق، اور رفعتِ خیال سے متوازن ہو کر ایک ادبی مجلس میں بارآور ہونے کے شایاں ہو۔

صدارتِ ناقص میں ہمیشہ اس کے خلاف رہا ہوں اور اب بھی بزور احتجاج کرتا ہوں کہ مشاعروں یا ادبی مجالس کی صدارت کبھی کسی غیر شاعر کو تفویض نہ ہونی چاہئے

ہماری ادبی مجالس میں کوئی "سر" اور کوئی "آنریبل" کسی خادمِ ادب پر قابلِ ترجیح نہیں ہو سکتا۔ ایک غریب خادمِ ادب جس نے سالہا سال ادب و شعر کی خدمت کی ہو اِن خطاب یافتہ غیر ادبی شخصیتوں سے ہر حال ممتاز ہے۔ کسی غیر شاعر صدر کی صدارت میں مشاعرہ پڑھنا شاعر اور شعر دونوں کی توہین ہے۔ ایسے مشاعروں کی شرکت سے اگر ہمارے وطن کے مقتدر شعرا احتجاجاً انکار کر دیا کریں تو یہ بدعتِ جاریہ بھی مسدود ہو سکتی ہے۔

صدرِ مشاعرہ اگر شاعر نہ ہو تو ادبیاتِ مشرق کا ماہر یا اُن سے وابستہ تو ہو۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کے شاعر نے اپنا وقار خود کھو دیا ہے۔ وہ چاہے تو اب خود ہی اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ میں صاف اور صریح الفاظ میں یہ پیش گوئی کرنے کے لئے مجبور ہوں کہ اگر شاعروں کی موجودہ روش و رفتار کی جلد اصلاح نہ کی گئی تو مستقبل قریب میں کوئی مستند شاعر اور معتبر ادیب کسی مشاعرے میں کبھی شریک نہ ہوگا۔ اور مشاعرہ صرف بھنڈئی یا تھیٹر بن کر رہ جائے گا۔

میں تمام ہندوستان کے ادب دوست نوجوانوں اور ادیب بزرگوں سے التجا کرتا ہوں کہ اگر اُنھیں فنِ شاعری کا تحفظ اور احیائے ادب مقصود و منظور ہے تو موجودہ افراط و بدعات کا تجزیہ لازمی و ضروری ہے۔ ورنہ یہ فنِ شریف اس قسم کی بھکّڑ بازیوں اور مضحکہ انگیزیوں کے ہاتھوں ذلیل تر ہو جائے گا۔ اور مشاعروں سے جو توقعات قائم کی جا سکتی ہیں وہ سب مجروح و معدوم ہو کر رہ جائیں گی۔

مشاعرے کا غلط ماحول

مشاعرے میں شعرا کی طرح سامعین کا بھی کوئی خاص معیار نہیں۔ آنے جانے اور اُٹھنے بیٹھنے کا کوئی طریقہ مقرر نہیں ہوتا۔ جب جس کا جی چاہا اُٹھا اور چلا گیا، جس کا دل چاہا آیا اور بیٹھ گیا۔ اس ہڑبونگ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سخن فہم داد شناس حضرات شعرا کی نگاہ سے دور رہتے ہیں اور ایک قسم کا انتشار پیدا ہو جاتا ہے اس سلسلے میں بھی فطرت و ضرورتِ اصلاحِ بزم کی تنظیم چاہتی ہے۔ شاعر کا دل، جو فرشتوں کی ہم نشینی و ہم مجلسی کا خوگر ہے، ربطِ غیر جنسی اور اختلاطِ ناروا سے اور بھی اُلجھ جاتا ہے۔ اور صرف "سکوتِ سخن شناس" ہی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ "تحسینِ ناشناس" سے بھی اُسے محروم رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھ کر بے محل بیٹھنے والے محلِ داد

اور موقع تحسین سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے اُن کی نافہمی بھی سکوتِ مطلق بن جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شعر انتہائی رکاکت وابتذال کی وجہ سے اُن کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوب تالیاں اور سیٹیاں بجتی ہیں، اور ایک ایسی فضا خراش چل پکار، شاعرے کے ماحول میں گونجنے لگتی ہے کہ گویا کسی بند مکان میں کبوتروں کی کئی ٹکڑیاں لڑ رہی ہیں اور کبوتر باز "ہاؤ ہو" میں مصروف ہیں۔

مشاعروں میں جب تک سخن شناس اور تعلیم یافتہ ذی فہم حضرات کی شرکت کا بطورِ خاص انتظام نہیں ہوتا، مشاعروں کا صحیح ماحول قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت بھی یہی ہے کہ اعلیٰ طبقے کے ادب دوست افراد کو دعوتِ شرکت دی جائے اور اُنکی نشست کا خاص اہتمام کیا جائے، اب رہے دوسرے لوگ تو ان کو درجاتی طور پر بزمِ سخن میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

خودرَو شعرا کی اصلاح

ہندوستان میں ایک طبقہ شاعروں کا تو وہ ہے جو کسی استادِ فن یا ماہر کامل کا پیرو اور تابع ہے۔ اس کی روش افکار محتاط، اور عیوبِ لسانی سے منزہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خود بینی و خود روی کے زعم میں کسی کا اتباع اور کسی کی اصلاح پسند نہیں کرتا۔ اس طبقے کے افراد گمراہ ہونے کے باوجود، خود کو خضرِ راہِ ادب سمجھتے ہیں، اُنکی کجروی کی ایسی کردہ مثالیں ملتی ہیں کہ بے اختیار شاعری سے تائب ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً ابھی ۲۰/۲۱ راکتوبر کو میرٹھ کے آل انڈیا مشاعرے میں ایک صاحب نے علیٰ رؤس الاشہاد پڑھ دیا۔

"میرا جبیں رہے نہ تری آستاں رہے"

ماتم گساران ادب کی نگاہیں نیچی ہوگئیں، اہلِ علم مسکرا کر رہ گئے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ لیکن اس پر خود غلط شاعر نے آخر تک نہ سمجھا کہ یہ مختلف النوع مظاہرہ تضحیک کیوں ہو رہا ہے؟ مشاعرے کے یکایک بے معنی صداؤں سے لبریز ہو جانے کو ہمارا خودرَو شاعر اپنے شعر کا معجزہ سمجھتا ہے۔ لیکن اس شورِ بے جا، اور دادِ بے ہنگام کی غایت نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے نہ اُسے کوئی سمجھاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور صاحبزادے نے اسی مشاعرے میں یہ شعر نہایت آزادی سے پڑھا ؎

ہے دخل غیر غیر ضروری شبِ وصال تکیہ بھی میرے آپ کے کیوں درمیاں رہے

استغفر اللہ! اگر ہماری شاعری کا معیار یہ شعر ہو سکتا ہے تو ایسی شاعری قابلِ نفرین و لعنت ہے۔ یہ شاعر ایسا شعر کہہ کر لاتعداد گناہوں کا مرتکب ہوا ہے۔ اخلاقی گناہ۔ تمدنی گناہ، مجلسی گناہ، ادبی گناہ، اب اگر اتنے گناہوں کی پاداش اسے بصورتِ عذاب برداشت کرنی پڑے تو کیا اس کی نجات کی وہ جماعت ضامن ہو سکتی ہے جس نے اس شعر پر داد و تحسین کا طوفان برپا کر دیا۔ اور جس کی طبیعت باوجود اعادۂ و تکرار بھی اس شعر سے سیر نہ ہوئی؟ معلوم ہوا کہ جہاں ہندوستانی شاعرِ امروز کا مذاق شعر پست اور ذلیل ہو گیا ہے وہاں سامعین کا مذاق بھی گرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو پھر شاعر اور شاعر نواز سامع دونوں کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔

محاکمے کی ضرورت

یہ فرض ناگوار بھی صدرِ مشاعرہ کو ادا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس قسم کی لغزشیں، غلطیاں اور بے عنوانیاں شاعری میں دیکھے تو بعدِ مشاعرہ اُن پر محاکمہ کر کے بتائے کہ "جبیں" مونث اور "آستاں" مذکر ہے۔ اور نہایت نرم الفاظ میں آگاہ کر دے کہ اس قسم کے رکیک ایہام کی اُردو شاعری متحمل نہیں ہو سکتی جس کا مظاہرہ شعر مذکور میں کیا گیا ہے۔ بغیر محاکمہ غلطی اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ اور غلطی کرنے والا اپنی جگہ لا علم و بے خبر۔ پھر اصلاح ہو تو کیونکر؟ محاکمے سے پہلا فائدہ تو یہ ہو گا کہ غلطی کرنے والا آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا۔ اور دوسرا یہ کہ عوام بھی اس غلطی سے واقف ہو کر اُس کے ارتکاب سے باز رہیں گے۔ محاکمہ بیشک ایک جامِ تلخ ہے جسے کوئی آسانی اور خوشی سے گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن بغیر اس تلخی کے اصلاح بھی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس لئے میری رائے ہے کہ شاعروں میں رفتہ رفتہ محاکمے کا بھی رواج ہونا چاہیئے۔ جس کا پیرایہ ایسا ہو کہ باوجود تلخ ہونے کے تلخ معلوم نہ ہو۔ جس طرح کنین کی گولی پر اگر شکر کی تہ چڑھا دی جائے تو اُسے مریض گوارا کر لیتا ہے اور کنین کی ماہیت و اثر میں کوئی فرق نہیں آتا۔

غزل کا معیار

جب ہنوز اُردو شاعری ہی کا کوئی معیار معین نہیں تو ظاہر ہے کہ غزل کا معیار بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اُردو شاعری اس قدر متنوع المعیار ہے کہ اگر پانچ غزلیں بہ یک وقت دیکھی جائیں تو اسلوبِ بیان سب کا جدا ہو گا۔ جب زبانِ اُردو

اپنے الفاظ اور محاورات کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستان میں عموماً اور اہلِ زبان میں خصوصاً یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے تو پھر اسالیبِ بیان کا یہ اختلاف شاعری ہی سے وابستہ کیوں ہے؟ یقیناً اس کے کچھ اسباب ہیں۔ اُن میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض لوگ صرف روزمرہ کی ترویج کے حامی ہیں۔ اور متانتِ خیال و الفاظ کے مخالف۔ وہ کسی شرط پر یہ نہیں چاہتے کہ اصنافِ سخن میں جس چیز کا نام "غزل" ہے وہ تغزلِ محض سے سیر ہو بھی تجاوز کرے یا اسکے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش پیدا ہو۔ غالباً اُن کا یہ اصرار صرف اس لئے ہے کہ وہ "غزل" کے لغوی معنی کی تحدید چاہتے ہیں۔ اور "بازناں سخن گفتن" سے زیادہ غزل کو کوئی اور حیثیت دینا نہیں چاہتے۔

میری رائے میں غزل کے لغوی معنی واضع نے جو کچھ رکھے ہوں، مگر اصطلاحی معنی کی وضع موجودہ زمانے میں ہمیں ضرور بدلنی پڑے گی۔ اُردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اسکے اثرات سے غزل محفوظ نہیں رہی ہے اور ایک عجیب غریب مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ مرزا داغ کے پیرو، اور امیر کے بعض متبعین، غزل کو زبان کی شوخی، خیالات کی عمومیت اور چوچلے پن تک محدود سمجھتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول غزل میں آشیان و جنازہ، میت، گل و بلبل، ماتم و سینہ کوبی وغیرہ کو تغزلِ صحیح سمجھتا ہے۔ اور وہ نوجوان جن کے پیشِ نظر مستقل طور پر کوئی خاص راستہ معلوم نہیں ہوتا، غزل کو محض اظہارِ خیال و بیانِ جذبات کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ بہت محدود اور بہت ہی مشکل صنف ہے۔ اسکی ترقی کی بھی دنیا میں زیادہ گنجائش نہیں، متقدمین میں میر و غالب اور مومن و داغ ہر ایک کا تغزل علیحدہ علیحدہ درجہ رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر شعراء "تغزلِ صحیح" کے پیرو نہیں ہیں۔ صبر کر لیا جاتا اگر وہ غزل میں کسی اسکول کی صحیح تقلید بھی کرتے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ آج ہر اس نظم کو غزل کہدیا جاتا ہے جو، یا گیارہ اشعار کا مجموعہ ہو اور جس کے اشعار مختلف مضامین پر مشتمل ہوں

دراصل شاعری جس کی تحلیل اس مختصر سے خطبہ میں ممکن نہیں بہت ہی اہم اور مشکل ترین فن ہے جو ظنیات کو علیحدہ کر کے صرف شاعر کے باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر جس جس روحانی منزل

سے گذرتا چلا جائے گا اس کی شاعری بھی اتنی ہی ترقی کرتی جائے گی، غزل جو روحانیت کے بلندترین تخیل کے مقابلے میں بہت بڑی حد تک مادی یعنی مجازی دنیا سے تعلق رکھتی ہے اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ شاعر کی روح سوزِ محبت سے خاکستر ہو چکی ہو اس کے بعد وہ جس جس طرح محبت اور اس کے ارتقا کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اس کی شاعری بھی بلند ہوتی جائے گی اور اس بلندی کے ساتھ ساتھ تصوف و توحید اور دوسرے مسائل کی جھلک اس کے کلام میں نظر آتی جائے گی

حقیقی شاعر اپنے تغزل میں ان مدارج اور مراتب پر پہونچ کر ایسا لطیف چھینٹا دیتا ہے کہ سارا عالمِ محسوس اس کے رنگ کا پرتو معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ تو ہے شاعری اور اسکی ایک صنف غزل کا اصلی روپ، مگر اب یہ بھی تو دیکھئے کہ اکثریت اس پر کہاں تک عمل کر رہی ہے، افسوس میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں تجزیہ و تحلیل کے بعد اسکی تشریح کرتا۔ اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غزل اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہی ہے۔ جب یہ حال ہے تو اصلاح کی کوشش کا خیال یہ صورت جواز پیدا کرتا ہے کہ اس کو "بازنان سخن گفتن" تک محدود نہ رکھا جائے اور جہاں تک ہو، لطیف و رنگین متین اور اعلیٰ خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے

فنی طور پر میں "تعین" کا قائل و حامی ہوں، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر کوئی شخص صحیح غزل کہہ سکتا ہے یا کہتا ہے تو اُسے بھی مندرجہ بالا نظریہ کا پابند یا قائل ہونا ناگزیر ہو۔ جو طبقے صحیح غزل نہیں کہہ سکتے وہ اگر نظریۂ مذکور کو اختیار کر سکتے ہیں تو انھیں اختیار ہے۔

غزل کی زبان

جو طبقات غزل کو صرف بازاری خیالات اور چوچلے بگھاری تک محدود سمجھتے ہیں، وہ اس کے بھی حامی ہیں کہ غزل میں روزمرہ استعمال ہونا چاہئے میرا مذہب یہ نہیں ہے، میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں، غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ مضبوط و لطیف، پرشوکت و نغمہ بار ہوں اور خیالات و جذبات بلند و پاکیزہ ہوں۔

سادگی کے ساتھ مناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی

پیدا ہو سکتی ہے، وہ شعراجن کی زبان اور خیال کمزور لعدیے جان ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ اُن کو پیچھے ڈھکیل رہا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ انکی ترقی کے امکانات مسدود ہوتے جارہے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اندر لسانی و ذہنی انقلاب کے متوازن انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہیں، یاد رکھئے، زبان کی بلند پایگی و متانت، الفاظ کی مناسب نشو کت، خیالات کی بلندی، تراکیب کی چُستی اور جذبات کا اچھوتا پن ہی ادب کی جان اور شاعری کی روح ہے۔

غزل کا ایک شعر تو یہ ہے:۔

آئے گا نہ تو رات کو، کب مجھکو یقین تھا   شاید کہ ترا وعدۂ وصل اور کہیں تھا

اور ایک شعر یہ ہے:۔

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا   آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا

دونوں شعر، شعر ہیں۔ اور دو غزلوں میں موجود۔ پھر کیا سبب ہے کہ ہم مذاقِ عامّہ کی پرورش دلنوازی کرتے ہوئے پہلے شعر کو صرف اس لئے غزل کی تعریف میں داخل کرلیں کہ اس میں ایک پست، رکیک، اور غیرت و حمیت سوز خیال آسان الفاظ میں نظم ہوا ہے۔ اور دوسرے شعر کو محض اس لئے کہ اُس میں خیال کے ساتھ الفاظ بھی متین اور گوارا ہیں، تغزل کی حدود سے نکال دیں؟

"پریشانیٔ خاطر"۔ "قریں" اور "دلِ غمدیدہ" فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں سہی، لیکن کیا یہ الفاظ اُردو زبان میں مروّج اور مستعمل نہیں ہیں؟ اگر ہیں، تو ہم انھیں اُردو شاعری سے یعنی ادبِ اُردو سے کسطرح خارج کر سکتے ہیں؟۔ غرابت البتہ ایک عیب اور قابلِ ترک چیز ہے۔ لیکن سہل الاستعمال اور مروّج الفاظ فارسی ہوں یا عربی، جو ہماری زبان میں رس بس گئے ہیں کسی نوعیت سے بھی ترک نہیں کئے جا سکتے۔

جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو، جہلا اور عوام کی زبان سے تمیز نہ کر دیں ہمیں کوئی تفوق اور ادبی امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہر زبان کا علمی اور ادبی حصّہ، عوام کی زبان سے فائق ہوتا ہے جب ہماری شاعری رفعتوں کی حامل ہو گی تو ہمارے ہم آہنگ و ہمنوا بھی مجبور ہو جائیں گے کہ وہ ہمارے

معیار تک پہونچنے کی کوشش کریں۔۔۔ جو لوگ کم مائگی و کم سوادی سے ہمارے معیار تک پروا ز نہ کرسکیں گے اُنھیں فطرت خود آگاہ کردے گی کہ وہ "شاعر" نہیں۔ اور اُنھیں اس میدانِ وسیع میں اپنی تگ و تاز ختم کردینی چاہئے۔

نواں خطبہ

غزل

محررہ دسمبر ۱۹۳۵ عیسوی

غزل کی صنفی خصوصیت | غزل کو عوام اس عنوان سے جانتے ہیں کہ جب یہ نام اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو خیال میں اشعار کا ایک مجموعہ آجاتا ہے لغوی حیثیت سے غزل کے معنی عورتوں سے گفتگو کرنا۔ یا عورتوں کا ذکر کرنا اور حدیث شراب و شباب بیان کرنا ہیں۔ جس شخص نے سب سے پہلے اس چیز کا نام غزل رکھا اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ عورتوں سے جو گفتگو نثر میں نہیں کی جاسکتی وہ نظم میں کی جائے۔ لیکن بہت تھوڑے زمانے کے بعد ہی "غزل" کی یہ لغوی یا معنوی خصوصیت جاتی رہی۔ خود عرب میں جہاں یہ عنوان وضع کیا گیا تھا شاعری نے دو صورتیں اختیار کرلیں۔ ایک یہ کہ مرد اپنے جذباتِ محبت عورتوں کو مخاطب کرکے ظاہر کرنے لگا دوسری یہ کہ عورت اظہارِ جذبات کے وقت مرد کو مخاطب صحیح سمجھنے لگی۔

عرب کی عورتیں بھی شاعری کے ذوق سے آشنا تھیں۔ اس لئے شاعر مردوں اور شاعرہ عورتوں نے ان دونوں خصوصیات کو نباہا۔ دونوں قسم کی شاعری عرب میں مروج رہی اور دونوں قسم کے اشعار کو "غزل" کا نام دیا گیا۔

عرب کے بعد عجم میں | یہی شاعری عربی عروض اور علمِ کلام کے ساتھ جب عجم کے بعض مشہور

شہروں میں پہنچی تو وہاں اُس کا رنگ متصوفانہ ہوگیا۔ مگر اسرارِ تصوف کی ترجمانی بھی اسی عنوان سے ہوئی فارس بیت المذاہب تھا اس لئے تصوف اور خداشناسی۔ حقیقت اور پارسائی کے جذبات عوام میں جذب ہو چکے تھے۔ شاعری ہر دور میں مذاقِ عامہ سے وابستہ رہی ہے۔ فارسی شعرا نے اسی مذاق کو ملحوظ ذہن رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا دامن مذہبیات، اخلاقیات اور الٰہیات سے بھر دیا۔

ہندوستان اردو شاعری سے پہلے ہندوستان میں جب تک اردو شاعری مروّج نہ تھی سنسکرت اور بھاشا میں جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اور یہاں وہ ہی ایک صنفی خصوصیت شاعری کا نصب العین تھی۔ جسے عرب کے واضعانِ غزل نے قائم کیا تھا یعنی عورت متکلم اور مرد مخاطب صحیح تھا۔ ہندی شاعری میں غزل گوئی کا رواج نہ تھا۔ بلکہ منفرد اشعار میں جو "دوہے" کہلاتے تھے۔ مختلف جذبات و کیفیات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

غزل ہندوستان میں ایران و افغانستان کے شعرا عہدِ سلاطینِ مغلیہ میں یا اس سے پہلے ہندوستان آئے تو "غزل" بھی اُن کے ساتھ آئی۔ ہندوستانی شاعر ہندی شاعری کے اسلوب سے واقف تھا۔ اس لئے غزل کے وضعی و اساسی مقصد کو اول اول خوب سمجھا۔ یعنی اس نے "غزل" کے عنوان سے صرف صنفِ نازک کو مخاطب کیا اور غزل کو صرف انھیں، موضوعات تک محدود رکھا۔ جن کا تعلق عورت اور صرف عورت سے تھا۔ سلاطین قطب شاہیہ میں سلطان محمد قلی صفِ اوّل کا شاعر تھا۔ اُس کا یہ شعر اس بیان کا پورا ثبوت ہے :- ؎

عشق کی پتلی ہے گوری رنگیلی   چتر ناریاں میں مستی ہے چھبیلی

خلطِ مبحث لیکن مطالعۂ تاریخ سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ صنفی خصوصیت عنوانِ "غزل" کے ساتھ بہت عرصہ تک باقی نہ رہی۔ اردو میں شعر کہنے والے مجبور تھے کہ فارسی شعرا کی غزلیں سنیں اور ویسے ہی جذبات کا اظہار اپنی غزلوں میں بھی کریں۔ فارسی زبان میں ضمائر کی وحدت اور تذکیر و تانیث کے فقدان نے ذہن کو ایک نئی صنف کی طرف رجوع کر دیا ۔۔ اور رفتہ رفتہ دستِ حنائی، گیسوئے دراز، دوپٹہ، لمبے پائینچے، لبِ گل رنگ اور وہ تمام باتیں جو عورتوں کے جسم و لباس سے مخصوص

تھیں۔ مردانہ خصوصیات میں بدل گئیں۔ اور انکی جگہ کاکل، بند قبا، اور خط رخسار نے لے لی۔ یہاں تک کہ آگے چل کر خواجہ آتش لکھنوی نے تو صاف صاف کہدیا۔ رعنا:۔

مد دائے سخت جانی کر کہ قاتل ہے مراد کا

اس دور میں "غزل" کے لغوی معنی بدل کر "لڑکوں سے اظہارِ محبت" ہو گئے۔ اس کے بعد ہر دور میں غلط جذبات کی ترجمانی ہوتی رہی۔ یعنی غزل کے کسی شعر سے یہ ثابت ہوتا رہا کہ شاعر کا محبوب صنفِ نازک سے ہے اور کسی شعر سے یہ واضح ہوتا رہا کہ ملیح شاعر کوئی طفل کمسن ہے۔

اس غلط بحث کا سبب ایک نہیں دو ہیں۔ مغل سلاطین کی خواتین قریب قریب سب شاعرہ اور صاحبِ علم و کمال تھیں۔ اردو شعرا دربار رس تھے۔ جب وہ شعر پڑھتے تھے اور موضوعِ شعر نسائیت سے متعلق ہوتا تھا تو اکثر امرا خواتین شاہی کو مشارُ الیہ سمجھ کر اس قسم کی شاعری کو ادب و احترام کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسرا سبب یہ کہ عہدِ سلاطین مغلیہ میں "مغبچوں" کو کافی باریابی و قبولیت حاصل تھی۔ جو اپنے حسین کاندھوں پر سیاہ گیسو ڈالے ہوئے نشیلی اور سرمہ آلود آنکھوں میں مستیاں بھرے ہوئے، اور رنگ رنگ ہونٹوں میں تبسم جھلکائے ہوئے بادشاہ اور امراکو شراب پلانے پر مامور تھے۔ درباری شعرا انکی زاہد فریب اور زہد شکن اداؤں کی تعریف کر کے بادشاہ کو خوش کرتے تھے۔ شراب و کباب۔ رندی و مستی، شیخ و واعظ۔ اسی راستے سے بزمِ شعر میں داخل ہوئے۔ شراب کی شان میں اس قدر آزادی کے ساتھ قصیدہ خوانی ہوئی کہ شاعری شراب نوشی کا فتویٰ بن گئی۔ اور شیخ و واعظ پر طعن و تشنیع کی ایسی بوچھار ہوئی کہ بے چاروں کو اپنی وضع کا تحفظ مشکل ہو گیا۔ اس بیجائیت کی اولیت کا سہرا بھی فارسی شاعری ہی کے سر ہے۔ اردو شاعری پر اگر کوئی جرم عائد ہوتا ہے تو وہ صرف جرمِ تقلید ہے۔

اقدامِ اصلاح فارسی اور اردو شاعری کا یہ اسلوب مدتوں یوں ہی جاری رہا۔ آخر سالہا سال کے بعد میر نے اس بے راہ روی کی ایک حد تک روک تھام کی۔ اور غزل میں

لہ سفرنامہ ڈاکٹر ولیم گوچ مطبوعہ لندن

سوز وگداز کا نیا رنگ بھر کر متانت و سنجیدگی اور قبولیت و اثر کا اضافہ کیا۔ میر سوز اور خواجہ درد نے بھی فضا کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب آتش و ناسخ کا زمانہ آیا تو شاعری پھر خرافات کا مجموعہ بن گئی۔

حکومت کا اثر غزل پر دہلی اور آگرہ شاہانِ مغلیہ کے دار السلطنت تھے۔ علما اور فضلا کی نگاہِ حقیقت شناس نے اس وبا کی سمیت کا احساس کر لیا تھا۔ اس کی مدافعت کیلئے مذہبی اور اخلاقی قوتیں حرکت میں آچکی تھیں۔ لیکن ملک میں یکایک طوائف الملوکی پھیل جانے سے امکانِ مدافعت کمزور ہو گیا۔ لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ، نواب سعادت علی خاں اور خصوصاً نواب واجد علی شاہ کی رنگ رلیاں ناقابلِ انسداد تھیں۔ مصحفی اور جرأت نے میر کا تتبع کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

اب عام طور پر غزل میں متصوفانہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ اور سوقیانہ بھی۔ نوابی دربار دل کی عیش پسندی ثقاہت و تصوف کی خشکی کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ انشا نے تغزل کے پردے میں نسائیت کی وہ عریانیاں دکھائیں کہ زاہدانِ گوشہ نشیں اچھل اچھل پڑے۔ ان کے بعد امانت نے شاعری کی سبھا پر استادی کا سکہ جما کر شعر کو خیال سے عمل میں منتقل کر دیا۔ اور اندر سبھا لکھ کر داد دے، ٹھمریاں لاؤنی اور غزل کو اندر کے اکھاڑے کی تصویر بنا دیا۔

ثقہ اور سنجیدہ شعرا سے یہ دور خالی نہ تھا۔ سودا۔ خواجہ وزیر۔ صبا۔ رشک۔ بحر۔ لکھنؤ میں، مومن۔ آزردہ۔ خواجہ نصیر وغیرہ دہلی میں "غزل" کے بادشاہ مانے جاتے تھے۔ لیکن مزاجِ حکومت میں جو رنگ مستقل اور مستحکم ہو چکا تھا اُسے کوئی مٹا نہ سکا۔

دورِ غالب (اکبر آبادی) اب وہ زمانہ آیا کہ شاہ عالم اور محمد شاہ کی رنگ رلیاں ختم ہو چکی تھیں تاجدارِ لکھنؤ واجد علی شاہ کے حریمِ عشرت و جمال میں افسردگی و افسردگی پیدا ہو چکی تھی سلطنتِ مغلیہ کی اجڑی ہوئی محفل کا آخری چراغ دہلی میں ٹمٹما رہا تھا۔ ایوانِ ظفر بہارِ دوش کی ایک بے رنگ تصویر تھا۔ آثارِ زوال در و دیوار سے نمایاں تھے۔ تاہم قلعۂ معلیٰ میں عہدِ ماضی کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔ امارت باقی نہ تھی۔ لیکن رگ و پے میں امارت کا نشہ باقی تھا۔ شہنشاہی کی شہنائی کی آواز بیٹھ چکی تھی

لیکن نغمۂ زندگی کبھی کبھی سازِ شکستہ کو متحرک کر دیتا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ذوقؔ استاذ السلطان تھے۔ ظفرؔ کے لئے جو کچھ کہتے تھے اس میں رنگِ تغزل اور تفریحی معیار کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی فضا کی المناکی سے مفر نہ تھا۔ اور وہ اس غزل میں بھی جھلک جاتی تھی۔ جو بادشاہ کے لئے بڑی احتیاط و اہتمام کے ساتھ کہی جاتی تھی۔

مرزا غالبؔ نے اس انقلاب پر بطورِ خاص غور کیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ سامانِ غزل غزالانِ حرمِ شاہی کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب غزل میں چھیڑ چھاڑ۔ معاملہ بندی، بوس و کنار۔ اور "ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن" لکھنے کا وقت گیا، اتنی اور نشاطی رنگ کی گنجائش نہیں صبح قریب طلوع ہے محفل قریب الختم ہے۔ پروانوں کی خاک، شمع کی اداسی، سامانِ نشاط کی برہمی، فضا کی گرفتگی، احول کی المناکی یاس و قنوط کی فراوانی صاف کہہ رہی ہے کہ اب عالمِ خیال میں کامرانی کے دوپٹے سجانے، اور بال بال میں موتی پرونے کے دن نہیں ہے۔ حال مستقبل کا آئینہ بنا ہوا ہے۔ اور مستقبل حدیثِ حزن و ملال اور حکایتِ تاراجی و بربادی کا سد لب کر رہا ہے۔ اس لئے لکھنؤ اور دہلی کے رنگِ غالب سے بچ کر مرزا غالبؔ اکبرآبادی نے ایک نیا اور متین و سنجیدہ راستہ غزل کیلئے اختیار کر لیا۔ جو گو ان کے زمانۂ حیات میں جستہ جستہ مقبول ہوا۔ لیکن ان کے بعد جو زمانہ آیا اس میں کافی قبولیت و شہرت اور تائید و تقلید کے قابل سمجھا گیا۔ اب غزل کا رنگ یہ تھا:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں؟　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

مرزا داغؔ اور امیرؔ جلال کا زمانہ

فصیح الملک مرزا داغؔ دہلوی مرحوم بھی قلعۂ معلیٰ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ اور بادشاہ ظفرؔ کے منہ لگے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ مرزا غالبؔ کی تقلید غزل میں نہ کر سکے۔ لیکن اتنا اثر ان پر بھی پڑا۔ کہ رفتہ رفتہ معاملہ بندی اور واقعات نگاری میں زبان و محاورات کے ساتھ معتدل سنجیدگی اختیار کر لی:۔ ؎

تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر　　لے جنوں ہم پاؤں پھیلاتے ہیں چادر دیکھ کر

اب کیوں نہ کریں نالہ ہمیں ڈر تو نہیں ہے — یہ عرصۂ محشر ہے ترا گھر تو نہیں ہے
کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدے — پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے

منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی، حکیم ضامن علی جلال، منشی امیر اللہ تسلیم بھی مرزا داغ ہی کے زمانے اور ماحول میں نشو نما پائے تھے۔ ان میں سے بعض نے اساتذۂ دہلی و لکھنو کا رنگ سمو کر غزل کیلئے ایک نیا رنگ بنانا چاہا۔

"مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں"

مگر وہ مقبول نہ ہو سکا۔ جلال نے غزل میں میر کا سوز، مرزا غالب کی شوکت اور مرزا داغ کی زبان کا اہتمام کیا۔ مگر خیالات جدید اور بلند نہ مل سکے اس لیئے وہ بھی تغزل میں کوئی نئی زندگی پیدا نہ کر سکے۔ آج اگر ان کا نام زندہ اور باقی ہے تو صرف علمی و ادبی تحقیق و تصنیف کی وجہ سے ہے۔

مرزا داغ نے دیکھا کہ غالب و مومن کے بعد شوکتِ الفاظ اور فارسی تراکیب کی داد دینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ صاف اور شستہ غزلیں زیادہ قبولِ عام حاصل کرتی ہیں۔ اور رامپور سے دکن تک دہلی کی فصاحت و زبان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے تو وہ محاورے اور روزمرہ لکھنے میں اور زیادہ مستعد ہو گئے۔ ادھر دربارِ رامپور نے ان کی قدر افزائی کی، پھر نظامِ دکن نے نواز لیا، تلامذہ کی تعداد بڑھنے لگی اور روزمرہ لکھنے کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ مرزا داغ کی عام فہم غزلیں گا کر اہلِ محفل کو دعوتِ وجد دینے لگے۔ دہلی کی زبان کا یہ عروج اور طنطنہ دیکھا تو امیر و جلال بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اب غزل کا رنگ خالص اردو، بول چال اور روزمرہ تک محدود ہو گیا۔ مگر وہ رکاکت و ابتذال جو اب سے بہت پہلے جزوِ غزل ہو گیا تھا۔ باقی نہ رہا۔

(داغ دہلوی)

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم — دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم
لپٹے ہوئے ہیں کسی زلفِ مشکبار سے ہم — داغ کیوں نہ کریں نکہتِ بہار سے ہم
یہ نازِ عشق ہے کہتے ہیں افتخار سے ہم — جو تم ہزار سے اچھے تو سو ہزار سے ہم

(امیر مینائی)

پٹے میں بھی منہ موت دکھاتی نہیں مجھ کو	کافور سے بوئے کفن آتی نہیں مجھ کو

(جلال لکھنوی)

نہ چلا کے رو قبر پہ رونے والے	بدلنے لگے کروٹیں سونے والے

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۸۹۶ء تک اس رنگ میں ہندوستان کی شاعری تمام تر رنگین رہی۔ مرزا داغ کے شاگردوں میں احسن مارہروی، نسیم بھرتپوری، نوح ناروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، آغا شاعر دہلوی امیر مینائی کے شاگردوں میں، ریاض خیرآبادی، جلیل مانکپوری، مضطر خیرآبادی اور جلیل لکھنوی، اور حکیم جلال کے شاگردوں میں آرزو لکھنوی وغیرہ شعرا نے اس رنگ میں غزل کا ایک خاص معیار قائم کر لیا۔

اب غزل گوئی میں کسی دربار یا حکومت کی پسند اور نوازش کا سوال باقی نہیں رہا تھا۔ مرزا داغ دکن میں استاذ السلطان تھے۔ اور دکن کے سوا ہندوستان میں کوئی دوسری عظیم شخصیت یا مرکزیت ایسی موجود نہ تھی جس سے معیارِ غزل گوئی کے متعلق استمزاج کیا جاتا۔

حالی و آزاد کا اثر غزل پر

لیکن پانی پت سے مولانا حالی اور دہلی سے مولانا آزاد اس رنگ کے خلاف علم بغاوت لیکر اٹھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ رنگِ تغزل قوم و ملک کی ذہنی و اخلاقی تخریب کا باعث ہے۔ گو اس سے پہلے وہ خود بھی اسی رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مگر جب دونوں نے لاہور کو اپنی ادبی مساعی کا جولانگاہ بنا لیا۔ تو کوشش کی کہ غزل کے لئے کوئی نئی داغ بیل ڈالی جائے۔ مشاعروں میں مصرع طرح دینے کا رواج اٹھا دیا۔ اور غزل میں قومی و ملکی حالات کی ترجمانی کرنے لگے۔

مگر غزل میں معاملہ بندی، واقعات نگاری اور حسن و عشق کا رنگ اس قدر مستحکم ہو چکا تھا کہ تجدید کا موقع ہی نہ تھا۔ مجبوراً مسدس اور مثنوی کو قومی تعمیر کا ذریعہ بنایا گیا۔ تاہم عوام کی طبیعتیں "غزل" سننے کی طرف زیادہ مائل رہیں۔ اس لئے تغزل کا جو رنگ ایک اسلوب اختیار کر چکا تھا۔ وہ نہ بدل سکا۔

غزل کا ارتقا

۱۹۱۵ء عیسوی سے غزل اور تغزل میں خود بخود ایک تغیر پیدا ہونے لگا اس کا

سبب تھا کہ یکایک اعلیٰ التعلیم یافتہ طبقوں میں شعرگوئی کا رجحان پیدا ہوا یہ وہ طبقہ تھا جسنے مغربی شاعری کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کیا تھا۔ اور جس کے ذہن میں میرؔ و غالبؔ اور مومنؔ کے سیر حاصل مطالعے سے ایک حد تک اعتدال بھی پیدا ہو چکا تھا۔ جب غزل اس طبقے کے دماغ و ذہن کی گرفت میں آئی تو اس نے غالبؔ اور داغؔ کا رنگ ملا کر جدید رنگ اختیار کر لیا۔ اس طبقے میں ڈاکٹر سر اقبالؔ، فانیؔ بدایونی، حسرتؔ موہانی، عزیزؔ لکھنوی، اور حشرؔ کاشمیری، وغیرہ چند لکھے پڑھے ہوشمند شاعر تھے۔ جن کی صلائے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول و مسموع ہوئی۔ ادھر کثرتِ تعلیم نے عام طبائع کو زیادہ مستعد اور سنجیدہ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر میرؔ و غالبؔ کی سوز آہنگی کے سامنے داغؔ و امیرؔ کی معاملہ بندی پھیکی نظر آنے لگی۔ اور وہ اقبالؔ جس کا رنگ تغزل کبھی یہ تھا:۔ ؎

نہ آتے ہمیں اسمیں تکرار کیا تھی
گر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اسمیں بندے کی سرکار کیا تھی؟

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی!

اب اس رنگ میں غزل خواں تھا:۔ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

فانیؔ بدایونی:۔ ؎

ذرہ ذرہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے
اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے

پھیرلے میت کی جانب سے نگاہِ التفات
سیکڑوں شکووں کے زنغے میں لبِ خاموش ہے

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر
شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے

رازِ آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا
جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے

حسرت موہانی :- ؎

دل اور ہمتِ ترکِ خیالِ یار کرے | کسے یقین ہو۔کون اس پہ اعتبار کرے
قرارِ جاں کے لئے اس نے شیوۂ تسکین | کبھی جو اور کیا ہو تو اختیار کرے
شبِ وصال ہے کوتاہ۔نازِ یار دراز | ہجومِ شوق سے کہدو کہ اختصار کرے
گذر چکی ہے تمنا کی حد سے دشواری | کہاں تک اور کوئی تیرا انتظار کرے

عزیز لکھنوی :- ؎

بنا دیا نہ زمانے کو داستاں جب تک | ملی نہ عشق کو فرصت فسانہ سازی سے
بتا دے لے مجھے محفل میں چھیڑنے والے | ہے بہتر اور کوئی ساز دلنوازی سے؟
یہ وقت کونسا آیا ہے اے خدا مجھ پر | کہ چارہ ساز لرزتے ہیں چارہ سازی سے

دراصل یہی وہ صحیح رنگِ تغزل تھا۔جس کی اس دور میں ضرورت تھی۔مگر ابھی لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے چٹخارے لینے والے، روزمرہ پر مرمٹنے والے، معاملاتِ وصل و ہجر پر سر دُھننے والے ہندوستان میں موجود تھے۔ اس لئے اگر سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ رنگِ جدید مطبوع ہوا تو عوام میں وہی رنگ پسند کیا جاتا رہا۔جو انشاؔ اور امانتؔ سے مذاقِ عامہ کو وراثتاً ودیعت ہوا تھا :- ؎

کسی کا ہائے شبِ وصل اس طرح آنا | کڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اُٹھائے ہوئے

باایں ہمہ لکھنؤ کے اکثر ثقہ شعرا نے متانتِ خیال کو اب بھی ہاتھ سے نہ دیا۔

ایک مترنم انقلاب

یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ملک کا مذاق کسی ایک معیار پر آکر ٹھہر جاتا۔ لہٰذا ایک انقلاب اور پیدا ہوا۔ یعنی غزل خوانی کے ساتھ ترنم کا رواج بھی ہو گیا۔ غزل خواہ کتنی ہی ناکام ہو۔لیکن اگر غزل خواں خوش الحان ہے تو اس کی غزل پر مشاعرے میں قیامت برپا ہو جانا یقینی سمجھئے۔اب عوام غزل کے مضامین اور معیار کو نہیں دیکھتے بلکہ آواز کے آتار چڑھاؤ پر اُن کے کان لگے رہتے ہیں۔یوں تو ڈاکٹر اقبالؔ، سائلؔ دہلوی، اور مضطرؔ خیرآبادی مترنم غزل پڑھنے میں اب سے بہت پہلے میدان مار چکے تھے مگر موجودہ زمانے میں آواز کے ساتھ کسی اور چیز کا بھی مطالبہ ہے جس کے پورا کرنے

کے لئے کافی کاوش و کاہش کی ضرورت ہے۔ تاہم اب یہ حال ہے کہ ہر خوش الحان غزل گو خواہ وہ کتنا ہی تبدی کیوں نہ ہو "جانِ شاعرہ" سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب غزل عام فہم اور عامیانہ خیالات کا مجموعہ ہو تو غزل گوئی سے کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے

جو نوجوان شعرا نہایت متین غزل کہتے تھے۔ اب ترنم کی ترویج و تشویق نے انھیں بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ اتنی آسان زبان اور مذاقِ عوام سے ہموار و ہم سطح غزل کہیں کہ ایک جاہل بھی اس کے سمجھنے سے محروم نہ رہے۔ مثلاً جگر مرادآبادی کا رنگِ تغزل تعلیمی و ادبی ماحول کے اثر سے کبھی یہ تھا۔ ؎

منزلِ غم میں کہاں وقفۂ راحت مجھ کو　　ہر نفس تازہ ہے دریشِ قیامت مجھ کو
گر پڑی روح تعین کدۂ ہستی میں　　کاش ہوتا ہی نہ احساسِ محبت مجھ کو

نغمہ ہوں، نالہ ہوں، کیفِ شوق ہوں، فریاد ہوں　　مختصر یہ ہے کہ اک مجموعۂ اضداد ہوں
عشقِ بے پرواہ کا فی حقیقت ہو مری　　کچھ سمجھ کر میں ہلاکِ حسنِ بے بنیاد ہوں
اہلِ فرزانگی ہے اب مرا ذوقِ جنوں　　آجکل میں محوِ تعمیرِ خراب آباد ہوں

مگر وہ کیفِ ترنم اور دادِ عوام سے سرخوش ہو کر اب یوں کہنے لگے ہیں:۔

نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا　　نظر بچی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا

بہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ ان خوش نوایانِ وطن کو کون سمجھائے کہ یہاں شعر کی حقیقی داد "مشاعرے" میں نہیں "مطالعے" میں (یعنی کا غذ پر) ملتی ہے۔

فانیؔ اور انکے معاصرین مگر فانیؔ، عزیزؔ، حسرتؔ، اور اقبالؔ نے مذاقِ عامہ میں انقلاب مبتذل پیدا ہو جانے کے باوجود اپنے رنگ کو سنبھالے رکھا۔ فانیؔ جہاں اپنے رنگِ خاص سے الگ ہو کر عام رنگ کی طرف مائل ہوئے وہاں اُن کا بحیثیت شاعر کوئی درجہ نہیں رہا مثلاً

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے　　مفت ملے تو مول نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

لیکن رنگِ محفل معلوم کرنے کے بعد وہ فوراً چونکے اور پھر وہیں آ گئے جہاں اُن کا حقیقی مقام تھا۔ ؎

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں | آج اے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں
ظرفِ دیوانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں | لاؤ ہر ذرّے میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

جوان شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی کو میں بہت مستقل مزاج دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہ حاضر جوشؔ کے کلام اور رنگ تغزل کو ہنوز مسلّمات کا درجہ دے یا نہ دے مگر اُن کا رنگِ تغزل بھی وہی ہے جسکی اس وقت ضرورت ہے۔

سمجھے گا اس کا درد کون شورشِ کائنات میں | تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں
سانس میں بوئے بادہ ہے سجدے ہیں پائے حسن پر | اب بھی دماغِ زہد کو شک ہے مری نجات میں

غزل کے قدیم موضوعات

غزل کا قدیم پیرایہ لاتعداد موضوعات و جذبات کا حامل رہا ہے۔ مثلاً شوق۔ نامہ و پیام، تمنائے ملاقات، ملاقات، اقربا کا خوف، اخفائے راز کی کوشش، اغیار کا خیال، رشک، رقابت، بہتان، شکوۂ فلک، شکایتِ تقدیر، وصل، ہجر، موافقت ناموافقت، منتِ پاسباں، نباہ، خفگی، جنگِ محبت، محبوب کی بے اعتنائی، استغنا، وفا، جفا، جوابِ صاف نامہ بر پر خفگی، پارسائی، ترکِ عشق، انتقام، شرم، حجاب، بے توجہی، منت خوشامد، سخت کلامی، رنج، نااُمیدی، شب بیداری، اختر شماری، بیقراری، اضطراب، انتظار، دردِ فراق، شوقِ وصال، بدگمانی، نازو انداز، عشوہ و ادا، دشت پیمائی، آوارگی، دیوانگی، چاکِ گریبانی، نالہ و آہ، شکوہ و فریاد، وحشت، تنہا پسندی، گوشہ نشینی سیرِ باغ، شبِ ماہ، ہم آغوشی، بے تکلفی، بوس و کنار، چھیڑ چھاڑ، ہاتھا پائی، شراب و کباب، جوشِ شباب صحبتِ احباب، جلسے، محفل آرائی، مستی، راگ رنگ، بربط و چنگ، دنیا و مافیہا سے بے خبری، سامانِ تعیش محتسب کا اندیشہ، واعظ سے نفرت، شیخ و زاہد سے لغاوت۔

موسمِ بہار، سبزہ زار، بارش، بوچھار، بجلی، قوس و قزح، جھولا، کالی گھٹا، بھیگی ہوئی رات، کوئل کی کوکو، پپیہے کی پی کہاں، بلبلوں کا ہجوم، قمریوں کا شور، صبا کی روانی، ہوا کی بادہ چکانی، نہر کی لبریزی دریا کی موج خیزی، فوارے کی گوہر افشانی، پرندوں کا ہجوم، ملہار کی دھوم، مرغانِ چمن کی نوا سنجی، نسیم کی مست خرامی، سرو کی قطار بندی، چنار کی بلندی، خوشبو کا انتشار، پھولوں کا مہکنا، شاخوں کا لچکنا، سبزے کی لہک، چنبیلی کی مہک، بلبل کا برزخ، نشیمن، آشیاں، قفس، خوفِ صیاد، شکایتِ گلچیں،

خزاں۔ پتوں کی زردی۔ ہوا کی پرفشانی، رفتاری، بلبل کی اسیری، پھولوں کی پژمردگی، تنہائی کا سناٹا، شاخوں کی برہنگی، سبزے کی پامالی، سردی کا جوش، ژالہ باری۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ، قیس و لیلےٰ، شیریں فرہاد، طور و کلیم، یوسف زلیخا، رندانہ خیالات۔

ماضی و مستقبل فراموشی، سیر و شکار۔

طفلی۔ جوانی۔ پیری، دنیا کی بے ثباتی، دوست کی بے وفائی، دوست کی کمیابی، موت کا خیال، مرض، علاج، موت، فشارِ قبر، گور و کفن، گورِ غریباں، اندیشۂ حشر، زیارت و فاتحہ، قبر کی شکستگی، پرسشِ اعمال کی فکر، اقربا کی جدائی، سوگ۔ عزاداری، گناہوں پر ندامت، معاصی پر خجالت، توبہ، شکست توبہ، گناہ پر اصرار، یادِ الٰہی، روزہ، نماز، دیر، حرم، کلیسا، جنت و دوزخ، کوثر، سلسبیل،

خوشی، غم، حسرت۔ تمنا۔ ندامت، شکر و شکایت۔ عبرت۔ صبر و رضا۔ توکل۔ رغبت، نفرت رحم، انصاف، تعجب، غصہ۔ امید۔ یاس۔ ذوق و شوق۔ حب وطن، ہمدردی، دین و مذہب کی ترجمانی وغیرہ وغیرہ۔

یہی وہ موضوعات ہیں جو تین صدیوں سے غزل میں کھپائے جارہے ہیں۔ طرح اور زمین کا اختلاف صرف اتنا ہی فرق پیدا کرسکتا ہے جیسے ایک بہروپیا نئے روپ بھر کر آئے۔ یا جیسے شکر کے کھلونوں کا سانچہ مختلف شکلوں میں بدل دیا جائے۔ مگر مادّہ اور مزہ نہیں بدل سکتا۔

غزل کا جدید رنگ مشکل یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں مقلدین کی تکثیر تو برابر ہوتی رہی لیکن جہانِ شعر میں کوئی مجتہد پیدا نہ ہوا۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ کسی کو اپنی برہنگی نظر نہ آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت و فرسودگی کے ساتھ عمومیت نے غزل میں جگہ پالی۔ اور ہر موضوع جس کا زندگی سے ذرا سا بھی تعلق تھا، غزل کے ساز میں نغمہ بن کر گونجنے لگا۔ مرزا غالب اور مومن نے جدید موضوعات کی طرف قدم بڑھایا۔ تو وہ اہلِ فارس کے ماحول میں پہونچ گئے۔ مطلق اردو داں طبقہ انکی بلندیٔ تخیل اور ندرتِ فکر کو سمجھ نہ سکا۔ اور ان پر مہمل گوئی کا فتویٰ صادر کر دیا۔

آخر دورِ حاضرہ نے اعتدال و متانت کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر کے ایک نیا راستہ دریافت کر ہی لیا۔

جن موضوعات قدیم کا تعلق شاعری یا غزل سے نفسیاتی تھا۔ انھیں قطعاً نظر انداز کر دینا تو ایک مافوق الفطرت جسارت تھی۔ لیکن جہاں تک تجزیہ و ریجانات کا سوال ہے۔ رنگِ قدیم اور کہنہ تغزل میں اب بہت کچھ ترمیم ہو گئی ہے۔ اب موضوعات غزل میں فلسفہ حسن و عشق، عرفان و حقیقت شناسی، اسرار کشائی، درس و پیغام، واردات و جذبات، اور محاکات کے علاوہ دوسرے موضوعات کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں یہ دور بہت کامیاب دور ہے۔ اور یہ رنگ بہت کامیاب رنگ ہے۔ اور اسی اسلوب و رنگ کا اگرہ اسکول مبلغ و ناشر ہے۔

غزل اور واردات و جذبات

صحیح تغزل کی روح واردات و جذبات ہیں۔ جو کیفیت حقیقتاً ہم پر طاری ہو۔ اور جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصلی موضوع ہیں۔ یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے۔ اور ایک دولت مند فارغ الافکار شاعر بھی ایک گدائے کاسہ لیس کی طرح فقر و فاقہ کے مضامین لکھ کر لوگوں کو اپنی تضحیک کا موقع دے۔ اس قسم کی شاعری یا غزل گوئی "نقالی" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کردے تو سمجھئے کہ نقل بھی ہیں بھی نقص ہے۔

تاثیر صرف اُسی شعر میں پیدا ہو سکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اُس کی کیفیاتِ حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل اور دماغ پر محسوس نہ کرے۔ اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرز پُر اثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا زبان نہ ملّایانہ، نہ بازاری، روزمرّہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے۔ نہ زبان اُلجھے۔ نیز تقلیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہئے مختصر یہ کہ ہمارے ہونٹوں سے وہی صدا نکلے جو ہمارے دل سے اُٹھی ہو اور ہم ایک ایسا گنبد بنکر نہ رہ جائیں جسمیں صرف دوسروں کی آواز گونج سکتی ہے۔ اگر ہماری آواز دل سے نکلی ہوئی نہیں ہے۔ تو کم از کم دل سے نکلی ہوئی معلوم تو ہونی چاہئے۔

ایک ضروری مشورہ

جن لوگوں کو شاعر بن کر جینا اور شاعر بن کر مرنا ہے وہ ان معدودِ متعارفہ سے تجاوز کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں اُن برخورداران وطن کا ذکر نہیں جو محض نام و نمود اور وقتی تفریح و نشاط کے لئے رسماً غزل کہہ لیتے ہیں۔ اور جن کی مثال اس ناکام گڑیاں بیچنے والے کی سی ہے جو اپنی جلیبیں اور کامیاب گڑی والی کی اس دلکش صدا کے بعد "مجنوں کی پسلیاں ہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں کیا خوب گڑیاں ہیں" یہ کہہ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی کہ "میری بھی ایسی ہی ہیں"۔

اس بڑھتی ہوئی دبا اور چڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے اخلاقی جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ کام کوئی انجمن یا سوسائٹی انجام نہیں دے سکتی بلکہ تمام والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کا فطری رجحان اور ذہنی میلان معلوم کریں اور جب انہیں یقین ہو جائے کہ صاحبزادے "شاعری" کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں تو حکماً روک دیں۔ اور قدغن کر دیں کہ وہ کسی ضرورت کے ماتحت بھی شعر نہ کہیں۔

یہ ایک مسلمہ ہے کہ جس قوم کے زوال کا عہد قریب آتا ہے۔ اس قوم میں شاعر بکثرت پیدا ہو جاتے ہیں آج یورپ میں دو چار سے زیادہ شاعر نہیں مل سکتے۔ اسی طرح ایران اور افغانستان میں بھی شعرا کی کثرت نہیں مگر ہندوستان میں ہر چار قدم پر ایک تک بند کا مل جانا بدیہیات سے ہے۔ اس محشر کو روک دینے کی کوئی تدبیر ضرور ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ بھیڑ چھٹ جائے۔ اور حقیقی و فطری شعرا کو بڑھنے اور کام کرنے کا یقینی موقع مل سکے۔

دسواں خطبہ
موجودہ اردو شاعری پر ایک تنقیدی نظر

آل انڈیا مشاعرہ کانپور

۲۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

شاعری کا معیار

اس سے پہلے کہ موجودہ اردو شاعری پر تنقید کی جائے۔ میری رائے میں شاعری کا ایک معیار مقرر کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر شاعری کا کوئی معیار مقرر نہ کیا جائے تو موجودہ عہد کی صد رنگ شاعری پر تنقید کرنا ایک ایسے وسیع باغ کا تجزیہ کرنا ہے جس میں مختلف اللون پھول اور کانٹے موجود ہوں۔

شاعری کا معیار قائم کرنے کے لئے ایک متحد نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ اردو شاعری آج ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر شہر میں رائج ہے؛ سمندر کے ساحلوں، اور میدان کے گوشوں پہ آباد ہونے والے مقامات بھی اردو شاعری سے نابلد نہیں ۔ کاٹھیاواڑ، گجرات، اور مدراس، جہاں گجراتی، مدراسی، مرہٹی، اور کاٹھیاواڑی زبانیں مادری ہیں۔ وہاں بھی میں نے اردو شاعری کا رواج دیکھا ہے۔ خاندیش ممالک متوسط اور برار میں اردو نہ تو تعلیمی زبان ہے نہ مادری، لیکن اردو شاعری سے دلچسپی لینے والے وہاں بھی موجود ہیں۔ ادھر سندھ، اور بلوچستان سے لے کر پنجاب اور سرحدی علاقوں تک اردو شاعری مروّج ہے، اُدھر دامنِ نیپال سے جیبِ بنگال تک اور اُس سے آگے برہما تک اردو شاعری

کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ دکن کا نام میں نے ارادتاً نہیں لیا۔ اس لئے کہ دکن میں تو دلی اور لکھنؤ کی طرح اردو کی پرورش ہوئی ہے۔ اور ہو رہی ہے۔ پھر وہاں اردو شاعری کے عروج و صعود کا کیا پوچھنا ہے!

دلی، یوپی، اور بہار کو لسانی اعتبار سے میں اردو شاعری کے جغرافئے میں ایک ہی صوبہ قرار دیتا ہوں بہار میں زبان کا لہجہ کسی قدر بدل جاتا ہے، لیکن یوپی کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو کا یہی حال ہے۔ پھر جب انھیں یوپی کی حدود سے خارج نہیں کیا جا سکتا تو میں بہار کو بھی اردو کے انھیں مشہور مراکز میں شریک سمجھتا ہوں۔ خصوصاً اس لئے کہ لسانی لہجے اور بعض صوبائی محاورے شاعری میں جائز نہیں۔ اور وہاں بھی شعر انھیں لسانی حدود میں کہا جاتا ہے۔ جن میں اردو شاعری محدود ہے۔

ادارہ ہائے شاعری اور اُنکی شاخیں

اردو شاعری اس وسعت کے ساتھ ہندوستان بھر میں آج صرف دو اسکولوں کی مقلد ہے۔ ایک اسکول مرزا داغ کا ہے اور دوسرا مرزا غالب کا آپ ہندوستان کے کسی صوبے میں تشریف لے جائیں اور وہاں کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں آپ کو یہی دو رنگ کارفرما نظر آئیں گے۔

مرکزی تقسیم کے اعتبار سے ان دونوں اسکولوں کے تتبع میں جو ادارۃ الافکار قائم ہیں انھیں مندرجہ ذیل تحتی نمبروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) دہلی اسکول
(۲) لکھنؤ اسکول
(۳) آگرہ اسکول

یوپی میں صرف یہی تین ادارے ہیں، جو اساتذۂ فنِ شعر کے مستقر ہیں۔ ان کے علاوہ ہر ادارہ یا تو ان کا تابع ہے یا مقلد۔ اساتذۂ دہلی اور ان کے مقلد، سادہ اور عام پسند زبان کی ترویج کے ہمیشہ معاون رہے ہیں۔ لکھنؤ اسکول نے پانچویں دور میں اپنا رنگ بدلنا چاہا اور غالب و مومن کی تقلید سے خیالات کے ساتھ الفاظ میں بھی شوکت پیدا کی۔ مگر مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا ستارہ عروج پر تھا۔ ان کے زمانے میں امیر مینائی اور جلال و تسلیم لکھنوی کو بھی مجبوراً دہلی کا رنگ اختیار

کرنا پڑا۔ لیکن لکھنؤ کی شاعری اپنے اس دور سے بہت زیادہ متاثر ہوئی جو دبیر و انیس سے شروع ہو کر مونس، اوج اور پیارے صاحب رشید وغیرہ پر ختم ہوتا ہے۔ انکی شاعری بھی اردو شاعری ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ حضرات صرف مسدس اور رباعی کو اپنا مظہر موضوع و خیال بنائے ہوئے تھے؛ اور غزل کی جگہ سلام کہتے تھے۔ ان کے اسلوب افکار نے لکھنؤ کی غزل گوئی کا رنگ بڑی حد تک بدل دیا۔ اور گو یہ دور اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ تاہم لکھنؤ کی شاعری میں یاس وقنوطا، سوز و درد، شور و بکا، سوگواری اور المناکی اسی دور کا ورثہ ہے۔ جس کا اثر لکھنؤ کی شاعری میں ہنوز باقی ہے۔

آگرہ اسکول

آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین خاموش ترقی کرتا رہا ہے۔ شعرائے متقدمین کو چھوڑ کر عہدِ متوسط کے شعرائے مرزا غالب مرحوم سے ان کی زندگی تک افادہ کیا۔ لیکن آخر آخر یہ خارجی اثر آگرے سے کم ہوتا گیا۔ اور طالبانِ فن کسی مقامی ماہرِ فن کے علاوہ دوسروں کے ممنونِ اصلاح نہیں ہوئے۔

وہ سرزمین جس کی خاکِ پاک سے میر و غالب کے سراپا شعر مجسمے بنے تھے ناممکن تھا کہ دورِ تعلیم واصلاح میں میر و غالب کی صدائے بازگشت سے نہ گونجتی۔ گونجی اور پوری قوت کے ساتھ گونجی ۱۹۱۲ء سے علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کا رنگِ تغزل یکایک ہندوستان میں چمک اٹھا۔ تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقوں میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہو گئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علمبردار ہوئے۔ یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدرِ معتدل پیدا ہوا تھا۔ "آگرہ اسکول" بھی آج اسی رنگ کا متبع و مؤید ہے۔ اور یہی وہ اسلوب و روش ہے جسے ہم اردو شاعری کے لئے بطورِ معیار پیش کر سکتے ہیں۔

عام اردو شاعری پر تنقید

اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جدید دورِ علم و فلسفہ میں اگر ہندوستان کی عام شاعری کو بہ نگاہِ تنقید دیکھا جائے تو یہی

بوسہ گیری، ہمکناری وہم آغوشی، عالم وصل و ہجر کی جھوٹی عکاسی، لب و رخسار کی ہیجان آفریں مصوری، وعدہ اور ایفائے وعدہ کی لاطائل داستانیں، قیس و لیلیٰ اور شیریں فرہاد کے افسانوں کی جگالی زاہد و شیخ پر دشنام طرازی، شراب و کباب کی علیٰ رؤس الاشہاد تبلیغ، اور رکیک و مبتذل جذبات کی ترجمانی حاصل فکر سمجھی جاتی ہے۔

تقلید یا قدامت پرستی اس دورِ جدید میں ہمیں کبھی ترقی کے اُن راستوں سے متعارف نہیں کر سکتی جو صحیح منزل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آداب و آئینِ تقلید میں سب سے پہلی خرابی یہ ہے کہ ہمارا دماغ، ہمارا خیال، اور ہمارا آلۂ فکر دوسروں کا غلام ہے۔ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ اور جدت و اجتہاد سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

آگرہ اسکول کی خصوصیات

ان تمام تقلیدی یا قدامت زدہ اسالیب شاعری کی حدیں توڑنے کے بعد، بہت دور چل کر جو منزل شروع ہوتی ہے وہی ترقی یافتہ اور حقیقی شعرا کی منزل ہے۔ اور وہیں آگرہ اسکول کی بھی بنیاد رکھی گئی ہے۔

آگرہ اسکول کا ایک طالب علم اپنی غزل، والدین، استاد، بہنوں، بیٹیوں، اور ملک کی تمام خواتین کے سامنے بے تکلف پڑھ سکتا ہے۔

اس رنگ کے علاوہ موجودہ اردو شاعری جس رنگ میں بھی پیش کی جائے زندہ رہنے والی نہیں جس شعر کے سننے سے طبیعت میں اتنا غلط کشاد پیدا ہو کہ سامع کو بے اختیار ہنسی آجائے وہ غزل کا شعر نہیں، ریختی کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے۔ شعر وہ ہے جو سماعت میں کیف اور دل میں اثر پیدا کر دے۔ شعر وہ ہے جس کے سمجھنے کے بعد روح میں ایک روشنی اور معلومات میں ایک اضافہ محسوس ہو۔ شعر وہ ہے جو باوجود کوشش جاہل یا کم علم موزوں طبع شخص نہ کہہ سکے۔ اور شعر وہ ہے جو زبان سے زیادہ کاغذ پر موثر ثابت ہو۔

آج اردو شاعری خراب افزا ہے۔ اس میں تفریط کی بہرحال ضرورت ہے۔ اہل کمال اور کم علم لوگوں کی شاعری میں کوئی وجہ تفریق ہونی چاہیے۔ ردیف اور قافیہ اور بحر کی پابندی کے ساتھ ایک خیال موزوں کر لینا کوئی معجزہ نہیں۔ ہر موزوں طبع بہرحال شعر کہہ سکتا ہے۔ لیکن کاغذ اور اذہان

پر صدیوں باقی رہنے والے شعر دماغ کی جودت اور روح کی قوت سے کہے جاتے ہیں۔ صرف بحر اور قافیہ و ردیف کے بوتے پر نہیں کہے جاتے۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ آج فیصدی ہ، شاعر اُسی رسمی اور قدیم شاعری کے دلدادہ ہیں۔ جو ایک طرف سوسائٹی کے لئے مخرب اخلاق اور دوسری طرف خود فن کے لئے سبب زوال ہے۔ مشاعرے میں صرف وہ شعر گونجتا ہے جو عام پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنیت عوام سے متوازی بھی ہو۔ لیکن ایسے شعر کی عمر کا اندازہ کیجئے، تو لب و دہن سے نکلنے اور سامعت کو چھو کر ایک بے معنی شور اور ہونٹوں پر وقتی تبسم پیدا کرنے کے بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ شاعر، جو فطرت کا راز داں ہے، جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کے سب نہیں، کچھ اشعار تو ایسے ہوں جو صرف شاعرے کے بعد نہیں، خود شاعر کے بعد بھی لوگوں کی زبان پر باقی اور دماغوں میں مرتسم رہیں۔

حریفانِ کم مایہ

بلند رنگِ تغزل کا مضحکہ اڑانے والے اپنی کم مائگی اور عجز طبیعت سے مجبور ہیں۔ چونکہ وہ خود بلند شعر نہیں کہہ سکتے اس لئے اس رنگ کو ہوا بنا کر پیش کرتے ہیں اور جہلا کی تائید اُن کے ساتھ ہوتی ہے۔ ورنہ جدید رنگِ تغزل کوئی ایسا عجیب و غریب رنگ نہیں جو ان قدامت پرست حضرات کیلئے اس درجہ خطرناک ہو۔ موجودہ زمانے کا رنگ، موجودہ تعلیم کا رنگ، موجودہ تہذیب کا رنگ، اور موجودہ تمدن کا رنگ جس رنگ میں جھلکے وہ ہی جدید رنگِ تغزل ہے۔ اور جس رنگ میں دو چار سو سال پہلے کی جھلک ہو وہ قدیم، پھر کیا عقلِ سلیم گوارا کر سکتی ہے کہ آج چودھویں صدی ہجری کے نصف حصۂ آخر میں بھی ہماری شاعری کا وہ ہی رنگ ہو جو دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں تھا؟ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک فاضل و ماہر السنہ کو مجبور کیا جائے۔ کہ وہ اُسی زبان میں گفتگو کرے جس کا استعمال آغوشِ مادر میں کرتا تھا۔ یا اگر ویسی زبان اختیار نہ کر سکے تو اس کی نقل ہی کرے۔ اور اگر نقل بھی نہ کر سکے تو کم از کم خیالات وہ ہی ہوں جو عہدِ طفلی میں تھے۔ یہ عروج کی طرف سے زبردستی کھینچ کر پستی کی طرف لے جانا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اُردو شاعری کبھی عروج و ترقی کی آخری منزل تک نہیں پہونچ سکتی جب تک اس میں بلندی،

استحکام، روحانیت، اور شائبۂ الہام نہ ہو۔ بے شک ایسے حقیقی شاعر بہت کم ہیں۔ لیکن ان کی پیروی کرنا اور اُن کے نقوشِ قلم پر چلنا بھی صرف شاعر ہی کا کام ہے۔ شاعر ہر دور میں گنتی کے ہوتے ہیں۔ گو ہر دور میں شعرا کی کثرت شمار و اعداد سے بالاتر ہوتی ہے۔

اُردو شاعری کا ایک اور نقص

باستثنائے چند، اُردو شاعری کا موجودہ دور مہمل و باطل ہونے کے علاوہ ملکی و قومی زندگی سے وابستہ نہیں۔ حالانکہ ازمنۂ قدیم میں "شاعر" زندگی کے ہر شعبے پر حاوی اور زندگی کے ہر شعبے کا جزو لاینفک تھا۔

میں زیادہ دُور نہیں جاتا۔ جنگِ بلقان کے زمانے میں، باوجود ادعائے اخوتِ اسلامی، ہندوستان کے کتنے شعرا نے ٹرکی کی حمایت میں بلند نوائی کی؟ جنگِ طرابلس پر ہندوستانی شعرا کی کتنی نظمیں آج محفوظِ تاریخ ہیں؟ مسئلۂ فلسطین پر ہندوستان کے کتنے شعرا نے اظہارِ خیال کیا ہے؟ بلقان، طرابلس، اور فلسطین کو جانے دیجئے۔ بغاوتِ افغانستان کے موقع پر ہمارا "شاعر" کہاں تھا؟ کتنے شاعر ہیں جنھوں نے امان اللہ خاں کی بیکسی پر آنسو بہائے اور افغانستان میں قیامِ امن کے لئے اپنی نیرِ فکر سے کام لیا۔ کتنے شاعر ہیں جنھوں نے حامیِ انسانیت کی حیثیت سے یورپ کی جنگِ عظیم کے خلاف جنگ کی؟

یورپ اور افغانستان کو بھی چھوڑئے۔ خود اپنے ملک میں موجودہ دور کے شاعر نے کتنا اور کیا کام کیا؟ تحریکِ آزادی، تنظیمِ ملت، مہمِ کشمیر، توہینِ اسلام، مولانا محمد علی کی وفات، فرزندانِ وطن کی شہادت، غرضکہ گذشتہ پندرہ سال میں ایک دو نہیں سیکڑوں تاریخی حادثے رونما ہوئے۔ ہندوستان کے کتنے شعرا نے انھیں عنوانِ فکر بنا کر نظمیں کہیں اور اپنی شاعری سے درسِ اصلاح و تلقین و پیام کا کام لیا؟

فرزندانِ وطن جیل خانوں میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ اکابرینِ وطن دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، بہادرانِ وطن سرفروشی کا عملی جذبہ دکھا رہے تھے، رہنمایانِ وطن قید و بند کے لئے اقتدار و اضطراب میں مبتلا تھے۔ مگر شاعرانِ وطن، مکلف مسندوں پر تکیے لگائے، شمع کافوری کی روشنی میں، اپنی بساطِ

انبساط و استغنا پر بزمِ مشاعرہ منعقد کئے بیٹھے رہے۔ اور اس جنوں خیز سیاسی موسم میں بھی ہمارا شاعر شبِ وصل کے جھوٹے خواب دیکھتا رہا اور بڑبڑاتا رہا ؎

بند آنکھیں کئے بندہ تصور میں پڑا ہو
جم سے کوئی اس وقت جو آجائے مزا ہو

بیشک لاکھوں مدعیانِ شاعری میں دس بیس شعرا کا دردِ ملک و قوم سے متاثر ہو کر نظمیں کہہ لینا باقی تمام شعرا کی طرف سے کفارہ نہیں ہو سکتا۔ فضا کی تبدیلی پر، حزم و احتیاط کے ساتھ، ہر شاعر کو اپنا مسلک بدل دینے کی ضرورت تھی۔ ہر شاعر کو دردِ وطنیت سے تڑپ جانے کی ضرورت تھی۔ مشاعروں کی جگہ مناظمے قائم کئے جاتے، واقعات و حالات پر اثر آفریں اور فضا نواز نظمیں کہی جاتیں اور بتا دیا جاتا کہ شاعر بھی اپنے وطن کے ساتھ ہے، شاعر بھی اپنی قوم و ملت کا خادم ہے۔ اور شاعر بھی اگر ضرورت ہو تو جیل خانوں میں نوائے زنجیر پر رقص کرنے اور ربابِ زنداں دیکھ کر غزلخواں ہونے کو تیار ہے۔

لیکن ایسا کیوں ہوتا، اور ایسا کون کرتا، جب کہ ایک صدی سے ہمارے شعرا کی یہ ذہنیت ہی نہیں رہی، عمل کے لئے تقلید کی ضرورت تھی۔ اور اساتذۂ متاخرین کے نقوشِ قدم اس راستے میں موجود نہ تھے، پھر تقلید کیونکر ہوتی ؟

تقلید و قدامت پرستی

عام اردو شاعری کے موجودہ انحطاط کا ایک بڑا سبب کورانہ تقلید بھی ہے شعرا کی اجتہادی قوت مرورِ ایام سے سلب ہو چکی ہے اور وہ ایک دائرۂ محدود سے نکلنا اور ترک و اختیار کی مقررہ قیود سے باہر آنا کفرِ شاعری سمجھتے ہیں۔ اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں، اور اُس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں منتقل کرنا، ان کا ایک مستقل گراں تر شغل ہے۔ جس کا حاصل کچھ نہیں، جب ہندوستان کے شاعر اور اردو شاعری کا یہ حال ہو تو خاموش بیٹھنا گناہِ عظیم ہے۔

اس خرمنِ فرسودہ میں آگ لگا دینے کی ضرورت ہے۔ اس انبارِ قدامت آلود سے بزمِ سخن کو پاک کر دینا مناسب ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری طرح اس ضرورت کو سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن لب کشائی کر کے انگشت نما کون ہو۔ ایک حمام میں سب برہنہ ہوں تو کسی کو اپنی برہنگی پر ندامت نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی تردد پیدا ہو سکتا ہے۔ تو سوسائٹی کی دلچسپیاں اُسے بھی بھلا دیتی ہیں۔

تنقید کا غلط معیار

اردو شاعری پر تنقید ہوتی ہے۔ مگر ایبر کرومبی، کیٹس، ہربرٹ ریڈ، ایلیٹ، مولٹن اور ملٹن کے نقطۂ خیال سے اردو شاعری پر تبصرہ ہوتا ہے تو ارسطو اور دوسرے یونانی ناقدین کے نقطۂ نگاہ سے اگر زمانے اور ماحول کو دیکھ کر، ضرورت اور مطالبۂ وقت کو ملحوظ نظر رکھ کر اردو شاعری پر مشرقی نقطۂ نگاہ سے کوئی تنقید نہیں کرتا۔ تنقید سے اپنی علمی قابلیت اور وسعت مطالعہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے، تصنیف کا محاسبہ مقصود نہیں ہوتا۔ ایسی تنقیدیں اردو شاعری پر نہ صرف بیکار بلکہ غلط مبحث کی تخلیق کا ذریعہ ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ باوجود لاتعداد تنقیدی مضامین کے اردو شاعری کے انحطاط وزوال میں مطلق کمی نہیں۔

اردو شاعری کا عہدِ اولین زبان کے اعتبار سے کتنا ہی معصوم کیوں نہ گذرا ہو مگر زمانے کی ضرورت کے مطابق ضرور تھا۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، غالب و مومن، داغ و امیر اپنے اپنے عہد کے شاعرِ اعظم ہوئے ہیں۔ اور آج بھی جب ہم ان کا مطالعہ بہ نگاہِ انتخاب بالاستیعاب کرتے ہیں تو ہمارے قلوب اُن کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، لیکن یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آج کا شاعر آج کا شاعر معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کے جذبات اور اسالیبِ بیان گذشتہ دو سو سال کے قدیم نظر آتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری بلحاظِ موضوعات و اسالیب چار یا پانچ صدیاں گذر نے کے بعد بھی ابھی وہیں ہے جہاں سے اُسکی ابتدا ہوئی تھی۔ تو کیا یہ رفتار منزل رسی کے لئے کافی ہے ؟

موجودہ شاعر کا عملی کریکٹر اور مشاعرے

ذرا ہمارے ایک کہن سال، کہن خیال، اور کہن مشق شاعر کی عملی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ بال سپید ہیں، منہ میں ایک دانت نہیں، کمر خمیدہ، چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی، سر ہل رہا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ قرطاسِ غزل لرز رہا ہے۔ اس عالم دعمر میں مطلع عرض کیا جاتا ہے ؎

شبِ وصال جو گھر میں رقیب آ بیٹھے　　　ہم اُن کے پاؤں دبانے قریب آ بیٹھے

مشاعرہ واہ واہ اور قہقہوں سے گونج رہا ہے۔ "پھر ارشاد پھر ارشاد" کی سماعت خراش صدائیں چاروں طرف سے بلند ہیں۔ بزرگ شاعر کے ہاتھ آداب و سلام کے لئے مشین کی طرح حرکت کر رہے ہیں

سامعین کے سر ونکی مضحکہ خیز جنبش، اور شورِ بے معنیٰ سے کامل یقین ہو چکا ہے کہ جو مطلع پڑھا گیا وہ اردو شاعری کا ماسٹر پیس (اختراع فائقہ) ہے۔ اس لئے بار بار پڑھے جا رہے ہیں، نہ زبان تھکتی ہے، نہ ہاتھ رکتے ہیں۔ خدا خدا کر کے محفل میں سکوت ہوتا ہے اور کہنہ مشق کا تعرف یہ شعر کہلواتا ہے ؎

جسے کہیں نہ ملیں ٹھوکریں زمانے میں　　تمہارے کوچے میں وہ بدنصیب آ بیٹھے

اس شعر پر، جو حقیقت میں متین اور پُر لطف شعر ہے، صرف "خوب خوب" کی دو چار آوازیں کسی سمتِ غلط سے آکر فضا میں کھو جاتی ہیں۔ ہمارے شاعرِ بزرگ کو یہ طرزِ عمل ناگوار ہوتا ہے، وہ اپنے اس شعر کو غزل کا بدترین شعر سمجھ کر دوبارہ بھی نہیں پڑھتا اور اسی قسم کے دو تین شعر چھوڑ کر کہتا ہے یہ شعر سنئے انشاءاللہ آپ بہت محظوظ ہوں گے۔

میں کیا بتاؤں مرا حال کیا ہوا شبِ وصل　　وہ بن سنور کے جو میرے قریب آ بیٹھے

شاعرے پر پھر عالمِ وجد و رقص طاری ہو گیا۔ "پھر پڑھئے" "پھر پڑھئے" کی صدائیں آنے لگیں لفظِ "حال" "بن سنور" "کیا بتاؤں" اور "قریب" پر خصوصیت سے داد دی جانے لگی۔ اب شاعر اچھی طرح سمجھ گیا کہ شاعروں کے شعر کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ معزز حضرات! یہ ہے ہماری اردو شاعری کی قدر و قیمت، اور یہ ہے سامعین شاعرہ کا ذوق و ذہنیت، جب عوام کا مذاق اتنا غلیظ، اور شاعری کا معیار اس قدر رکیک ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ اردو شاعری اپنی حقیقی منزل پر پہونچ چکی ہے یا پہونچنے والی ہے؟۔

کسی بھرے شاعرے میں یہ مطلع پڑھ دیجئے، ؎

سمجھے گا اس کا درد کون شورش کائنات میں　　تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

دو چار سر کہیں ملتے ہوئے نظر آجائیں تو ممکن ہے ورنہ انشاءاللہ تمام مشاعرے پر موت طاری ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ ہماری شاعری کو پستی کی طرف دعوت دینے والا عوام کا مذاق بھی ہے جس طرح سخنور بہت کم ہیں، اسی طرح سخن فہم و سخن شناس افراد کا بھی قحط ہے۔ اور جب ملک کی ادبی فضا کا یہ حال ہے تو مشاعروں کا انعقاد ایک ایسے ڈرامے سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا

جس کا حصہ فائق "مزاح" پر اور کمتر حصہ نشاط پر مشتمل ہو۔

موجودہ شاعری کے نمونے

موجودہ عام اردو شاعری کا رنگ مندرجہ ذیل اشعار سے بہ تمام و کمال واضح ہوتا ہے۔ یہ اشعار وہ ہیں جو ۱۹۲۳ء میں کسی بزم ادب کے سالانہ اجلاس میں پڑھے گئے ہیں اور بطورِ انتخاب فخر و مباہات کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ ان اشعار پر مشاعرے گونج چکے ہیں اور یہی وہ اشعار ہیں جن پر ادبی انجمنوں کے سالانہ مشاعروں یا جلسوں کی کامیابی کا انحصار ہے :۔

جوانی دیکھئے گیا، شوخیاں بھر دے گی جوبن میں
کمی بیشی نہیں جس میں وہ حسنِ لایزالی ہے
کہاں سے آفتاب ایسی ضیا خورشید نے پائی
پھٹا پڑتا ہے جوبن یار کا جوشِ جوانی سے
ہوئے گل سرخ غصے سے جو دیکھا گل سے عارض کو
کسی دن اختلاطِ غیر دیکھو رنگ لائے گا
جواں ہو کر خدا جانے کرو گے حشر کیا برپا
الٰہی برق پھر گر دل پہ چمکے اور مزہ آئے
غضب ہے آج ڈاکہ پڑ رہا ہے جس کے گلشن میں
ستاتی ہے، رلاتی ہے، جلاتی ہے، مٹاتی ہے
نشیلی آنکھ، متوالی ادائیں، چلبلی چتون
لگا دے تینگلی چاک گریباں سارے دامن میں
قیامت کیوں بپا کرتا ہے تو شباب کی جاں پر
یہاں تو رات کٹتی ہے ہماری آہ و شیون میں
نہ کرنا تھا مجھے عشق اس صنم کی زلفِ پیچاں کا

کسی کی سادگی بھی اک قیامت ہے لڑکپن میں
ہزاروں سال گذرے، اور نہ آیا فرق جوبن میں
جو ہے اس روئے روشن میں جو ہے اس کی دوشن میں
برنگِ گل نہیں پھولا سماتا جامہ تن میں
مری جاں تو نے آتے ہی لگا دی آگ گلشن میں
نہیں اچھا مری جاں روز جانا بزمِ دشمن میں
قیامت کا نمونہ ہو مری جاں تم لڑکپن میں
کہ ڈر کر وہ صنم پھر ہاتھ ڈالے میری گردن میں
وہ بلبل اف بھی کر سکتی نہیں بیٹھی نشیمن میں
عجب انداز کا جادو ہے ظالم تیری چتون میں
یہ دیکھی ہے نرالی بات اس کافر کے جوبن میں
جنوں نے آگا پیچھا کچھ نہ چھوڑا میری الجھن میں
لڑکپن میں لڑکپن میں لڑکپن میں لڑکپن میں
وہاں وہ سو رہے ہیں چین سے پہلوئے دشمن میں
پڑا ہوں سخت الجھن میں پڑا ہوں سخت الجھن میں

جو بیش از شورِ محشر دیکھنا چاہو قیامت کو
الٹ کر دیکھو لو زیرِ نقاب اور پشتِ چلمن میں

ترا تیرِ نظر دل اور جگر میں جاکے دھنستا ہے
نہ یہ تیزی نہ یہ گھس بیٹھ ہے سوفارِ آہن میں

جواں ہو کر کوئی انساں پری تو ہو نہیں سکتا
مگر اٹھتی جوانی پر لگا دیتی ہے جوبن میں

نظر آتا تھا حسنِ یار چھن چھن کر غنیمت تھا
الٰہی تیلیاں اُس نے بڑھالیں اوڑ چلمن میں

حضرات! آپ ان اشعار کو تکلیفِ سماعت سمجھ کر گھبرائیں نہیں۔ اس لئے کہ یہ اشعار بہرحال ایک بڑے درتبع مشاعرے میں پڑھے گئے ہیں۔ اور ایک ادبی انجمن کی روداد کے ساتھ شائع ہوئے ہیں اگر آپ اس مشاعرے میں شریک ہوتے تو ان اشعار کی سماعت وہاں بھی ناگزیر تھی۔ نہ صرف ناگزیر بلکہ آپ کا رسمی یا اخلاقی فرض یہ بھی تھا کہ آپ ان اشعار کے مصنفین کو داد و تحسین سے نوازیں۔ اور ہر شعر پر کم از کم دس دس بار جھومیں۔ اگر آپ کو یہ اشعار اس وقت مکروہ معلوم ہو رہے ہیں تو مشاعروں میں بھی ان کی سماعت مکروہ ہونی چاہیے۔ ان اشعار کے دُہرانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں آپ کو عام اُردو شاعری کا رنگ معلوم ہو جائے وہاں آپ کو یہ ضرورت بھی محسوس ہونے لگے کہ ایسی شاعری کو دنیائے ادب سے قطعاً خارج کر دینا چاہیے۔ تاکہ پھر اس قسم کے اشعار کسی نوعیت سے بھی تکلیفِ سماعت نہ ہوں۔ اور ملاحظہ فرمائیے۔

میں یاد آؤں انھیں کیا اُن کا مجھ سے دل مکدر ہے
کہ آتا ہے نظر کب عکس صورت صاف روغن میں

گہر کو چھوڑ کر چننا صدف ہے کارِ طفلانہ
خدا ہو دا اُس دنیا پہ پڑے ہوکس لڑکپن میں

بھرا تھا کیسا جادو چشمِ مستِ شوخ پُرفن میں
کہ متوالی نگاہوں نے لگا دی آگ سی تن میں

وہ گلرو آج آیا ہے گُلِ عارض کے بوسے لو
مرادیں سب بر آئیں پھول چن لو آج دامن میں

تصور دل سے ہٹتا ہی نہیں اُس گال کے تل کا
تو میرا جی چاہتا ہے جی لگادوں آگ خرمن میں

اِسے تو چاہا اُسے کاٹا ادھر دیکھا اُدھر تاکا
لگاوٹ کی ادائیں ہیں تمہارے چلبلے پن میں

متاعِ ہوش و عقل و صبر سب قربان کردوں گا
تمہیں دیکھوں گا گر بیٹھا ہوا پہلوئے دشمن میں

یہ جوبن آسمانی اور یہ سن اے معاذ اللہ
بنائی وضع کیوں پیرِ فلک کی تم نے بچپن میں

مرا دل وہ ہے دل یار دو جو مستغنی ہے دنیا سے
نہ تاکے ہے کسی گھر میں نہ جھانکے ہے وہ چلمن میں

میں اس حیرت میں بیٹھا ہوں، خدایا ماجرا کیا ہے
مرے ارمان کیونکر جا چھپے ہیں قلب دشمن میں

کیا پامال خاکِ قبر کو ظالم نے قدموں سے
وہ سمجھا ہے مری جان چھپ گئی ہے خاکِ مدفن میں

بڑا بیڈھب دل آیا ہے بت کافر پہ زاہد کا
الٰہی خیر ہو اب چل پڑی شیخ و برہمن میں

گلستاں میں بھی یہ گل رشک مجھ پر کھاتے ہیں لیکن
چپٹ جاتے ہیں ہولش میرے ہو کے خار دامن میں

سنا ہے جب سے کوئی دید کا دیوانہ آیا ہے
نہایت شاق ہے اب بیٹھنا آ آ کے چلمن میں

نکلتا ہے مرا دم انتظار یار میں اب تو
بنا دینا کوئی روزن مری دیوار مدفن میں

پری کا آپ کو سایہ نہ ہو جائے مجھے ڈر ہی
شبِ مہتاب میں ہرگز نہ سوئیں آپ آنگن میں

یہ چالیس صفحات میں سے صرف ۱۸-۱۹ صفحات کا سرسری انتخاب ہے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا یہی وہ شعرا ہیں جن سے آج ہندوستان کا گوشہ گوشہ آباد ہے اور یہی وہ اشعار ہیں جن سے شاعروں کی ادبی محفلیں گرم ہوتی رہتی ہیں۔ اب ایک دوسرے مشاعرے کے چند اشعار سنئے، میں انشاء اللہ بہت اختصار سے کام لوں گا۔ میرا مقصد اس تکلیفِ مزید سے یہ ہے کہ صرف کسی ایک مشاعرے تک یہ لغویت محدود نہیں بلکہ ہر مشاعرے میں اردو شاعری کا یہی عام رنگ ہے۔

کیوں ستم ڈھاتے ہیں وہ مجھ کو رلانے کے لئے
میں تو اس محفل میں ہوں ہنسنے ہنسانے کے لئے

کیا مگر میرا تمہارے تیر کے قابل نہ تھا
غیر کا دل کس لئے تاکا نشانے کے لئے

ہنستے ہو دشمن سے تم میرے جلانے کے لئے
یہ ہنسی غیروں کو ہے مجھ پر ہنسانے کے لئے

آنکھ گو ٹیڑھی رہے لیکن رہے دل میں خیال
آنکھ لڑنے کے لئے ہے دل ملانے کے لئے

عشق اے فرہاد رکھنا تھا تجھے مخفی اگر
ہاں بنا تھا کوہکن الفت جتانے کے لئے

آئے وہ بیدار قسمت کو سلانے کیلئے
غیر بیٹھے بزم میں مجھ کو اٹھانے کے لئے

یہ کیا طرز ستم میرے جلانے کے لئے
غیر کے پہلو میں بیٹھے مسکرانے کے لئے

سر میں تیشہ مار کر فرہاد تو نے کیا کیا
خوف پیدا کر دیا سارے زمانے کے لئے

روریا ہوں میں ابھی پہلو سے جاتا کیا ضرور / ایسی باتیں اور تم کہتے ہو جانے کے لئے
پھر گئی گھورے کی بھی بارہ برس کے بعد میں / سو گئے پہلو میں وہ قسمت جگانے کے لئے
بے طرح غیروں نے بھڑکایا ہے منتا ہی نہیں / سینکڑوں کیں منتیں اس کو منانے کے لئے
دب گیا[1] احسان و شرم سے میں زمیں کے اندر / آئے جب میت کو وہ کاندھا لگانے کے لئے
آخری دیدار کی حسرت جو تھی احباب کو / منہ سے سرکایا کفن تربت جھکانے کے لئے
لیجئے میں قتل کر میں ہو گیا سینہ سپر / کیا مجھے خنجر دکھایا تھا ڈرانے کے لئے
شوخیاں گر کم رہیں، میرے ستانے کیلئے / تیغ ابرو کھینچ لو میرے مٹانے کے لئے
خود نہیں تیار ہرگز اٹھ کے جانے کیلئے / میں ابھی اٹھوں جو آپ آئیں اٹھانے کے لئے
وصل کی شب بھی انھیں عذرِ حنا بندی رہا / یہ ملا اچھا بہانہ خوں بہانے کے لئے
خوب یہ سوچے شب وعدہ نہ آنے کے لئے / لاؤ مہندی ہی لگا بیٹھیں بہانے کے لئے
خالِ رُخ دیکھا جو ان کا گیسوؤں کے جال میں / طائرِ دل پھنس گیا خود ایک دانے کے لئے
کیوں نہیں اٹھتی گھٹا ایسے میں یارب جھوم کر / وہ چڑھے ہیں بام پر گیسو سکھانے کے لئے
مسکراتے ہیں وہ لب ہائے مسی مالیدہ سے / آسمانی رنگ کی بجلی گرانے کے لئے
داغہائے دل سے میرے ہے جہاں میں روشنی / چاند و سورج ہیں فقط گردش دکھانے کے لئے
ہو ابھی نادان یوں سب سے نہ گھل مل بیٹھا کرو / دیر کیا لگتی ہے دنیا کو اڑانے کے لئے

بدقسمتی سے نہ تو شاعر بننے کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت ہے نہ اشعار پر کوئی محصول ہے، وہ حکومت بھی، جو عریانی و بدتہذیبی اور برہنہ تصاویر کی اشاعت کے خلاف ہے، برہنہ شاعری اور رکیک تک بندی کے لئے کوئی قانون نافذ کرنے پر آمادہ نہیں پھر برخورداران وطن خوددردی و آزادی کے ساتھ دھوتی میں پھاگ نہ کھیلیں تو کیا کریں؟

---

[1] اس مصرع کی عروضی شان دیکھئے۔

یہ تو طبقۂ ادنیٰ کا رنگِ تغزل ہے۔ طبقۂ وسطیٰ کسی قدر سنبھل کر چلتا ہے۔ گو جدتِ خیال اور شوکتِ تخئیل سے کوسوں دور ہے۔ صرف اُس کی شاعری میں رکاکت کی جگہ متانت زیادہ ہے۔ مثلاً

سرِ تربت ابھی کون ہے مصروف شیون میں　　ہوئی جاتی ہے میری روح کیوں بے چین مدفن میں
کبھی میں منفعل ہو کر جو رو دیا اپنے عصیاں پر　　گرے اشکِ ندامت پھول بن کر میرے دامن میں
ابھی بعدِ مردن بھی وہی ایذا رہی باقی　　کسی کی یاد اب بھی چٹکیاں لیتی ہے مدفن میں
مری بربادیاں ہیں قابلِ صد رحم گلشن میں　　نہ کوئی پر ہے بازو میں نہ تنکا ہے نشیمن میں
ابھی کچھ کام باقی رہ گیا ہے دشتِ وحشت کا　　ابھی کچھ فاصلہ سا دیکھتا ہوں جیب و دامن میں
پسِ مردن محبت سے پڑے ہیں ہاتھ گردن میں　　اُٹھنے ہی نہیں دیتے مرا لاشہ وہ مدفن میں

یا دوسرے شاعر کے یہ اشعار،

برقِ حسنِ یار ہے صبر آزمانے کے لئے　　عشق کا بیتاب دل مضطر ہے آنے کے لئے
آسماں بیتاب ہے بجلی گرانے کے لئے　　یا خدا میں کیا کروں اب آشیانے کے لئے
طائرِ دل چین نہ لے گا آشیانے کے لئے　　آسماں تیار ہے بجلی گرانے کے لئے
میں سمجھتا تھا کہ غم میرے لئے مخصوص ہے　　وقف وہ بھی ہو گیا سارے زمانے کے لئے
اب یہی سوچا ہے دیدوں جان راہِ عشق میں　　چھوڑ جاؤں کچھ تو دنیا میں فسانے کے لئے
عشق کی ہستی ہی کیا ہے عشق بے چارہ غریب　　حسن برہم ہو تو کافی ہے مٹانے کے لئے
تیرے در کو چھوڑ کر کیوں در بدر مارا پھروں　　سر ازل سے وقف ہے اس آستانے کے لئے

طبقۂ وسطیٰ کے اسلوبِ شاعری سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں جوبن۔ گدگد۔ گرگر۔ پہلوئے غیر۔ آغوشِ رقیب۔ تیغِ ابرو۔ خدنگِ حنا بندی، مسی مالیدہ ہونٹھ۔ گلِ عارض اور اُس کے بوسے، خالِ رخسار پری کا سایہ۔ تاک جھانک۔ بچپن، آسمانی جوڑا، اچکن، صنم اور میری جان کا جھگڑا نہیں رہا اور اسی لئے خیالات بجائے خود کافی سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ شاعری کا اسلوب بھی ایک حد تک غنیمت ہے۔

اس کے بعد طبقۂ اعلیٰ ہے۔ اس طبقے میں ندرتِ خیال کے ساتھ جذبات آفرینی اور اسلوبِ بیاں

کی شانت بحدِ نمایاں پائی جاتی ہے۔ مثلاً

یہ کیسی جلوہ افروزی تھی یارب دشتِ ایمن میں — تڑپ باقی ہے جسکی آج تک موسیٰ کے مدفن میں
خودی میری کسی بیخود کے جلووں کا ہے آئینہ — نہ یہ میرا نشیمن ہے نہ میں ہوں اس نشیمن میں
ہماری خانہ ویرانی کی یوں تکمیل ہو جاتی — تڑپتی لوٹتی کچھ بجلیاں ہوتیں نشیمن میں
بنائے لاکھ گلشن لے جنوں مشقِ تصور سے — سمجھ آئی کائناتِ حسن سب صحرا کے دامن میں
اُسے شاید مری دیوانگی کی یاد آئی ہے — ابھی ہلکی سی جنبش تھی مرے ذراتِ مدفن میں

دوسرے شاعر کے یہ شعر بھی اسی معیار کے ہیں۔

دل کو یوں آمادہ کیجے غم اُٹھانے کے لئے — زندگی اک درس بن جائے زمانے کے لئے
غرقِ غم ہو جا، اگر ہے خواہشِ عرفانِ غم — ہوش کھو دینا ہے لازم ہوش آنے کے لئے
حسن کے ہاتھوں سے تکمیلِ فنا ہونے تو دو — بجلیاں لائیں گی تنکے آشیانے کے لئے
راہِ غم میں ہر قدم پر ہے مصائب کا ہجوم — دل کی پنہاں قوتوں کو آزمانے کے لئے
عشق کیا ہے اُن کے دیوانوں کی سعی بے پناہ — کل جہاں والوں کو اک مرکز پہ لانے کے لئے
کیسا بادہ، کیسی مستی، کیسا لطفِ مے کشی — ہم تو پیتے ہیں اُنھیں ساقی بنانے کے لئے
بے اسیری حریت راحت فزا ہوتی نہیں — ہے قفس کی بھی ضرورت آشیانے کے لئے
ہے نمود و نیستی کی کشمکش کا نام زیست — زندگی ہے زندگی کا بار اُٹھانے کے لئے

آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ طبقۂ ادنیٰ نہ صرف رکاکت و ابتذال کی اشاعت کا خوگر ہے بلکہ اس میں ترقی و ترفع کے آثار تک نہیں پائے جاتے۔ ایسے اشعار کہنے والوں کو بلحاظِ عمر و مشق مبتدی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کم علمی، کم سوادی، اور فقدانِ شوق، کی وجہ سے ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ یہ لوگ رسماً شعر کہہ کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں ایسے حضرات سے بادب عرض کروں گا کہ وہ اس شغلِ بے کار سے باز آ جائیں اور کوئی ایسا دوسرا کام اختیار کریں جس سے اُنھیں اور ملک کو فائدہ پہونچے۔ شاعری اُن کے اس طرزِ عمل سے بدنام ہو رہی ہے۔ اور

ناموسِ ادب کو نقصان پہونچ رہا ہے۔

طبقۂ وسطیٰ میں ترقی کے تمام آثار موجود ہیں۔ اس طبقے کو حزم و احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے آگے بڑھنے کا ذریعہ کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ مشق ہے۔ اساتذہ کی اصلاح بھی اس منزل میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن میں نے بعض طلبائے شعر کو دیکھا ہے کہ وہ اصلاح پر زیادہ غور نہیں کرتے اور اکثر اصلاح دینے والوں کے بھروسے پر محنت اور فکر سے شعر بھی نہیں کہتے۔ یہ خوئے اعتبار بہت غلط ہے شعر ایسا کہنا چاہئے جسمیں ضرورتِ اصلاح بہت کم ہو۔ وہ اساتذہ جو کشادہ دلی اور غایتِ التفات سے اپنے شاگردوں کی غزلیں بناتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں حقیقت میں کچھ اچھا نہیں کرتے۔ اس طرح طلبا میں غور و فکر کی قوت پیدا نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر محتاجِ اصلاح رہتے ہیں۔

طبقۂ اولیٰ کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں — انکی شاعری اور شاعروں میں شرکت ادبِ اردو پر ایک قسم کا احسان ہے۔ اور انھیں کی جنبشِ قلم پر اساسِ شاعری قائم ہے۔

عصرِ حاضر سے عصرِ قدیم کا موازنہ

ارتقائی ادبِ اردو کی رفتار آثار ہمیں صاف بتا رہی ہے کہ اردو شاعری کی ترفیع و ترقی کے لئے ہمیں میر و غالب کے اسلوب شاعری کی طرف لوٹنا ناگزیر ہے۔ یہ بات تعجب خیز اور حیرت ناک ہے کہ آج اردو شاعری کی جو ارتقائی صورت ہمارے پیش نظر ہے۔ وہ میر و غالب کی شاعری میں پہلے سے موجود ہے۔ یہ حضرات اپنے عہد میں مستقبل کے شاعر تھے۔ اور شاعر وہی ہے جو مستقبل کو ملحوظ نگاہ رکھے۔ میر اور غالب اپنے دور میں تنہا نہ تھے۔ سیکڑوں شاعر ان کے زمانے میں بھی تھے۔ لیکن سب کو زندگی نہ مل سکی کچھ لوگ دس سال اور کچھ بیس سال کے بعد بھلا دئے گئے۔ اب نہ انکا کلام باقی ہے نہ انکا نام باقی ہے۔ یہی حال شعرائے یورپ کا بھی ہے۔ اگر حکومت کی حمایت اور احساسِ وطنیت اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں یورپ کے شعرا کا نام نہ دہراتی رہے تو انکی زندگی مختل ہو جائے۔ ہندوستان کا شاعر صرف اپنی ذہنی قوت اور قدرتِ کلام کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ ورنہ ہندوستان یورپ کی طرح اپنے مرحوم شعرا کو پروپگنڈے کے مسالے سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

میر ۱۱۲۵ھ ہجری میں خاکِ آگرہ سے پیدا ہوئے۔ جسے آج ۲۲۲ برس گذر چکے ہیں۔ اُن کی نشوونما اور ابتدائی عمر کا حصّہ اگر نظر انداز کر دیجئے تو بارھویں صدی ہجری کے نصف باقی میں انکی شاعری درجۂ کمال پر پہونچ چکی تھی۔ اس زمانے میں میر کا رنگِ تغزل یہ تھا۔

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں، دلِ غمدیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا — خبر نہیں ہے تجھے آہ، کارواں میری

اُردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا یہ رنگ اُن کے بعد زیادہ عرصے تک اُردو شاعری نے قبول نہیں کیا۔ نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت سے نواب سعادت علی خاں کے عہد تک لکھنؤ میں اسی رنگ کی پرستش تھی۔ اور دہلی کے شعرا بھی اسی رنگ کو برتر و بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ دہلی اُجڑ کر اہلِ فن سے خالی ہو گئی، اور کاروانِ شعر و ادب بھی وہاں سے لکھنؤ پہونچ گیا۔ تمدن اور معاشرت میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ لکھنؤ والوں نے تکلف و تصنع کے ذریعے اپنا تفوق قائم رکھنا چاہا۔ جب تمدن اور معاشرت میں تکلف و تصنع باریاب ہو گیا تو شاعری بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ میر، سودا، مصحفی، سوز، جرأت اور انشا کے بعد دوسرے اُستاد پیدا ہوئے۔ جو نئی سوسائٹی کے سپوت اور نئے تمدن کے پروردہ تھے، ناسخ، اور اُن کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک، اور امانت وغیرہ نے شاعری کا قالب بدل دیا۔ ضلع جگت، لفظی مناسبت، ملازمہ، تکلف، تشبیہ، استعارہ، اور نیوٹ شعرائے لکھنؤ کا ایک مستقل اسلوب شاعری بن گیا۔ اور اُردو شاعری کی وہ اساس جو میر نے قائم کی تھی۔ متزلزل نظر آنے لگی۔

لیکن یہ اساس اتنی کمزور نہ تھی کہ متزلزل ہو جانے کے بعد منہدم بھی ہو جاتی پوری ایک صدی کے بعد آخر ۱۲۲۰ھ ہجری میں مومن و غالب نے دہلی میں رہ کر اسے سنبھالا۔ اور اس الزام کو غلط ثابت

کردیا کہ لکھنؤ کی زبان اور شاعری دہلی والوں کے اختلاط سے بگڑی تھی۔ مرزا غالبؔ نے اپنے نئے اور باقی رہنے والے رنگ میں نغمہ سرائی کر کے اُردو شاعری کو میرؔ کی شاعری سے ملا دیا۔ مرزا کا تمام دیوان اسی رنگ سے لبریز ہے ؎

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے ۔۔۔ صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی ۔۔۔ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مرزا غالبؔ کے بعد پھر ایک دورِ انحطاط شروع ہوا۔ اُسکی وجہ یہ تھی کہ مرزا کے ہمنوا اور ہم مذاق بہت کم تھے۔ میرؔ مجروحؔ اور مولانا حالیؔ نے مرزا کا رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اُنکا اتنا اثر واقتدار نہ تھا کہ وہ تمام ملک کو مرزا غالبؔ کی طرح اپنے اثرِ کلام سے مغلوب کر لیتے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۲ء عیسوی تک ہندوستان میں پھر طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ جس نے جو رنگ چاہا اپنے لئے پسند کر لیا۔ لیکن عین اُسی زمانے میں مغربی تعلیم اور مغربی تمدن نے ہندوستان پر غلبہ پا لیا۔ مغربی شاعری کے ساتھ ساتھ صحیح تنقیدی اصول اور فطری جذبات جزوِ تعلیم ہو گئے۔ اس لئے میرؔ کے بعد جس رنگ کی مرزا غالبؔ نے ایک صدی گذرنے پر تجدید کی تھی، مرزا غالبؔ کی وفات کے صرف ۴۳۔۴۴ برس کے بعد ہی اُسکی پھر تجدید ہو گئی۔ مثلاً

ذرّہ ذرّہ تربتِ فانیؔ کا شیون جوش ہے ۔۔۔ اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے
پھیرے میت کی جانب سے نگاہِ التفات ۔۔۔ سیکڑوں شکووں کے ترشے میں لبِ خاموش ہے

دل اور ہمت ترکِ خیالِ یار کرے ۔۔۔ کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے
شبِ وصال ہے کوتاہ نازِ یار دراز ۔۔۔ ہجومِ شوق سے کہہ دو کہ اختصار کرے
گذر چکی ہے تمنا کی حد سے دشواری ۔۔۔ کہاں تک اور ترا کوئی انتظار کرے

فی الحقیقت یہی رنگ تغزل کے لئے ایک صحیح، متین، اور پاکیزہ رنگ ہے جس میں میرؔ کا سوز، غالبؔ کی شوکت اور مرزا داغؔ کی سلاست بیک وقت موجود ہے۔ موجودہ دور میں منطق، فلسفہ

تنقید، اور علم کلام کی ممارست زیادہ ہے اس لئے اب یہ اندیشہ نہیں کہ یہ رنگِ تغزل پہلے کی طرح فنا ہو جائے گا۔

یو پی، اُردو شاعری اور اُردو زبان کا مرکز ہے، اس لئے لکھنؤ، دہلی اور آگرہ اسکول کو متحد ہو کر اُن بے عنوانیوں کو روک دینا چاہیے جو اُردو شاعری کے لئے رسوا کن ہیں۔ اس کی بہترین تدبیر صرف یہ ہے کہ عام شاعری اور شاعروں کا اسلوب بدل دیا جائے۔ اِدھر شعر بلند، سنجیدہ، اور پاکیزہ جذبات کا حامل ہو اُدھر مشاعروں کی مخلوق منتخب ہو۔

نظم گوئی کا رواج

میں نے اُردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے۔ اُردو نظم کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اگر نظم اُردو شاعری کا ایک جزو لاینفک ہے مگر نظم اپنی موجودہ صورت و ہئیت کے اعتبار سے اسی دور کی پیداوار ہے۔ اور مذاق و رنگِ جدید نے خیر سے اس پر قدامت و تقلید کا تاریک پرتو نہیں ڈالا ہے۔ پنجاب کے تمام شعرا نظم گوئی کی طرف کمال توجہ سے مائل ہیں۔ اور آج اُن کی نظمیں ادبِ اُردو کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یو پی میں ہنوز نظم گوئی کا رواج عام نہیں ــــ اتنے بڑے صوبے میں، شعرا کی اس کثرت کے باوجود صرف چار چھ شاعر ایسے ملیں گے۔ جو نظم کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ نظم، غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنفِ کلام ہے۔ اس میں کسی ایک موضوع پر وضاحت و تصریح کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ نظم کی ترویج کے لئے مناظموں کا انعقاد، مشاعروں سے زیادہ ضروری ہے۔ یو پی کی ادبی انجمنوں کو مناظموں کی ترویج کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر مناظموں سے ملک کو دلچسپی پیدا ہو گئی تو مشاعرے خود بخود کم ہو جائیں گے۔ اور شاعروں کی بے جا بیت سے ادبِ اُردو کو جو نقصان ہو رہا ہے وہ افادیت سے بدل جائے گا۔ ھو المقصود۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں یورپ اور ہندوستان کے شعرا و اُدبا کے اقوال اور اُن کی تصانیف کے اقتباسات سے مطلق کام نہیں لیا ــ جو اس زمانے کے مقررین یا مصنفین کی رسمِ انشا ہے میں نے ایسا دانستہ کیا ہے۔ اور منقولات اور روایات کو نظر انداز کر کے صرف واقعات و مشاہدات سے اُردو شاعری پر تنقید کی ہے۔

گیارہواں خطبہ

ہندوستانی یونیورسٹیاں اور ادبِ اردو

مشاعرہ انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ

۹۔ فروری ۱۹۳۴ء

اردو زبان کی عالمگیری لسانی حیثیت سے اردو زبان میں ایسا لوچ اور ایسی لچک تھی کہ آخر کار ارضِ ہند کی شترکہ زبان بن کر رہی۔ آج کوئی درس گاہ ایسی نہیں جہاں اردو کسی نہ کسی طرح شریکِ تعلیم نہ ہو۔ یعنی اگر طلبا، یا کالج اور اسکولوں کے پروفیسر اردو کے معلم و متعلم نہیں تو بھی اردو بولنا اُن کے لئے ناگزیر ہے۔ ہندوستان کی ۱۰ بڑی یونیورسٹیوں میں کم از کم ۸ یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں اردو بطور ثانوی زبان کے شریک درس ہے۔ خصوصاً یوپی اور پنجاب کی یونیورسٹیاں مجبور ہیں کہ صوبوی ضرورتوں کو ملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے اردو زبان کی ترویج و تعلیم کی طرف بھی متوجہ رہیں۔ دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو زبان کو تمام علوم کی ترجمانی کا درجہ دے دیا ہے۔ اور اب وہاں پوری تعلیم اسی زبان میں ہوتی ہے۔

ہر صوبے کی یونیورسٹی صرف اسی وقت ایک کامیاب یونیورسٹی کہلائی جاسکتی ہے جب کہ وہ اپنے صوبے کی مشترک زبان میں تعلیم کا انتظام کرے۔ غیر ملکی زبانوں کی مہارت صرف لسانیات

کے ایک طالب علم کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن اساسی تعلیم اُس وقت تک سہل الحصول نہیں ہو سکتی جب تک اُسے اپنی ہی زبان میں ڈھال کر حاصل نہ کیا جائے۔

مشاعروں کی افادیت

اُردو گذشتہ تین سو سال میں نہ صرف اس ملک کی مشترکہ زبان بن چکی ہے بلکہ اُس نے اپنا ادب بھی پیدا کر لیا ہے۔ اور جس طرح دوسری زبانیں اپنی ادبیات پر فخر کر سکتی ہیں اُردو کو بھی بجا طور پر یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی "لنگوا فرینکا" کہلانے کی مستحق ہے۔ ادب اُردو میں نثر کے علاوہ نظم کا درجہ بھی کچھ کم نہیں۔ اور مذاقِ نظم نگاری بہت زیادہ ہمارے مشاعروں کا مرہونِ منت ہے مشاعرے عہد اُردو کی بہت قدیم یادگار ہیں۔ اور گو مرورِ ایام نے مشاعروں کی اہمیت و افادیت کو کچھ زمانہ کمزور کر دیا ہے۔ تاہم اُن کے مفید اور ضروری ہونے سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مشاعروں کا ایک افادی پہلو ہی تو ہے کہ آج علوم و فنون کی عظیم الشان درس گاہوں میں بھی شاعروں کا انعقاد شریک رواج ہے۔

سرزمین "ارضِ تاج" کی دو عظیم المرتبت درسگاہیں، سینٹ جانس کالج اور آگرہ کالج بھی مشرقی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے "انجمن ترقی اُردو" اور "بزم ادب" کے ذریعہ ادب اُردو کی قابلِ تحسین خدمت کر رہی ہیں۔ اُن کے فاضل صدر اور لائق سکریٹری اپنی پوری توجہ سے کوشش فرما رہے ہیں۔ کہ کالجوں میں اُردو ادب اور ادبیاتِ مشرق سے طلبا کو لگاؤ اور شغف پیدا ہو۔ مجھ ان درس گاہوں میں ادب اُردو کا مستقبل بہت شاندار نظر آ رہا ہے۔ جو پودے آج لگائے جا رہے ہیں وہ ایک روز ضرور بار آور ہوں گے۔ اور جو باتیں آج چند نفوس کی دلچسپی تک محدود ہیں وہ آگے چل کر ایک پوری جماعت کا مطمحِ نظر بن جائیں گی۔

کالجوں کے مشاعروں اور ادبی مجالس کی اہمیت

لیکن کالجوں کے مشاعروں اور عام مشاعروں میں کوئی نوعیت ما بہ الامتیاز ہونی چاہئے۔ درس گاہیں ہماری اخلاقی و اجتماعی تہذ کی علم ہیں۔ اور معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی روایات عام روایات سے بلند رکھے۔ تعلیمی حیثیات سے ہر کالج، پرائمری اور ہائی اسکولوں سے مختلف حالات میں مختلف

امتیازات کا حامل ہوتا ہے۔ پھر کالج کے مشاعروں کو عام مشاعروں سے مرجح کیوں نہ ہونا چاہئے؟

آج کوئی کالج ایسا نہیں جہاں ادب اردو کی بقا و احیا کے لئے ادبی مجالس اور مشاعروں کا اہتمام نہ ہوتا ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ کوئی ادبی مجلس اور کوئی مشاعرہ ایسا بھی نہیں ہوتا جسے ملک کی عام مجالس اور مشاعروں پر ترجیح دی جاسکے پنجاب نے اس خصوص میں اپنی بیداری اور اختصاص پسندی کا کچھ ثبوت دیا ہے۔ اور وہاں چند ادبی انجمنیں ایسی بن چکی ہیں۔ جن کی علمی کوششیں ادب اردو کی تشویق و ترتیج میں معاون ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ تمام درس گاہوں کی وہ تمام ادبی انجمنیں جو ادب اردو کو زندہ رکھنے کے لئے قائم ہوئی ہیں۔ ان عام مجالس سے ممیز ہوں جنکی عنانِ انتظام شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح کالجوں کے مشاعروں کو بھی عام مشاعروں سے نسبتاً مرتفع اور بلند ہونا چاہئے۔

طلبا اور شاعری

یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ عوام اور طلبا کے مذاق شاعری میں حدِ امتیاز قائم رہے۔ طلبا میں شاعری کا مذاق ایک مستحسن اقدام ہے لیکن طلبا کی شاعری کا عام شاعری سے متوازن ہونا۔ کوئی قابلِ مسرت بات نہیں — وہ نوجوان جو تاریخ، فلسفہ، ادب، سیاست، اور اقتصادیات کے طالب علم ہیں۔ اگر فرسودہ اور جذباتی شاعری کے عادی ہوں تو ان کی شاعری خود مذاقِ تعلیم کے لئے سببِ توہین ہے میں تو زمانہ طالب علمی میں ملک کے نوجوانوں کو شاعری سے مجتنب رکھنے کا حامی ہوں۔ لیکن وہ نوجوان جنھیں ذوقِ شاعری فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے باوجود روک تھام کے شاعری سے الگ نہیں رکھے جاسکتے۔ خصوصاً اس نقطۂ خیال سے کہ شاعری تعمیر ذہن، اور توسیع معلومات کا ایک مہذب ذریعہ بھی ہے۔ اور مطالعۂ شعر، نصابِ تعلیم کا ایک جزو جمیل ہے۔ تاہم نوجوان طلبا کی شاعری اُن کے مبلغ علم کی ہمپایہ ضرور رہنی چاہئے۔

اگر آج کالجوں کے شاعروں کا معیار بلند کر دیا جائے۔ اور طلبا ضرورت زمانہ کے مطابق اپنی شاعری کا اسلوبِ معلوم بدل دیں تو مجھے یقین ہے کہ عام ملکی شاعری اور مشاعروں کی ہئیت کذائی

میں بھی ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ طلبا کو تقلید عوام کی ضرورت نہیں بلکہ شعل راہ بننے کی ضرورت ہے تاکہ عوام اُن کے علمی و ادبی انکشافات سے متاثر ہو کر خرافات سے محفوظ ہو جائیں۔

اب سے کچھ پہلے معیار شاعری قائم کرنا ملک کے کہن سال اور دیرمشق اساتذہ کا فرضِ ہمت تھا، لیکن جب سے شاعری ضروریاتِ زندگی کے دباؤ سے مغلوب ہو گئی ہے، اساتذہ فن کی توجہ اصلاح و ارتفاعِ کلام کی طرف بہت کم ہے۔ آج ملک نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے شاعری پر بھی اُن کا اقتدار و اختیار ہونا چاہیئے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ نوجوان طلبا اپنے علم اور معلومات کی مدد سے شاعری میں نیا انقلاب پیدا کر دیں۔ اور اپنی نظموں اور غزلوں کا معیار اتنا بلند کر دیں کہ عام ذہنیت کو اپنی کمزوری دلچسپی خود بخود محسوس ہونے لگے۔

یونیورسٹیوں کی ادب اردو سے بے اعتنائی

یہ کام یونیورسٹیوں کا ہے کہ وہ کالجوں کے ادبی شعبوں کی نگران رہیں اور ہر کالج کی ادبی مجالس کے لئے مفید لائحہ عمل بنائیں۔ آجکل تو یہ ہو رہا ہے کہ طلبا خود ہی مجالس قائم کرتے ہیں، خود ہی مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ خود ہی نظم و غزل کا ایک اسلوب مقرر کرتے ہیں۔ یونیورسٹیاں تو درکنار خود کالجوں کے علم دوست پروفیسر بھی اُن کے کاموں سے بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ اور اپنا وقار و پندار قائم رکھنے کے لئے اکثر اس قسم کے طالب علمانہ اجتماعات سے چشم پوشی کرنا اُن کا شعار ہو رہا ہے یہ طلبا کو دانستہ گمراہ کرنا ہے۔ اور رسمی مشاعروں یا مجالس کی اجازت دے کر اُن کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر احیائے ادب ضروری چیز ہے تو کالجوں کے پروفیسروں اور یونیورسٹیوں کے اربابِ حل و عقد کو کامل توجہ کے ساتھ طلبا کے جلسوں میں شریک ہو کر اُن کے طرزِ عمل کا محاسبہ کرنا چاہیئے اور انھیں بتانا چاہیئے۔ کہ وہ اس منزل میں کس طرح نمایاں اور حقیقی ترقی کر سکتے ہیں۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ کالج کے ڈراموں میں اور دوسری تفریحی مجالس میں کالج کے پروفیسر پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن اس نوع کی، ادبی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے لئے اُنھیں وقت نہ ہونے اور عدیم الفرصت ہونے کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ یہ بیگانگی اور ذہنیت کا اچھوتا پن

معلمانہ دیانت داری کے خلاف ہے۔

خصوصاً ادب اردو کی ترویج و توسیع کی طرف سے یونیورسٹیاں بہت زیادہ بے پرواہیں۔ اسلامیہ کالجوں کے اردو شعبے صرف طلبا کی زبردستی کے ممنون ہیں۔ یونیورسٹیوں کی یہ بے نیازی حامیانِ ادب اردو کے لئے ہمیشہ سبب فکر و غور رہی ہے۔ اور آج اس وقت تک اس الزامِ بے نیازی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں جب تک اردو کے شعبوں پر ان کی عملی توجہ کا یقین نہ ہو جائے۔

یونیورسٹیاں کیا کر سکتی ہیں؟

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں فی زمانہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو اور ادب اردو کے لئے کس طرح معاون و ممد ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور تعلیمی فضا میں انھیں جو درجۂ فائق اور منصب ممتاز حاصل ہے اُس کا اثر ادب اردو کی ترویج میں کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے؟۔

تعلیم میں اردو کی ضرورت بحیثیت مادری زبان کے

اردو کی عالمگیری و قبولیت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام ہندوستان کی اگر کوئی مشترک زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ اسی نقطۂ نگاہ سے یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم کو ملک کی مادری زبان میں رائج کرنے کا انتظام کریں۔ اور کلکتہ یونیورسٹی یا عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے لئے وزیرِ تعلیم اور دوسرے ادارہائے تعلیم کو برابر متوجہ کرتے رہیں یہ نہ صرف اردو کی بہترین خدمت ہوگی بلکہ فرزندانِ وطن کیساتھ بھی ایک قسم کی ہمدردی سمجھی جائے گی۔ اور وہ تعلیمی مشکلات جو غیر ملکی زبان کی تحصیل و تفہیم سے برابر عارض ہو رہی ہیں۔ دور ہو جائیں گی۔ ہمیں کسی غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں جھجک نہیں۔ لیکن ہم غیر ملکی زبانوں کو اساس تعلیم بنانا نہیں چاہتے۔ تاریخ، سیاست، جغرافیہ، اقلیدس، منطق، اصول، ہندسہ، فلسفہ، غرضکہ سب کچھ اپنی ہی زبان میں سیکھنا چاہتے ہیں۔ جب یہ تمام علوم ہمیں اپنی مادری زبان میں سکھائے جائیں گے۔ تو ہمیں ان کے استدراک میں بے حد آسانی ہوگی۔ اور ہمارا وقت اکتسابِ علوم میں اتنا ضائع نہ ہوگا جتنا کہ آجکل ضائع ہو رہا ہے۔

ہم انگریزی زبان میں مہارت کامل حاصل کر لینے کے بعد ایک کلرک اور ایک دفتری سے زیادہ کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم اپنی زبان میں متعدد علوم و فنون کا اکتساب کر لیں تو ہم اپنے ملک، حکومت، قوم، اور خود اپنے کام بھی آ سکتے ہیں۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی باعتبارِ قابلیت اردو و فارسی کے ایک ماہر کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہماری تمام دماغی قوتیں غیر ملکی زبان کے سمجھنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے میں صرف ہو جاتی ہیں اور ہم فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد اپنی طبعی کیفیات میں کوئی تھوڑی ارتقا محسوس نہیں کر سکتے۔

ان مشکلات کا حل صرف یہی ہے کہ تعلیم ملک کی مادری زبان میں ہو۔ اور اگر ملک کی یونیورسٹیاں متحد العمل ہو کر ہم آہنگ ہو جائیں تو اس کوشش میں کامیابی ناممکن نہیں۔

نصابِ تعلیم میں معیاری ادب کی ضرورت

اس کے بعد نصابِ تعلیم کی ناقص ترتیب ہے۔ نصابِ تعلیم آجکل صرف اس چیز کا نام ہے جو سفارش اور رعایت کے اجزا سے مرکب ہوتی ہے جس میں طلبا کا فائدہ بہت کم، اور واضعانِ نصاب کا مفاد بہت زیادہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کورس کی اکثر کتابیں جانبداری، اور سفارش کی سازشوں سے تیار اور منتخب ہوتی ہیں۔ جس پر مصنف، پبلشر، اور مصنف کے احباب اپنی مہریں ثبت کر کے سررشتۂ تعلیم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیم جو طلبا کی ضرورتوں سے تو واقف ہوتا ہے۔ لیکن اس سازش سے واقف نہیں ہوتا، چند متحد آوازوں سے مرعوب ہو کر اس ناقص نصاب کو نافذ کرنے کی منظوری دیدیتا ہے لیکن جب وہ نصاب طلبا کے سامنے آتا ہے تو عملاً ان کی فطری و اخلاقی تربیت کے لئے اسمیں کوئی زندگی نہیں ہوتی۔

اردو کی جو کتابیں نصابِ تعلیم میں آج داخل ہیں ان میں بیشتر ایسی ہیں جو کسی طرح ادبی معیار پر صحیح نہیں اترتیں، یہ فرض یونیورسٹیوں کا ہے کہ وہ اپنے اثر و ذرائع سے ان کتابوں پر تنقید و تبصرہ کا انتظام کریں اور جو کتابیں صحیح معیارِ ادب پیش نہ کر سکیں انھیں کالج کی چار دیواری سے باہر پھکوا دیں۔

ادبائے اردو کی ہمت افزائی

یونیورسٹیوں کا فرض یہ ہے کہ اپنے رسوخ و اثر سے ملک کے ادبا کو تدوینِ نصاب کی دعوت دیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

تاکہ طلبا کی عمر، ذہن، اور درجۂ تعلیم محفوظاً نظر رکھ کر اُن کے لئے ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو موجودہ اجتماعی ضروریات پر حاوی بھی ہوں۔ اور ادبی حیثیت سے اُنکا معیار بھی بلند ہو۔

ہمیں مغربی حکومت کے اقتدار کی اس برکت سے انکار نہیں کہ آج مذاقِ تعلیم عام ہے۔ لیکن تعلیم کے ناقص ہونے سے انکار کرنا بھی ایک ضمیری گناہ ہے۔ نقصِ تعلیم نقصِ نصاب پر مبنی ہے اور نقصِ نصاب کی ذمہ دار ناقص ادارت و تصنیف ہے۔ یونیورسٹیوں کو سررشتۂ تعلیم کی وساطت سے اس اساسی غلطی کی اصلاح کرنی چاہئے۔ نقصِ تعلیم خود بخود دور ہو جائے گا۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادبِ اردو کی ترقی و تعمیر میں مغربی تعلیم نے اس وقت تک کوئی محسوس حصّہ نہیں لیا۔ تاہم ہندوستان علم و فن کی برکات سے کسی زمانے میں بھی محروم نہ تھا۔ آج بھی ہندوستان کی قدیم درسگاہوں اور مکاتب میں تربیت یافتہ دماغ، عہدِ موجود کی درسگاہوں کی پیداوار سے زیادہ درخشاں اور کارآمد ہیں۔ "ادبِ اردو" چونکہ مغربی تعلیم کے ورود و نفاذ سے پہلے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اسکی اصلاح و تہذیب بھی پرانے دماغوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ لہذا اردو تصانیف کی تدوین و ترتیب کے لئے یونیورسٹیوں کو چاہئے کہ ماہرینِ علومِ مغربی کے ساتھ کام کرنے کے لئے مشرقی اسلوب پر تعلیم یافتہ اُدبا اور فضلا کو بھی آواز دیں۔ اور اُن کے اشتراکِ عمل سے فائدہ اُٹھائیں۔

مدیرانِ نصاب کی مردہ پرستی

اردو نصاب کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ غالب، میر، درد، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مومن وغیرہ کے کام اور کلام سے لبریز نظر آئے گی۔ بے شک یہ مرحوم قلمکارانِ وطن اس لحاظ سے قابلِ احترام ہیں۔ کہ اردو کی ابتدائی مشکلات انھیں کی توجہ سے حل ہوئی ہیں۔ لیکن صرف اُن کے کارناموں کو صدیوں دُہراتے رہنا، اور زندہ مصنفین کو مستقلاً نظر انداز کر دینا، کھلی ہوئی مردہ پرستی اور نمایاں حیات دشمنی ہے۔ ہر زبان کا لٹریچر ہر دور کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اردو کی جو صورت آج سے پچاس سال پہلے تھی۔ وہ اب نہیں رہی۔ ادبی و علمی تحقیق نے اُن فرسودہ روایات کو منسوخ کر دیا ہے جو ادبِ قدیم کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اسی طرح قدیم جذباتی، اور معاملاتی شاعری کی جگہ فلسفیانہ، اور تصوفانہ شاعری نے لے لی ہے۔ جو بات پہلے مقبول

تھی وہ آج مردود ہے۔ جو سکّہ آج سے سو برس پہلے رائج تھا وہ آج ٹکسال باہر ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ۱۹۳۲ء کے نصاب اردو میں بھی ۱۸۳۲ء کے رجحانات و خیالات طلبا کے سامنے پیش کرکر انھیں ایک صدی پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قدیم مصنفین و شعرا کو بالکل بھول جانا چاہئے۔ لیکن کیا ادبائے عہدِ حاضرہ قطعاً فراموش کردینے کے قابل ہیں؟ اور کیا اُن کا کام اور کلام اقتضائے وقت کے مطابق نہیں؟ پھر کیوں درسگاہوں میں صرف متقدمین کی پرستش ہوتی ہے اور عصرِ حاضرہ کے فضلائے ادب کیوں نظرانداز کردئے جاتے ہیں۔؟ خارجی دنیائے ادب اگر ادبائے متقدمین کی پرستش پیش رَو ہونے کی حیثیت سے کرتی ہے تو یہ اُس کا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن درسگاہوں کو تقلیدِ عوام کی ضرورت نہیں۔ اُن کی نگاہوں میں ماضی نہیں مستقبل ہونا چاہئے۔ اہلِ قلم اگر تلاش کریں تو موجودہ نسل کے شعرا اور ادبا میں بھی اکثر زندہ نفوس ایسے مل سکتے ہیں جن کا کلام ہر آئینہ موجودہ نسلوں کے سامنے پیش کرنا مفید ہوگا۔ مردہ پرستی ہندوستان کی ایک قدیم رسم جاہلانہ ہے۔ لیکن خداوندانِ تعلیم اور حامیانِ تعلیم کو اپنا نقطۂ نظر قدامت و جہالت کی فرسودہ پستیوں سے وسیع و رفیع رکھنا چاہئے۔ اور زندہ مصنفین کو بھی ادبائے سلف کے دوش بدوش نصابِ تعلیم میں جگہ دینی چاہئے۔

کالج کی لائبریریاں

ادبِ اُردو کے تحفظ کے لئے ملک کی لائبریریوں کو بھی صحیح معیار پر قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ کالج کی لائبریریاں بہ استثنائے چند مشہور اردو مصنفین کی کتابوں سے عموماً خالی ہوتی ہیں۔ انگریزی تعلیم کی برکات نے عریاں اور غیر مہذب مغربی لٹریچر ہندوستان میں بکثرت پھیلا دیا ہے۔ انھیں کتابوں سے کالجوں کی لائبریریاں بھی آلودہ نظر آتی ہیں۔ کالجوں کی لائبریریوں میں اُردو کی اگر کچھ کتابیں ملیں گی بھی تو لطائف بیربل اور چھبیلی بھٹیارن جیسی مخربِ اخلاق اور غیر مفید ہوں ں۔ اس کی ذمہ داری بھی کالجوں کے ذمہ داروں کی بے نیازی پر ہے جو اردو لائبریریوں کے لئے ایک معمولی رقم مخصوص کردینے کے بعد نہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ لائبریرین نے کون کون سی کتابیں لائبریری کے لئے منگوائی ہیں۔ نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی کالج لائبریری میں مستند اردو مصنفین کے کام کا کتنا حصہ ہے۔

کالجوں کی لائبریریوں کو بھی اپنی عظمت کے مطابق عظیم و رفیع ہونا چاہئے۔ اور ان میں ایسا منتخب لٹریچر مہیا کرنا چاہئے۔ جو طلبا کے لئے مفید اور علم دوست اہلِ شہر کے لئے قابلِ مطالعہ ہو۔

ہندوستان میں ہر اس چیز کا سانچہ بنا لیا گیا ہے۔ جو تمدن، تہذیب، اور عمرانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ لیکن ان سانچوں میں ڈھلنے والے مادے وہ نہیں ہیں جن کی ہمیں واقعی ضرورت ہو ڈھلنے والی چیز کمزور اور مواد ناقص ہے۔ تو سب سے پہلے ہم صحیح سامان اور مواد کیوں نہ پیدا کریں؟ تاکہ ہماری درس گاہیں، لائبریریاں، مشاعرے، نصاب غرضکہ ہر چیز مکمل اور مرتب ہو جائے۔

ہندوستان کا ہر تعلیمی و ادبی ادارہ بیش از بیش مفید ہو سکتا ہے۔ اگر اسے ضرورتِ زمانہ کے مطابق مفید سامانوں سے اور مفید طرائق کار سے بدل دیا جائے۔

کالجوں کے رسالے

رسمی طور پر کالجوں سے رسالے یا میگزین بھی شائع ہوتے ہیں۔ جن میں اکثر اردو، ہندی، اور انگریزی یعنی السنۂ ثلاثہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ لیکن میں بعض رسائل کو چھوڑ کر جو ادب اردو کی واقعی خدمت کر رہے ہیں، بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ کالجوں کے اکثر رسالے کسی حد تک بھی طلبا یا ان کے احباب کے لئے منفعت بخش نہیں ہوتے، اور کاغذ لکھائی، چھپائی میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے اس کا معاوضہ بھی واپس نہیں آتا۔

اگر یہ طریقہ رسمی ہے۔ تو یونیورسٹیوں کو چاہئے کہ اس رسم سے کالجوں کو پاک کر دیں اور اگر رسائل کی اشاعت کا کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے تو اس نتیجے تک انھیں پہونچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک کالج میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اگر اس کالج کے میگزین میں وہی مضامین بصورتِ ترجمہ شائع ہوں یا ان پر تنقید، یا ان پر محاکمہ، یا ان پر شرحیں، یا ان پر بحث و نظر کا انتظام ہو تو یہی رسالے نہ صرف طلبا کے لئے بلکہ کالج کی بیرونی فضا کے لئے بھی رحمت ہو سکتے ہیں۔ کم عیار غزلوں، ہوس انگیز نظموں، اور پھس پھسے مضامین کی اشاعت سے کالج کے رسائل کو ملک میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ وہ طلبا کے لئے کسی درجے میں بھی مفید ہو سکتے ہیں۔

کالجوں کے مشاعروں کا معیار

کالجوں کے مشاعروں میں بھی کوئی امتیازی شان ضرور ہونی

چاہئے، اس لئے کہ ان مشاعروں کی بانی و محرک تعلیمی فضا ہوتی ہے۔ مشاعروں کی اصلاح کا کام درس گاہوں کے شاعروں سے بخوبی ممکن شروع ہو سکتا ہے۔ بہتری صحبت، مخصوص شعرا کا اجتماع، مظاہرۂ تہذیب معیاری کلام، مفید موضوعات پر تقریریں، یہ چند باتیں کالجوں کے مشاعروں کو ممتاز کر سکتی ہیں۔ مناظموں اور مناثروں کو پوری قوت سے کامیاب اور مشاعروں سے زیادہ دلچسپ بنانا بھی کالجوں کا حق فائق ہے کالجوں اور ادبی جلسوں کا لائحۂ عمل یونیورسٹیوں کو خود بنانا چاہئے۔ اور ان میں اس قسم کی حدود قائم کرنی چاہئیں، جن میں علمی و ادبی خوبو پائی جائے۔

خاتمہ

میں معافی خواہ ہوں کہ میں نے اپنے عزیز دوستوں کا بہت زیادہ وقت تلخ اور غیر خوشگوار باتوں میں ضائع کر دیا۔ لیکن ان مشکلات کا اظہار جو آج ادبِ اردو پر مسلط ہیں، نہایت ضروری تھا۔ برسوں ایسے مواقع نہیں ملتے کہ ضروری شکایتیں ان لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں جو ان کی تلافی کے ذمہ دار ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ میری معروضات کا کوئی حصہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے گوشِ ناشنوا تک پہنچ سکے گا۔ پھر بھی خوش ہوں کہ میں نے یہ چند باتیں ایک ایسے مقام پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہہ دی ہیں۔ جو ایک مقامی یونیورسٹی سے متصل و ملحق ہے۔ اگر میری ایک گذارش بھی قابلِ پذیرائی سمجھی گئی تو میں اسے آج کے جلسے کی عملی کامیابی تصور کروں گا۔

بارہواں خطبہ

اُردو

مشاعرہ بزمِ اُردو لشکر (گوالیار)

۲۸۔ فروری ۱۹۳۲ء

چند لمحے ماضی میں حضرات ! اُردو زبان کے ماضیات پر اس قدر سیر حاصل اور توضیحی بحث ہو چکی ہے کہ اب اس کا اعادہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ تحصیلِ حاصل بھی ہے اُردو کب پیدا ہوئی ؟ کہاں پرورش پائی ؟ اور اُس کی ترویج میں مغل سلاطین وا کابر عہدِ ماضی نے کیا اور کتنا حصّہ لیا ؟ ان واقعات سے ہندوستان کی لائبریریاں گرانبار ہیں۔ اور ہر ادبی صحبت میں انہیں کو دُہرانا اب وجہ دلچسپی نہیں رہا۔

۶۰۵ھ سے ۱۳۵۲ھ تک ساڑھے سات سو سال میں تدریجی گر مسلسل مساعی کا نتیجہ ایک نئی زبان کی تعمیر و ترویج کے لئے جو کچھ ہونا چاہیے تھا ہوا۔ چھ سات صدیاں کسی زبان کی نشو و نما کے لئے کچھ کم نہیں ہوتیں۔ اس عرصۂ طویل کے بعد اُردو آج جس منزل پر ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

توضیحِ حال اُردو کی عامیت اور صوبجاتی گیرائی اُردو، عربی فارسی اور بھاشا کی ایک تخلیقی ترکیب اور ترکیبی نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان

بین الملکی تبادلۂ خیال میں آسانی پیدا کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت سے بہت قبل عربی اور ایرانی قبائل کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ بعثتِ اسلام سے پہلے دنیا کے دو ہی صنم خانے زیادہ عقیدت کش تھے۔ ایک صنم خانہ ہندوستان تھا۔ اور دوسرا مکہ۔ معتقدات کی یکرنگی کا تقاضا تھا کہ ان دونوں صنم خانوں کے پرستار باہم ملیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور سنسکرت کا اختلاط دنیا میں بہت قدیم ہے۔ جب اردو کی بنیاد پڑی تو اس اختلاط نے اس کی تعمیر میں مدد دی۔ اور اردو میں عربی، فارسی، کی طرح سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ بھی بے منت شریک ہونے لگے۔ ادہر تجارتی شعبوں میں اردو مصطلحات کی فراوانی ہوئی۔ اُدہر سیاسی، مذہبی، اور مجلسی سہولتوں کے لئے اردو اصطلاحیں وضع کی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر گوشے میں اردو بولی جانے لگی۔ اور چونکہ اردو عام اجتماعی ضرورتوں کی کفیل تھی۔ اس لئے عربی، ایرانی اور سنسکرت زبانیں اپنی اپنی جگہ محفوظ رہیں مگر اردو زبانِ عام ہوتی چلی گئی۔

ادہر سندھ اور پنجاب میں عربی قبائل کا قیام تھا۔ اُدہر دکن میں عربی فضلا موجود تھے۔ یوپی تو عربی و ایرانی تمدن کا مرکز ہی تھا۔ اردو نے چاروں سمتوں میں اپنی لہریں پھیلا دیں! یہ انھیں موجوں کا پھیلاؤ ہے کہ آج اردو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اردو کسی خاص صوبے کی زبان ہے۔

عربی اور سنسکرت زبانیں اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے بہت مشکل تھیں۔ فارسی زبان نے عربی زبان کی ممارست سے فائدہ اٹھایا۔ اور اردو نے فارسی سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس لئے صرفی دشواریوں میں بتدریج آسانی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جن زبانوں کا تعلق عہدِ عتیق سے جتنا قریبی ہے وہ اتنی ہی مشکل اور دیر فہم ہیں۔ اس حساب سے اردو چونکہ دنیا کی زبانوں میں سب سے آخری زبان تھی۔ اس لئے اسے آسان ہونا بھی چاہئے تھا۔ اردو کی عام فہمی اس کے آسان ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ آج بھی جو سیاح ممالکِ غیر سے دو چار سال کے لئے ہندوستان آتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی کوئی اور زبان سیکھ سکیں یا نہ سیکھ سکیں اردو میں انھیں بیش و کم مہارت ضرور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کی صوبائی تقسیم ایک سیاسی اور انتظامی حصار ہے۔ لیکن اس تقسیم سے اردو کی حدبندی نہیں ہو سکی۔ ذرائعِ آمد و رفت کی فراوانی اور سلسلۂ رسائل و رسائل نے تمام صوبوں کو اجتماعی حیثیت سے ایک کر دیا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام ڈاک خانوں کا محاسبہ کیا جائے تو مکاتیب میں زیادہ حصہ اردو مکاتیب کا نکلے گا۔ عام اس سے کہ وہ تجارتی ہوں یا ذاتی، پھر جس صوبے میں جائیے۔ اردو جاننے والے دوسری زبانوں کے ماہروں سے زیادہ ملیں گے۔ اور وہ لوگ بھی جنھیں اپنے ...دن میں صرف انگریزی یا کسی اور زبان سے کام پڑتا ہے اردو میں گفتگو کرنے پر مجبور نظر آئیں گے۔

اردو کس کی زبان ہے؟

گذشتہ بیس سال میں ایک غلط دور ایسا بھی آگیا تھا کہ مسلمان اردو پر حق مالکانہ قائم کرنے کی کوششوں میں معروف ہو گئے تھے۔
کوئی زبان کسی خاص قوم کیلئے کبھی نہیں بنتی بلکہ تمام ملک کیلئے بنتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولیات اردو کی پرداخت مغل سلاطین کے عہد میں ہوئی۔ لیکن اردو کی ترویج و استعمال میں حصہ گیر کسی زمانے میں بھی صرف مسلمان نہ تھے بلکہ ہندو، ایرانی، عربی، ترکی، اور تمام دوسرے ممالک کے رہنے والے جو اس وقت ہندوستان میں تھے۔ اردو زبان کے استعمال میں بطورِ مساوی سہیم و شریک تھے۔ فارسی حکومت کی زبان تھی لیکن رعیت کی زبان اردو تھی لشکر کی زبان اردو تھی۔ تاجروں کی زبان اردو تھی شاعروں کی زبان اردو تھی جن میں ہر قوم، ہر ملک، اور ہر مذہب کے آدمی ہوتے تھے۔ اس لئے کسی طرح بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ایک قوم کی زبان ہے۔ واضعانِ زبان نے وقتی مناسبت سے اس کا نام اردو رکھ دیا۔ جو خود ایک غیر زبان کا لفظ ہے۔ ورنہ اس کا صحیح اور حقیقی نام "ہندوستانی" ہونا چاہئے تھا۔ اردو فی الحقیقت ہندوستانی زبان ہے جو آج ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اردو ہندی کے غیر ضروری مباحث و مسائل کے سلسلے میں اصابتِ رائے نے مدت ہوئی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ میں اس اردو ہندی کے مسئلے سے بہت خائف ہوں اس لئے کہ اس قسم کا مقابلہ اور مجادلہ ملک کی زبانوں کو کمزور کر دینے کا خطرہ پیدا کرتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اردو کا نام "ہندوستانی" رکھ کر اس لسانی نزاع کو قطعاً ختم کر دیا جائے۔

مسلمانوں کی زبان اگر کوئی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ عربی ہے۔ اس سلئے کہ مسلمان حجازی النسل ہیں یا اس کے بعد انھیں فارسی نژاد کہہ لیجئے۔ یہ آپکی ذہنی تربیت کا ایک مظاہرہ اور ضرورت وقت کا اقتضا تھا کہ ہندوستان میں ان کے ورود سے ایک نئی زبان رائج ہو گئی۔ اور یہ اس زبان کی فطری خصوصیت تھی کہ وہ تمام ملک میں مقبول و مروج ہو گئی۔ مسلمانوں کی یہ خلاقی اس سے زیادہ صلہ کار کیا چاہتی ہے کہ جس زبان کی انھوں نے داغ بیل ڈالی تھی وہ مشترکہ کوششوں سے تمام ملک کی مشترکہ زبان بن چکی ہے۔ اس سے زیادہ ادعائے تفوق ایک سیاسی غلط اندیشی اور ایک اجتماعی گناہ ہے۔

اُردو زبان کے خصائص ہر وہ نئی چیز جو ضرورت زمانہ کے مطابق کسی صانع یا موجد کے ذہن سے تخلیق پاتی ہے۔ موخر ہونے کے لحاظ سے اختراع فائقہ کہلانے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ آپ ترقی کے جس شعبے پر نگاہ ڈالیں گے اس کی مثالیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی۔ جو سکے اب سے ایک صدی پہلے مقبول سکتے وہ آج متروک ہیں۔ اور اُن کی جگہ دوسرے نقوش سکوک نے لے لی ہے۔ جو طریقۂ تعلیم اب سے پچاس سال پہلے مکمل معلوم ہوتا تھا وہ آج اسکولوں اور کالجوں کی حدود سے نکال دیا گیا ہے۔ اور موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اطمینان نہ ہی قابل ترویج ضرور تسلیم کر لیا گیا ہے۔

یہی حال اُردو زبان کا ہے۔ جو دُنیا کی بہت سی زبانوں کے بعد بنی اور اُن سب سے آسان ہو دلنشین ثابت ہوئی۔ اُردو کی دلپذیر انشا' آسان املا' اختصار نویسی' اور سریع الفہمی سے کون انکار کر سکتا ہے؟۔ اُردو میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ایک ہمہ گیر زبان میں ہونی چاہئیں۔ ہر زبان میں لہجے اور طرزِ ادا کا ایک خاص اسلوب ہے۔ مگر اُردو کی طرزِ ادا سب سے زیادہ عذوبت و دلنشینی کی حامل ہے اس کا ایک لفظ "نہیں" اتنی اداؤں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ کہیں نفی کہیں اثبات' کہیں انکار اور کہیں اقرار کی متضاد کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ الفاظ کی کثرت' مرادفات کی فراوانی' تشبیہات اور صنائع بدائع کی زیادتی' محاکات کی وسعت' اشارات و کنایات کی ارزانی سے اُردو زبان میں تقریر و تحریر کی بیش از بیش آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اُردو املا اور انشا اُردو کے حروف تہجی عربی اور فارسی زبانوں کے حروف تہجی پر

مشتمل ہیں۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کی ہیئتِ ترکیبی میں عربی و فارسی زبانوں کو زیادہ دخل ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہندی بھاشا کی صرفی خصوصیات بھی اُردو کے قاعدۂ تلفظ میں خود بخود آجاتی ہیں۔ اردو، عربی اور فارسی کی طرح سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہے۔ اور الفاظ کی کشش اور دوائر میں یہ عربی سے کم اور فارسی سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ لیکن انشائے اُردو میں بھاشا کے وہ تمام الفاظ کم و بیش سموئے ہوئے ہیں جو اس زبان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بھاشا کے ہزاروں الفاظ آج بے تکلف اُردو میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ بنابریں یہ امتیازی خصوصیت اُردو ہی میں پائی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اور یہ اُسکی صلاحیتِ انجذاب ہے کہ اس نے ابھی نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت مغربی حکومت کے اقتدار میں بسر کی ہے لیکن مغربی لغت کے سینکڑوں الفاظ ہند ہو کر اردو میں ایسے سما گئے ہیں کہ گویا وہ اُسی کے الفاظ تھے۔ اور پھر یہ نئے الفاظ کچھ اس طرح شریکِ زبان ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کا ہر اُردو داں بچہ بغیر تکلف اُنھیں صحیح مفہوم کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً۔ بٹن۔ گلاس۔ کاپی۔ پینسل ٹکٹ۔ پن۔ ہینڈل۔ کارڈ۔ سائیکل۔ موٹر۔ پریس۔ بکس۔ سوٹ کیس۔ کوٹ۔ پتلون۔ ویسٹ کوٹ سوڈا واٹر۔ بسکٹ۔ لیمپ۔ فوٹو۔ کلینڈر۔ ریل۔ اسٹیشن وغیرہ وغیرہ۔

مصطلحاتِ اُردو

ہر زبان میں اصطلاحات کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ جو اُسی زبان کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ اور دوسری زبان میں مروج ہو کر باوجود کثرتِ استعمال الگ نظر آتی ہیں۔ اُردو کی ذاتی مصطلحات تو خیر موجود ہی ہیں مگر اُردو کی یہ صلاحیت بھی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ دوسری زبان کی اصطلاحوں کا جب اس میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ اُردو ہی کی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ غیر زبانوں کی مصطلحات کا ترجمہ، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن ایک مدتِ طویل سے کر رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں فلسفہ، ہیئت، سائنس اور ہندسے کی بعض مفید کتابوں کا ترجمہ دفترِ اُردو میں ایک منفعت بخش اضافہ ہے۔ غیر زبانی مصطلحات کو اُردو میں ڈھالنے کا کام اور بھی آسان ہو سکتا ہے اگر وضعِ اصطلاحات میں عربی فارسی الفاظ کو زیادہ دخیل نہ کیا جائے اور ترجمہ عام فہم اُردو میں ہو۔ مثلاً "ستارٹ کٹ" کا ترجمہ "راہچہ" بالکل درست ہے۔ لیکن "تنگ ڈنڈی" جو پہلے سے اُردو بھاشا میں

موجود ہے اگر اسی کو رواج دیا جائے تو کیا برائی ہے۔ ہمیں اب بھی مصطلحات سے زیادہ مرادفات کی ضرورت ہے۔ جس زبان میں مرادف الفاظ جس قدر زیادہ موجود ہوں گے۔ وہ زبان اتنی ہی آسان ہو جائے گی۔ خصوصاً بہرۂ ادب و شعر میں مرادفات کی بہت مانگ ہے۔

قوتِ انجذاب

اردو زبان میں قوتِ انجذاب بھی بحدِ اتم موجود ہے۔ اردو میں دوسری بانوں کے الفاظ مل جل کر بالکل اردو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر غیر ملکی علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم محض اس لئے اردو میں نہیں ہوتے کہ ان کی اصطلاحات کا ترجمہ عام فہم نہیں ہو سکتا تو ایسی مصطلحات کو اپنی اصلی صورت میں علیٰ حالہٖ قائم رکھ کر بھی کتابوں کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور غیر زبانوں کی مصطلحات اردو زبان میں گھل مل کر اردو مصطلحات بن سکتی ہیں۔ کثرتِ استعمال اور تواتر ترویج اس قسم کی لفظی و صوتی ثقالتوں کو خود بخود دور کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ حیلہ تراجم علوم و فنون کے لیے قابل پذیرائی نہیں کہ اُن کے مصطلحات کا ترجمہ مشکل ہے۔ یہ تو اردو زبان کی قوتِ انجذاب سے انکار کرنا ہے حالانکہ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی قوت ایک فطری وصفی ودیعت ہے

اردو بحیثیت اخباری زبان کے

آج ہندوستان میں بیشتر اخبار و رسائل اردو میں شائع ہوتے ہیں جو اخبارات کسی خاص سوسائٹی کے مفاد و عواطف کی ترجمانی کرتے ہیں اُن کی زبان بھی اردو ہے۔ اُن کے ایڈیٹر' اور نگراں' مجبور ہیں کہ اردو میں اظہارِ خیال کریں صرف اس لئے کہ اخبار بین طبقے میں ۹۰ فیصدی اردو داں اور اردو فہم ہوتے ہیں۔ اخباروں کے علاوہ رسائل کا بھی یہی حال ہے۔ صرف صوبۂ بنگال اور صوبۂ گجرات میں بنگالی اور گجراتی اخباروں کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ صوبے گو بین القومی اجتماعیت سے محروم نہیں تاہم بلحاظ قومیت ان میں گجراتی اور بنگالی بولنے والوں کا عنصر زیادہ ہے۔ مگر آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ ان کی زبان کے مراکز میں بھی اردو اخبارات کافی موجود ہیں اور مزید اخبارات کے لئے ہنوز گنجائش باقی ہے

اردو ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ اس کے ثبوت میں اُن ہندو شعرا اور انشا پردازوں کے کارنامے پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا کوئی ایک کام ہندی میں موجود نہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم

رتن ناتھ سرشار، نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی کے علاوہ لاتعداد کشمیری شعرا ایسے ہیں جن کی شہرت اور قبولیت صرف اُن کے اُردو کلام سے وابستہ ہے۔ وہ اُردو میں ویسا ہی شعر کہتے تھے اور کہتے ہیں جیسا کہ ایک مسلمان شاعر کہہ سکتا ہے، اس لئے کہ زبان "زبان" ہے مذہب نہیں۔ جس میں معتقدات کی کمی و زیادتی سے ادائے فرائض میں کمی محسوس ہونے لگے۔

اُردو زبان کی علمی حیثیت: حکومت نے سیاسی مصالح کی بنا پر انگریزی زبان کو لازمی تعلیمی زبان بنا دیا۔ بہت اچھا کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آج سرکاری دفاتر میں انگریزی حکومت کا کاروبار کون کرتا؟ اور یورپ میں زبان جاننے والوں کی کھپت کہاں تک ہندوستان پہونچائی جاتیں؟۔ لیکن تعلیمی مشکلات کی روز افزوں فریادوں نے اب اس حقیقت کو بے حجاب کر دیا ہے کہ ملک کی مادری زبانوں پر قائم نہ ہونے سے تعلیم گراں ہوتی جارہی ہے۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، کالجوں کے پروفیسر، اور وزرائے تعلیم سب متفق علیہ ہیں کہ طلبا کی تعلیمی اساس مضبوط کرنے کے لئے غیر زبانیں غیر مناسب ہیں۔ اُردو کو اساسی حیثیت ضرور ملنی چاہئے۔ سب سے پہلے یہ احساس عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو ہوا۔ چنانچہ آج حیدرآباد کے تمام اداروں میں اُردو تعلیمی زبان ہے۔

ابھی الہ آباد میں آنریبل سرتیج بہادر سپرو بالقابہ سے اسی مسئلے پر گفتگو تھی۔ موصوف نے فرمایا کہ اگر اُردو کو تعلیمی زبان بنا دیا جائے تو کیا اس میں علوم و فنون کے تراجم اتنے موجود ہیں کہ طلبا کو غیر زبانوں کی کتابوں سے بے نیاز کر دیں؟ میں نے عرض کیا اُردو کا خزانہ ابھی تو بہت معمور ہی۔ لیکن اگر ضرورت ہوئی تو صرف ایک سال کے عرصے میں تمام علوم و فنون کا ترجمہ اُردو میں کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، آج ہندوستان میں اُردو ادب کے ماہر، فضلا اور ادبا اس قدر موجود ہیں کہ اگر تراجم و تصانیف کی خدمت اُن کے سپرد کی جائے تو وہ برسوں کا کام مہینوں میں انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن انھیں یقین ہونا چاہئے کہ اُن کی یہ محنت فرزندانِ وطن کے لئے ہے۔ کتب فروشوں

پریسوں، اور لائبریریوں کی الماریوں میں مقید کر دئے جانے کے لئے نہیں ہے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ اول تو اردو میں 'فلسفہ' 'تاریخ' 'جغرافیہ' 'ادب' 'سیاست' اور 'حساب' کی مستند کتابیں پہلے ہی موجود ہیں۔ لیکن اگر اردو کو تعلیمی زبان قرار دے دیا جائے تو ایک سال کے اندر تمام علوم کی کتابیں اردو میں بہ آسانی تبدیل و تحلیل کی جا سکتی ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو علمی زبان بھی ہے۔ اور اس میں علم و ادب کی ترجمانی کی قوتیں بھی تمام تر موجود ہیں۔

اردو کا تجارتی وزن

ملک کے تمام تجارتی شعبوں میں اردو کا وزن ہمیشہ سے ہے اعداد و شمار کے لئے اس میں علامات موجود ہیں۔ پیمانوں کے نام موجود ہیں رقموں اور رقومات کے لئے طریقۂ حساب موجود ہے۔ بہی کھاتے اردو میں بھی لکھے جاتے ہیں۔ ناپ و تول کے اوزان اردو میں مرتب ہیں۔ تجارتی اصطلاحات سے اردو کا خزانہ خالی نہیں۔ علم الحساب اردو میں موجود ہے۔ اور کاروباری مکاتیب اردو میں برابر لکھے پڑھے جاتے ہیں۔ بازاروں اور منڈیوں میں تمام متعلقات تجارت پر اردو میں تبادلۂ رائے ہوتا ہے۔ علم الاقتصاد زبانِ اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ عام طور پر تاجروں کی زبان اردو ہے تمام اشیا کے اسما بھی اردو میں ہیں۔ غرض کہ اردو زبان تجارت کی سہولتوں کو وسیع کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور تجارت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اردو کا پلہ بھاری نہ ہو۔

اردو اور سیاست

اردو کے اہلِ قلم اور اہلِ زبان سیاست میں بحد کافی درک و شعور حاصل کر چکے ہیں۔ اور سیاسیات پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ممتاز اردو اخبارات میں سیاست کی موشگافیوں اور ان پر بحث و نظر کا سلسلہ جاریہ کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ وکلا اور بیرسٹر جب اردو میں بحث کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گلیڈ اسٹون اور چرچل اردو بول رہے ہیں۔ بعض عدالتیں جب اردو میں تجویز و فیصلہ لکھتی ہیں تو پارلیمنٹ کے فیصلوں سے ان کا پایۂ انشا کم نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈر جب پلیٹ فارم پر پالیسی اور ڈپلومیسی کا فرق و امتیاز دکھاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست اردو زبان کی کنیز ہے اور اردو صرف سیاسی گتھیاں سلجھانے ہی کے لئے وضع ہوئی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ ایک پروردۂ آغوشِ اُردو ڈپٹی کلکٹر کی عدالت میں دو صرف اُردو داں وکیل جب انگریزی میں بحث کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اس کی تمام محفوظ یادداشتیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ اُردو میں ایک ایسا فقرہ کہہ دیتا ہے جس سے عدالت متاثر اور حاضرینِ عدالت مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سیاست جو بجائے خود ایک طلسمِ استعمار اور ایک چیستانِ حکومت ہے اردو کے شکنجے میں آکر اتنی سلجھ جاتی ہے کہ اس میں پالیسی کا کوئی عقدۂ لاینحل باقی نہیں رہتا۔

اگر اردو میں سیاست کی تحلیل نہ ہو جاتی تو یہ سینکڑوں اُردو داں خداوندانِ عدالت مغربی سیاست کو سمجھ کر اُس کے مطابق دستوری و دفتری حکومت کے لئے کیونکر مفید ہو سکتے تھے؟

قانون کی تمام کتابیں اور قانونی اصطلاحات اُردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ بعض اُردو کی قانونی مصطلحات ایسی بھی ہیں جو بجنسہٖ انگریزی میں موجود ہیں اور اُن کیلئے کوئی انگریزی مرادف موجود نہیں۔

اُردو اخباروں کے بعض سیاسی شذرے دفتری حکومت کے اعیان و اعمار کے لئے بہترین مشیر ثابت ہوتے ہیں۔ اور بعض اُردو تقریریں سیاست کی گہرائیوں کو اس قدر آشکار کر دیتی ہیں کہ قانون اگر مقرر کی زبان کاٹ لینے کا فتویٰ نہیں دے سکتا تو کم سے کم زبان بندی کا حکم تو صادر کر ہی دیتا ہے۔

اردو اور شاعری

میرے خیال میں تو اُردو کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی ہو گی۔ اور بابر نے یہ شعر

مجکانہ ہوا کچ ہوسِ مانک دھوتی ہا　فقرا ہلبنہ بس غلو سہ پانی در دو تی۔

کسی ہندی کبت سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہو گا۔ صورتِ حال جو کچھ ہو، اُردو زبان کی تشکیل کے بعد شاعری اور اُردو کا چولی دامن ایک دوسرے سے وابستہ رہا ہے اور اُردو کی ترقی کیساتھ شاعری بھی ترقی کرتی رہی ہے زمانہ جن مدارج و منازل سے گذرا، اُردو شاعری کو بھی اُنھیں سے گذرنا پڑا۔ اُردو شاعری نے انبساط و طرب کی محفلیں بھی دیکھیں اور بساطِ عیش کی ویرانیاں بھی، یہی سبب ہے کہ خوشی اور غم بیک وقت اُردو تغزل میں پائے جاتے ہیں۔

اُردو شاعری نے یہاں تک قبولیت حاصل کر لی کہ بیدل اور نعمت خاں عالی جیسے فارسی کہنے والے

شعرا نے بھی اُردو میں غزلیں کہیں۔ ہر دور میں شعرا کی تعداد بڑھتی رہی۔ اور جس زمانے میں جو محاورات اور نئی اصطلاحات اِس زبان نے اختراع کیں شاعری نے انھیں آنے والی نسلوں کیلئے فوراً محفوظ کرلیا۔

اُردو شاعری نے وہ تمام خصائص رفتہ رفتہ جذب کرلئے جو سنسکرت، عربی اور فارسی شاعری کا فرداً فرداً سرمایۂ امتیاز تھے۔ متاخرین نے متقدمین کی تقلید کی۔ میرؔ جادۂ شعر و سخن کے میر کارواں مانے گئے اور غالبؔ فلسفۂ حیات کے پیمبر۔ اور آخر دورِ موجودہ میں اُن کی تقلید و ہم آہنگی نے ہر شاعر کو میرؔ و غالبؔ بنا دیا۔

اُردو کی تصنیفی قوتیں

جس طرح اُردو شاعری ہر زمانے میں ترقیٔ زبان کے دوش بدوش رہی اسی طرح ذوقِ تصنیف و تالیف بھی برابر بڑھتا رہا۔ نثر اور نظم میں مصنفین اُردو نے بیش بہا جواہر اُردو کے خزانے میں جمع کر دئے۔ اور موجودہ دور کو تو اگر تصنیفی دور کہدیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ آج اُردو میں مختلف موضوعات پر لاکھوں کتابیں موجود ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب، معیاری ہیں۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے مصنفین نے اپنی قوت و لیاقت کے مطابق اُنھیں مرتب کیا ہے۔ اور اُن میں فیصدی ۵۰ کتابیں قطعی معیارِ ادب پر صحیح اُترتی ہیں۔ ہمارے اہلِ زبان میں تصنیفی قوتیں بے انتہا موجود ہیں لیکن تصانیف کی ناقدری نے انھیں بددل کر دیا ہے۔ آج کوئی سوسائٹی ایسی نہیں جو اُردو مصنفین کے لئے حوصلہ افزا ہو۔ تاہم مصنفین کی کثرت اور اُردو کی تصنیفی قوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اُردو میں تاریخ و سیرۃ نگاری

اُردو میں تاریخی مواد بھی بحدِ کافی موجود ہے۔ تاریخ میں تحقیقی مضامین کی بھی کمی نہیں۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں اُردو مصنفین کی موضوعاتِ تاریخ پر دستیاب ہوسکتی ہیں۔ لیکن نصابِ تعلیم میں انگریز مورخین کا غلبہ ہے۔ اور اُردو مورخین کی آواز دبا دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ سیرتیں اور تذکرے جتنے اُردو زبان میں مل سکتے ہیں شاید ہی کسی زبان میں مل سکیں۔ قدیم سیاحوں کے سفرنامے۔ ایران و عرب کی تاریخیں۔ شام و عراق کی تاریخیں، اور ہندِ قدیم کے حالات اُردو زبان میں تفصیل و توضیح کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اور اُردو تاریخ نویسی کو

دوسری زبانوں سے زیادہ اعتبار و استناد حاصل ہے۔

اُردو کا اخلاقی استحکام

زبانِ اُردو نے ملکی اخلاقیات پر نمایاں اثر کیا ہے اور تعمیرِ سیرۃ میں قابلِ احساس حصہ لیا ہے۔ اخلاق کی جتنی کتابیں فارسی میں تھیں اُن سب کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے۔ مجلسی و اجتماعی تہذیب میں اُردو زبان کی کارفرمائی کا آج کون قائل نہیں؟ تمدن کے تحفظ میں، معاشرت کے رکھ رکھاؤ میں، اخلاق و سیرۃ کی تعمیر میں، آداب و آئین کی تشکیل میں، تقریر و گفتگو کے اسالیب میں، اُردو نے وسیع الاثری سے حصہ لیا ہے۔ علم النفسیات سے بھی اُردو کا دامن خالی نہیں۔ طبیعیات اور ہیات میں بھی اُردو ایک تجربہ کار معلّم کی طرح شریک درس ہے۔ اور تصوف کی تعلیم تو اُردو کا حصہ فالقیاس ہے اس موضوع پر جتنی کتابیں اُردو میں لکھی گئی ہیں کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوئیں۔ ان تصانیف کی ارزانی نے اُردو دان نسلوں کی اخلاقی حالت پر بہت اچھا اثر کیا ہے۔

اُردو کا مذہبی اقتدار

آج حدیث و فقہ اُردو میں موجود ہے۔ مشکوٰۃ و بخاری کے تراجم اُردو میں ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید کے بیسیوں ترجمے آسان اُردو میں موجود ہیں۔ اسوۂ و مواعظ سے لبریز کتابیں اُردو کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اہم اور ضروری مواعظ کا ذخیرہ اتنا کسی اور زبان میں نہیں ہوتا جتنا اُردو میں ہو سکتا ہے۔ عربی اور فارسی کے فضلا اُردو میں درس دیتے ہیں۔ دینیات کی کتابیں اُردو میں بکثرت ملتی ہیں۔ شریعت و طریقت کی تعلیم کا انتظام اُردو میں ہے۔ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کو اُردو میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ ویدوں اور شاستروں کے ترجمے اُردو میں موجود ہیں مذہبی مناظرے اور مباحثے اُردو میں ہوتے ہیں۔ غرض کہ مذہب کی کوئی شق کیوں نہ ہو۔ اُردو بہ ہر نہج ترجمانی و تدوین میں کامیاب ہے۔

اُردو کی بین الاقوامی حیثیت

یہ معلوم کرنا حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان کی کوئی قوم کیوں نہ ہو اور اُس کی مادری زبان جو کچھ ہو مگر اُردو سمجھنے اور تھوڑی بہت بولنے میں قاصر نہیں۔ ایک اُردو جاننے والا اپنا مقصد نہایت آسانی سے سمجھا سکتا ہے۔ اور سننے والا سمجھ سکتا ہے۔

میں نے بعض یورو پین لوگوں کو بھی انگریزی لہجے میں اُردو بولتے سُنا ہے۔ بلکہ بعض فوجی نوجوانوں کو بھی جو یورپ میں پیدا ہوئے۔ یورپ میں بڑھے، اور پھر یورو پین فوج میں داخل ہوکر یورو پین ماحول ہی میں زندگی بسر کی، ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے سُنا ہے اس کے برعکس سول سروس سے متعلق یورو پین حکام کو اُردو دانستہ سکھائی جاتی ہے اور وہ اسے بڑے شوق کے ساتھ سیکھتے ہیں۔

اتحادِ زبان کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقدین اُردو بولتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ متکلم مسلمان ہے یا عیسائی۔ یہودی ہے یا ہندو۔ ادھر مغربی تعلیم نے لباس کی مغایرت دُور کر دی ہے اُدھر اتحادِ زبان نے زبان کی تفریق مٹادی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتحادِ لسانی ہی ایک دن بین الاقوامی اتحاد کی تمہید بننے والا ہے

اُردو کے مستقبل پر ایک نظر اس بحث و تجزیہ و توضیح سے ظاہر ہو گیا کہ اُردو زبان عہدِ موجودہ کی ایک عالمگیر، علمی، تعلیمی، تجارتی، سیاسی، ادبی، اور تاریخی مکمل زبان ہے۔

آثار و قرائن اُردو کے مستقبل کو ہماری نگاہ میں بے حد درخشاں بنا دیتے ہیں۔ اور ہم اس نقطۂ نگاہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں۔ کہ اُردو مشترکہ زبان ہونے کے بعد اب بہت جلد السنۂ عالم میں روح الالسنہ بن جانے والی ہے۔

اُردو کے مستقبل کو زیادہ تابناک اور مستحکم بنانے کے لئے حسبِ اقتضائے وقت تین چار باتوں کی اشد ضرورت ہے۔

(۱) اُردو کو تعلیمی اساس بنانے کی مسلسل کوشش کی جائے۔

(۲) جو علوم و فنون اردو میں ہنوز منتقل نہیں ہوئے ہیں انھیں اُردو میں منتقل کر لیا جائے۔

(۳) اُردو کا نستعلیق ٹائپ جلد از جلد مروج کر کے ہر پریس تک پہونچا دیا جائے۔

(۴) اُردو کی اصلیت اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک باضابطہ مجلسِ اُردو قائم کر دی جائے۔ تا کہ اسالیب و محاورے کے تحفظ و احیا کی جانب سے اطمینان ہو جائے۔

ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ اردو کا ماضی جو کچھ ہو، حال بہر حال خوش آئند ہے۔ تعلیم جس قدر قوت حاصل کرتی جائے گی اردو زبان اتنا ہی فروغ مزید حاصل کر سکے گی۔ خصوصاً جب اردو اساسِ تعلیم ہو گی۔ تو پھر اس میں جامعیت و اکملیت کا فقدان مطلقاً محسوس نہ ہوگا۔

اردو نظموں کی ترویج سے نظم گوئی کو تقویت پہونچے گی۔ اور قدیم رنگِ تغزل کا دائرہ خود بخود مختصر ہو جائے گا۔ تصنیفی قوتیں اگر منظم ہو گئیں اور ان سے بہ اندازۂ قوت کام لیا گیا تو اردو مصنفین مغربی مصنفین سے کہیں زیادہ فائق و ممتاز نظر آنے لگیں گے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو اداروں کو وسعت دی جائے۔ اور ادبائے ملک اپنی بیگانہ وشی کی ادائیں چھوڑ دیں تو تعلیمی ماحول میں اردو کی دلچسپیاں ان کے اشتراکِ عمل سے دوبالا ہو سکتی ہیں۔

یہ اندیشہ غلط ہے کہ اردو مٹائی جا سکتی ہے۔ کہیں کوئی زبان اس قدر ہمہ گیر اور وسعت پذیر ہونے کے بعد مٹا کرتی ہے؟ زبان کی زندگی قوم و ملک کی زندگی کے ساتھ ہے۔ گر مجھے اردو کی حیاتِ جاودان پر اتنا بھروسہ ہے۔ کہ اگر استدادِ ایام موجودہ قوم و ملک کو کسی طرح مٹا دینے پر قادر ہو بھی جائے اور ہندوستان کا کرۂ ارضی بالکل پلٹ جائے تو بھی اس پر عبرت و افسوس کا جو مرثیہ پڑھا جائے گا۔ اُسکی زبان "اردو" ہو گی۔

تیرہواں خطبہ

درباری مشاعرہ منعقدہ درگاہِ حضرت شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ نائی منڈی آگرہ

۲-مارچ ۱۹۳۴ء

میرے بزرگو اور دوستو!

جس جلیل القدر دربار کی آستانہ بوسی ہمیشہ میرے لئے سبب فخر و مباہات رہی ہے، اس دربار کی مجلس شاعرہ میں آپ نے مجھے تختِ صدارت پر عزت دے کر جو افتخار عطا فرمایا ہے میں اس کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔ میں نے اس دربار میں بیسیوں مشاعرے شعرائے متقدمین اور شعرائے موجودہ کے ساتھ پڑھے ہیں۔ اسی مقدس فضا میں سخنورانِ اکبر آباد کی دل نشیں اور پُر اثر انگیز صدائیں بارہا گونجی ہیں۔ مرزا خادم حسین رئیس اکبر آبادی، حضرت مولانا نثار اکبر آبادی، حضرت مولانا راسخ اکبر آبادی، شیخ بزرگ علی عالی اکبر آبادی، مرزا افضل حسین فلک اکبر آبادی، اور میاں نظیر اکبر آبادی۔ گو آج ہم میں موجود نہیں، مگر ان کے نغمے آج بھی اس دربار کی معصوم فضاؤں میں محفوظ ہیں۔ یاد فرمائے گا ہر درباری مشاعرے میں میں نے صاحب دربار سیدنا حضرت مخدوم علاؤالدین مجذوب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی روحِ مقدس کو ان نغموں اور ان الہامی نواؤں کی طرف متوجہ پایا ہے۔

حضرات! میں آج اپنے خطبے میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ اس مرکزِ روحانیت یعنی "یعنی اجمیر شریف" میں کتنے مشائخ اور صوفی ایسے گذرے ہیں جو خود شاعر تھے اور جنھیں شعر و ادب سے بطورِ خاص دلچسپی تھی۔ ان حقائق کی موجودگی میں آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر مشائخ و صوفیا کے وصال کے بعد ان کی درگاہوں اور مزاروں پر مجلس شعر و ادب کا انعقاد ہو تو ان کی روحیں اپنے محبوب حیات ذوقِ شعری کے احیاء سے کیوں مسرور نہ ہوں گی؟۔

اربابِ طریقت اور شاعری

میں تمہیداً پہلے یہ بتا دوں کہ دنیائے تصوف کے سب سے پہلے موسس، اسد اللہ الغالب حضرت علی ابنِ ابی طالب کرم اللہ وجہہ بھی شاعر تھے۔ آپ کے بعض اشعار عربی زبان اور عربی تاریخِ ادب میں آج تک محفوظ ہیں۔ سیدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی وفاتِ رسالت مآب پر ایک مرثیہ کہا تھا۔ جو ان کے نام سے یادگار ہے آپ کی نسل سے سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام بھی شاعر تھے۔ اور ان کی یادگار باقی طریقت و تصوف کے معلم اول حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شعر کہتے تھے۔ اُن کا یہ قصیدہ بہت مستجاب اور مقبول ہے۔

اِنْ نِلْتِ یَا رِیْحَ الصَّبَا یَوْمًا اِلٰی اَرْضِ الْحَرَمِ
بَلِّغْ سَلَامِیْ رَوْضَۃً فِیْهَا النَّبِیُّ الْمُحْتَرَمُ

آپ کے بعد آپکی اولاد امجاد میں بھی اکثر ائمہ و مجتہدین ذوقِ شعرگوئی کے مائل تھے۔ چنانچہ شیخ عبد القادر محی الدین جیلانی بغدادی امام سلسلۂ قادریہ کے قصائد آج بھی نہ صرف مقبول بلکہ سلسلۂ قادریہ میں شریکِ اوراد و وظائف ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری کا پورا فارسی دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ مولانا جامیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ، مولانائے رومؒ، سعدیؒ شیرازی، نظامیؒ گنجوی، اپنے عہد کے ایسے شاعر تھے کہ اُن کا نام آج اُن کے مولد و وطن سے زیادہ ہندوستان میں زندہ ہے۔ تصوف، اور الٰہیات میں اُن شعرائے متصوفین کے کلام نے جو زندگی پیدا کر دی ہے۔ اُس کے اثرات

ہمارے قلوب اور دماغوں سے کسی طرح مٹائے نہیں جا سکتے۔

اگر تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو ایسے ہزاروں نفوسِ گرامی کا نام ہمیں مل سکتا ہے۔ جن کا مشغلہ طریقت اور تعلیم شاعری تھی۔ میں اس وقت اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا اور صرف یہی بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ خود آپ کے شہر میں کتنے مشائخ اور صوفیا ایسے آسودۂ خواب ہیں جن کی زندگی کی محفلیں ادب و شعر کے نغموں سے گونجتی تھیں مگر آج اُن کے مزاروں پر کوئی بھولے سے غزلخواں بھی نہیں ہوتا۔

آگرے کے صوفی شعرا

سلسلۂ ابو العلائیہ کے بانی امیر سیّد ابو العلاؒ رحمۃ اللہ علیہ شاعر تھے۔ ایک رسالہ مختصر جو مسائل نماز تقاریر مشتمل ہے آپ کی تصنیف سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ چند مکتوبات اور ایک مختصر سا دیوان بھی آپ کی یادگار ہے۔ آپ کے ذوقِ ادب و شعر کا ایک ادنیٰ نظاہرہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب آپ پر فالج گرا تو آپ باوجود علاج و تدبیر مدتوں اسکی تکلیف میں مبتلا رہے خصوصاً وضو یا طہارت کیوقت آپکو بیحد تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن اسی حالت میں آپ نے یہ بیت پڑھنی شروع کی۔

در دمِ ایلِ داست دردمان نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

اس شعر کے متواتر پڑھنے سے آپ پر دفعتاً حالتِ وجد طاری ہو گئی۔ اور گرمیٔ وجد سے تمام اعضا کھل گئے۔ یہاں تک کہ فالج کا کوئی اثر آپ کے جسم پر باقی نہ رہا۔ یہ ہے شعر کی روحانی قوت کا اثر۔ علم الطبعیات کے ماہرین کا یہ ایک متفقہ فیصلہ ہے کہ جو مرض کسی دوا سے زائل نہ ہو اُسے طبعی رجحان، شعر و موسیقی سے قطعاً زائل کر سکتا ہے۔ سیّدنا ابو العلاؒ کا سالِ وفات ۱۰۶۱ھ ہے۔

(۲) مولانا ابو اجد فارغیؒ نے جن کا مزار حنا بازار موضع کچھ پورہ میں مسجد ہمایوں کے ماحول میں ہے اپنی درویشی اور کمالاتِ تصوف کو ہمیشہ پردۂ شاعری میں پوشیدہ رکھا۔ آپ کی طبیعت میں ذوقِ شعری سے بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھی۔ آپ شیخ زین الدین معمائی کے رفیق تھے۔ اور انھیں کے ساتھ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ جب یہ دونوں کابل سے روانہ ہوئے تو لکھتے نقل ہے کہ ان کے پاس ایک کہنہ پوستین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ شیخ زین الدین نے کہا کہ اس پوستین

کو فروخت کر کے کچھ زادِ راہ ساتھ لے لینا چاہیے۔ اور مولانا فارغی سے فرمایا کہ پوستین کی فروخت کے وقت آپ زیادہ خوش طبعی سے کام نہ لیں۔ غرض دونوں کابل کے بازار میں پہونچے۔ ایک پوستین بھی پھٹا ہوا پرانا بڑی مشکل سے ایک خریدار ملا۔ قیمت پر جھگڑا ہوا۔ مشتری پانچ اشرفیاں دیتا تھا۔ شیخ زین الدین زیادہ قیمت مانگتے تھے۔ مولانا فارغی سے نہ رہا گیا اور مشتری سے کہنے لگے کہ اس پارہ پارہ پوستین میں پانچ اشرفی کی تو فقط جوئیں اور لیکھیں ہیں۔ کپڑا مفت میں ہے۔ یہ سنکر خریدار کا دل اور پھر گیا۔ اور سودا نہ بنا۔ آپ کا علم و فضل اور توکل عہدِ بابر کی تاریخ میں جابجا بطور اشارہ و حوالہ موجود ہے۔ آپ کی وفات سنہ ۹۴۰ھ میں ہوئی۔

(۳) مولانا شیخ زین الدین خوافیؒ خود بھی فن معمہ، تاریخ، فی البدیہہ شعر گوئی، اور نثر و نظم نگاری میں خاص شہرت و عزت کے حامل تھے۔ وفائی تخلص تھا۔ آپ نے واقعات بابری کا ترکی سے مروجہ وقت اردو میں ترجمہ کیا۔ ایک مدرسہ اور ایک مسجد بھی آپ کے اہتمام سے تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد چھدلو رے میں اتبک موجود ہے۔ سنہ ۹۴۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔

(۴) سقاؒ۔ آپ شیخ حاجی محمد خبوشانیؒ کے مرید اور صاحب جذب و حال بزرگ تھے۔ عہد اکبری میں شہر کی گلیوں اور کوچوں میں اپنے چند تلامذہ کو ساتھ لئے اور مشک کندھے پر رکھے راستے میں پیاسوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں اکثر اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ آپ کے شاگردوں نے آپ کے کئی دیوان جمع کئے۔ مگر آپ نے حالتِ جذب میں سب کو دھو ڈالا صرف ایک دیوان کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ گیا۔ سالِ وفات سنہ ۱۰۰۱ھ ہے۔

(۵) سید شاہ میر شیرازیؒ۔ المتوفی سنہ ۹۹۶ھ سید محمد ابن امیر معین الدین حسنی شیرازی کے فرزند ہیں اور چار واسطوں سے میر سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے ہیں۔ آپ میر رفیع الدین محدث اکبرآبادی کے بھتیجے تھے۔ اور انھیں کے محلّے میں بلین گنج کے قریب رہتے تھے۔ سکندر لودی کے عہد آخر میں آپ گجرات کے راستے سے آگرے تشریف لائے۔ آپ جس طرح طریقت میں کامل تھے اسی طرح نظم و نثر نویسی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

(۶) میر عبداللہ تبریزی مشکیں قلم۔ آپ شاہ نعمت اللہ ولی کی نسل سے ہیں۔ طریقت میں شیخ فیض اللہ چشتی سہارنپوری کے دستِ گرفتہ تھے۔ سخن گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ وصفی تخلص فرماتے تھے اور مولانا راقمی کے شاگردِ رشید تھے۔ دربارِ جہانگیر سے مشکیں قلم خطاب ملا تھا۔ جس کا ذکر وصفی خود اپنے اس شعر میں کرتے ہیں۔

وصفی تخلص من و مشکیں قلم خطاب۔ این نامہا ز شاہِ شہنشاہ یافتم ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی۔
قندہاری کوٹھی کے قریب متصل محلہ جواہر ایک گنبد میں آپ کا مزار ہے۔

(۷) مولوی عبداللہ۔ آپ مولوی شیخ عبدالرحمٰن اکبرآبادی کے فرزندِ رشید تھے، جو نہایت مشہور بزرگِ طریقت تھے، مولوی عبداللہ صاحب تقویٰ، قانع، اور خاموشی پسند بزرگ تھے۔ شعر و سخن میں خاص ملکہ تھا۔ طالب تخلص فرماتے تھے۔ اور آپ کا کلام نہایت پسندیدہ ہوتا تھا۔ اردو میں بھی آپ کا غیر مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ پہلے دس سال تک آپ کا مطب محلہ شہزادی منڈی میں جاری رہا۔ اس کے بعد آخر عمر تک آپ اپنے مکان واقعہ چھتہ لوکھا میں درس دیتے رہے۔ اور اب قبرستان عیدگاہ میں جنوبی دروازے کے سامنے آسودۂ خواب ہیں۔ المتوفی ۱۳۲۳ھ

(۸) ملا عبدالعزیز۔ ملا عبدالرشید اکبرآبادی کے فرزندِ ارجمند اور شاگردِ رشید ہیں۔ آپکو تمام علومِ نقلیہ و عقلیہ پر عبور تھا۔ تصوف میں بھی صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ عالمگیر اورنگ زیب سا صاحبِ علم بادشاہ آپ کی قدر کرتا تھا۔ مرتے دم تک تالیف و تصنیف میں مصروف رہے۔ عزت تخلص فرماتے تھے، عربی، فارسی اور ہندی تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۹) مولانا غریبی حصاری۔ آپ عہدِ اکبری کے ایک صاحبِ علم و کمال صوفی منش بزرگ اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ایک روز ماوراءالنہر میں شیخ حسین خوارزمی کی خدمت میں حاضر تھے اس وقت قوال یہ دوبیتی غزل گا رہے تھے۔

عمریست کہ من زپوست پوشانِ توام ‏ در دائرہ حلقہ بگوشانِ توام
گر بنوازی من از خود شانِ توام ‏ ور ننوازی من از خموشانِ توام

حضرت شیخ پر اُس وقت وجد طاری تھا۔ اُن کی صحبت کی برکت سے آپ پر بھی کیفیت طاری ہوگئی اور اُسی عالمِ وجد میں آپ نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

گر بنوازی مراد گر ننوازی ‏ در دائرہ حلقہ بگوشانِ توام

۹۶۲ھ میں آپ نے بمقام آگرہ وفات پائی۔

(۱۰) مولانا محمد سعید اعجاز) آپ عالم باعمل اور شاعر باکمال تھے۔ ملا عبدالعزیز اکبرآبادی کے شاگرد مرزا بیدل، میر معز فطرت، اور مولانا ناصر علی کے ہم صحبت اور رفیق تھے۔ مدت تک اکبرآباد میں درس و تدریس سے طالبانِ علوم کو فیض پہونچاتے رہے۔ ۱۱۲۷ھ میں انتقال فرمایا۔ اُس عہد کے اکثر فضلا کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

(۱۱) سید امجد علی شاہ جعفری القادری۔ آپ کے جد پنجم قطب الاقطاب مولانا سید ابراہیم قطب جعفری مدینہ منورہ سے بعہد جہانگیرؒ آگرے تشریف لائے۔ خان جہاں لودی جو جہانگیری عہد کا مشہور امیر تھا۔ آپ کا معتقد اور مرید تھا۔ اور اُس نے آپ کے لئے مدرسہ، مسجد، اور مکانات اپنے محل کے قریب تعمیر کرا دئے تھے جس مقام پر یہ مکانات تھے وہ اب لودی خاں کا ٹیلہ کہلاتا ہے۔

آپ سید عبداللہ قادری بغدادی رامپوری کے خلیفۂ اعظم تھے۔ شاعری میں اصغر تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ ۱۲۳۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ محلہ مدرسہ میں آپ کا مزار ہے۔

(۱۲) مرزا ایزد بخش رسا۔ آپ مرزا جعفر آصف خاں وزیر جہانگیر بادشاہ کے پوتے تھے۔ اکثر علوم فنون میں شہرۂ آفاق، فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے۔ فرخ سیر نے ۱۱۲۴ھ میں محض اس تصور پر کہ اُس کے باپ بہادر شاہ کی نسبت کوئی سخت کلمہ آپکی زبان سے نکل گیا تھا، آپ کو شہید کرا دیا۔ آپ کا مزار حویلی ایزد بخش میں جو اب محلہ بیلن گنج میں ریٹ صاحب کی کوٹھی کہلاتی ہے۔ موجود ہے۔

(۱۳) مولانا محمد سعادت علی قادریؒ۔ آپ قاضی سید مہر علی کے فرزند اور سید مظفر علی شاہ قادری کے مرید تھے۔ صاحب علم و فضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ سعید تخلص فرماتے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام موجود اور "کلیاتِ سعید" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۳۲۱ھ میں وفات پائی مزار محلہ سید باڑہ میں واقعہ ہے۔

(۱۴) شیخ محمد صالح قادری اعظمیؒ۔ آپ شیخ عباد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے۔ جو حضرت شیخ سلیم چشتی فتحپوری رحمۃ اللہ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ سلیم چشتی کی صحبت سے اکتسابِ فیض کیا ہر ادنیٰ اور اعلیٰ آپ کو شیخ الشیوخ کے نام سے یاد کرتا تھا اور اکثر شعرائے عصر کو آپ سے تلمذ تھا۔

آپ کی یہ غزل بہت مشہور ہے۔

مشتاقِ آفتابِ جمالِ محمدیم	مابندۂ محمد و آلِ محمدیم
پروانہ وار سوختۂ آتشِ فراق	وزآرزوئے شمعِ جمالِ محمدیم
ساقی زلالِ عشقِ شرابِ محمدیست	ماتشنۂ شرابِ زلالِ محمدیم
قانع شدہ است شیفتۂ ہر کس بحالتی	خوش حال ماکہ شیفتۂ حالِ محمدیم

آپ کا مزار غالباً محلہ گھٹیا اعظم خاں میں ہے۔ ذیقعدہ ۱۱۲۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔

(۱۵) میر محمد صالح کشفیؒ۔ آپ میر عبداللہ تبریزی وصفی کے صاحبزادے تھے۔ آپ کا باطن اخلاص و اخلاق سے معمور اور ظاہر زہد و صلاح سے آراستہ تھا۔ کشفی تخلص اور مشکیں قلم خوردنی خطاب تھا۔

آپ کی یہ بیت مشہور ہے۔

نظر بہ بے کسیم کن کہ قطرۂ آبے	بکام من نہ دہد کس بغیر چشم ترم

۱۰۶۰ھ میں آپ نے وفات فرمائی۔ اور نگر جواہر میں آسودۂ خواب ہوئے۔

(۱۶) میر محمد فاضلؒ۔ آپ میر سید احمد اکبرآبادی کے صاحبِ فضل و کمال فرزند تھے۔ مظہر الحق تخلص فرماتے تھے۔ اور شیخ الشیوخ محمد صالح اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ مخبر الواصلین آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں حضور سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام

سے اپنی وفات یعنی ۱۰۰۵ھ تک تمام مشاہیر بزرگانِ اسلام کی رحلت کی تاریخیں نظم کی گئی ہیں۔ تذکرۃ الفقرا کے نام سے آپ نے قدیم مشائخ کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ مگر اب وہ نایاب ہے۔

(۱۷) میر محمد مومن عرشیؔ۔ آپ عبداللہ صفی تبریزی کے فرزند اصغر تھے۔ ابتدائے حال میں شہزادہ سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ کی تعلیم و تربیت پر آپ مامور رہے۔ بالآخر متوکل ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے۔ سخن گوئی میں نادر المثال تھے۔ ۹۰ برس کی عمر پائی۔ ۱۰۹۱ھ میں رحلت فرمائی۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے قبرستان میں آسودہ ہوئے۔

(۱۸) مولانا مقصود علی تبریزی۔ آپ فضل اللہ بیگ کے فرزند تھے۔ کمالاتِ شاعری اور علم و فضل سے بہرہ مند۔ آپ نے سلمان فارسی کے مشہور قصیدے کے جواب میں ایک سیر حاصل قصیدہ قاضی یحییٰ قزوینی کی مدح میں کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎ علی خصال و محمد شعار و یحییٰ نام ؛ چہ روشن است کمالش چہ حجتِ لقا

آپ صاحب دیوان بھی تھے۔ آپ کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں۔

در عالم وفا سگِ کوئے تو رام است — اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست

عشاق را تمام نظر بر جمالِ تست — نے شاہدِ حسن روئے تو ماہ تمام ماست

۱۰۱۹ھ میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کا مزار متصل نگار جواہر ایک چبوترے پر واقع ہے۔

(۱۹) مولانا سید نجم الدین محمد قاسم کابلی۔ آپ کا مولد کابل۔ عرفِ عام میں میاں کالے۔ اور تخلص کاہی تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

کاہی تو بلبلِ چمن آرائے کابلی — زاغ زغن نہ کہ بہ ہندوستان شوی

آپ کو علم تفسیر، ہیئت، تصوف، معمہ، تاریخ، موسیقی اور شعر میں کامل مہارت حاصل تھی۔ مگر ذوقِ شاعری ان تمام کمالات پر حاوی تھا۔ ۱۵ سال کی عمر میں مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے ہی استفادہ کیا تھا۔ عہد اکبری میں براہ بھکر ہندوستان آئے۔ اور ایک قصیدے کے صلے میں انعام و اکرام شاہی سے بہرہ مند ہوئے۔ عمر کا زیادہ حصہ عزلت نشینی میں گذارا۔ آخر ۹۸۸ھ میں بعمر یک صد دس سال رحلت فرمائی۔

دیوانِ کاہی اور مثنوی گل افشاں۔ آپ کی یادگار ہے۔

(۲۰) قاضی سید نور اللہ شستری۔ آپ مذہب امامیہ کے مشاہیر فضلا سے تھے۔ حکیم ابو الفتح کی سفارش سے اکبری عہد میں شریکِ ملازمت شاہی ہوئے۔ اور برسوں شیخ معین کی جگہ لاہور میں منصب قضاۃ پر مامور رہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام بہت دلکش اور پسندیدہ ہوتا تھا۔ شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر پر آپ نے ایک عمدہ تقریظ لکھی تھی۔ جہانگیر نے لاہور سے آپ کو بلا کر اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کر لیا تھا۔ ۱۰۱۹ھ میں بادشاہ کے سامنے آپ کی زبان سے ایک ایسا کلمہ نکل گیا جس سے برافروختہ ہو کر بادشاہ نے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کا مزار عدالت دیوانی کے قریب زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

تصوف اور شاعری ان ناموں کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو صوفیا اور مشائخ کی ادبی دلچسپیوں کا حال معلوم ہو جائے۔ اور مشائخ کے مزاروں پر ادبی مجالس کے انعقاد کا رواج بطور منظم ایک اخلاقی دستور کا درجہ حاصل کر لے۔

شعر و شاعری کو مشربِ صوفیہ میں بہت دخل ہے۔ سماع کی محفلوں اور حال و قال کی مجلسوں میں شعر کی اہمیت اور ہمہ گیری کلیتہً کارفرما ہے۔ یعنی اگر شاعر شعر نہ کہے۔ تو مغنی، مطرب، اور قوال اپنے مقاصد میں کسی طرح کامیاب نہ ہوں۔

حضراتِ صوفیائے متقدمین و موجودہ نے اپنی شاعری کا جو معیار قائم کیا ہے۔ وہ حقیقت میں صحیح معیارِ شاعری ہے۔ یہی صوفیائے عرب و ایران کی شاعری کا معیار رہا ہے۔ جو آج بھی سنجیدہ طبقۂ شعرا میں مقبول ہے۔

جس فلسفے کا اردو شاعری سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ صوفیا کے کلام میں اس کا فقدان نہیں۔ الہٰیات اور روحانیات کے وہ تمام درس جو نثر میں کسی طرح بہ پیرایۂ موثر بیان نہیں کئے جا سکتے شعر کے ذریعے سامعہ میں جذب کئے جا سکتے ہیں۔ وہ حقائق و معارف جن کی تفسیر و توضیح نثر میں نہیں کی جا سکتی، شعر کے پردے میں نہایت آسانی سے متجلی ہو جاتے ہیں۔ حقیقی شاعری وہی شاعری ہے جو ہماری روح کو جھنجھوڑ دے، ہمارے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے اور ہمارے دماغ کو

اپنے اثرات سے تکیف کر کے ہمیں سرخوشی و بیخودی کا اہل بنا دے۔

متصوفانہ شاعری میں ہماری عام اور مجازی مصطلحات شاعری کا درجہ روحانیت سے متوازن کر دیا گیا ہے۔ شراب و ساقی کا ذکر اسمیں بھی ہے۔ ہجر و وصل کے جذبات اسمیں بھی ہیں کعبہ و دیر کا نام اسمیں بھی لیا جاتا ہے۔ قفس و آشیاں اس میں بھی دخیل ہیں۔ لیکن شراب سے مراد، شراب ذوق و شوق، ساقی سے مراد پیر و مرشد، ہجر سے قرب الٰہی کا بُعد اور وصل سے تقرب و نزدیکی کنایہ کیجاتی ہے۔

کعبے سے اشارہ دل کی طرف ہوتا ہے۔ اور دیر سے صنم خانہ ہستی مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح قفس سے قفسِ عنصری اور لذاتِ ناقص کی پابندی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور آشیاں سے عالمِ باقی اور مرجع اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صوفی کا محبوب، محبوبِ حقیقی اور عشق، عشقِ الٰہی ہے۔ سب سے پہلے حضرات صوفیا نے ان کنایوں اور اشاروں کو حقیقی معنوں میں استعمال کیا۔ اس کے بعد جب شاعری مذہبِ عوام میں داخل ہوئی تو یہ تمام کنانے مجازی ہوگئے۔ اور شراب سے مراد مطلق شراب، ساقی سے مراد مطلق ساقی، ہجر کا مطلب کسی محبوبِ مجازی کا فراق اور وصل سے مقصد ہم آغوشی و ہمکناری سمجھا جانے لگا۔ غرضکہ اسی طرح وہ شاعری جو مشربِ صوفیا میں ترجمانِ حقیقت تھی۔ رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھ میں آکر بازاری اور رکیک ہوگئی۔ فی نفسہٖ مجاز کی ترجمانی کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس لئے تمام فضا اسی رنگ کی طرف مائل نظر آنے لگی اور شاعری تخریبِ اخلاق و تضیعِ اوقات کا ذریعہ بن گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ صوفیا کی طرح عام شعرا جو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اُن کا مثالیہ بھی حقیقت ہی کو کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ یہ سوال صحیح ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عام شاعری نے ان مصطلحات کے استعمال میں جن تعلقات کو شریک کر لیا ہے وہ کسی طرح مجاز سے حقیقت کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے۔ مثلاً یہ شعر،

وہ اُن کا ہائے شبِ وصل اس طرح آنا
کڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے

کسی طرح محبوبِ حقیقی کی تصویر ہمارے پیشِ نظر نہیں کرتا۔ کڑے اور پائنچے دنیائے مجاز کی مطلق

مادی اور رسمی چیزیں ہیں جنھیں حقیقی سامانِ محبوبیت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ پھر کس طرح سمجھ لیا جائے کہ اس شعر میں "آن کا" کا مشارٌ الیہ محبوبِ حقیقی ہے۔

اس کے خلاف یہ شعر دیکھئے:

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

شاعر کہتا ہے کہ "اے دوست میرے گھر میں بے حجاب چلا آ" اس لئے کہ بجز تیرے درد کے اس گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔ معمولی عقل و تمیز رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں گھر سے مراد دل ہے، جسے لفظ "درد" نے آشکار کر دیا ہے۔ اور دل میں آنے والا محبوبِ حقیقی ہے، جسے چونے اور پتھروں سے بنے ہوئے گھروں سے تعلق نہیں بلکہ انسانی دل سے لگاؤ ہے۔

صوفیا اور عام شعرا کے کلام میں آپ سراسر یہی فرق پائیں گے۔ اس نہج سے متصوفین کا کلام ہماری روحانی قوتوں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور عام شعرا کے کلام سے ہماری جذباتی کیفیتیں ہیجان ہو کر ہماری کمزوریٔ اخلاق کا باعث ہوتی ہیں۔

اب یہ فیصلہ آپ حضرات کے فہم و ادراک پر موقوف ہے کہ شاعری کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ ہماری قومی و اخلاقی تعمیر کے لئے بازاری شاعری زیادہ مفید ہے یا خانقاہی؟ — ہمیں روحانی اور حقیقی لذت و کیف سے سرشار ہونا چاہئے یا مادی و مجازی جذبات سے؟ میری رائے ناقص میں اگر یہ صحیح ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" تو اس میں پیغمبرانہ اور لِلٰہانہ شان ضرور ہونی چاہئے۔ تاکہ شاعری کے ذریعے مادی فضاؤں کا تکدر اصلاح یاب ہوتا رہے۔ اور ہم اپنی قوم کی سیرۃ و اخلاق میں بلندی پیدا کرنے کے قابل سمجھے جانے لگیں۔

ہماری شاعری میں وہ تمام باتیں موجود رہیں جن کا تعلق درس و پیام سے ہو۔ ہمارے اشعار سننے والوں کیلئے وجہ تفریح نہ ہوں بلکہ سبب فکر و غور رہیں۔ ہمارے شعر سن کر شاعرے کی فضا "واہ واہ" سے گونجے یا نہ گونجے مگر کسی گوشے سے "آہ" کی آواز ضرور بلند ہو جائے۔

چودہواں خطبہ

مشاعرہ بزم ادب اورئی ضلع جالون

۱۵- جون ۱۹۳۵ء

گرامی حضرات!

میں اپنی ناچیز ہستی کو آج ایک ایسے تاریخی شہر کے ادبی و علمی ماحول میں دیکھکر بے حد مسرور ہوں جسے میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس عزت کے ساتھ جو مجھے بحیثیت صدر مشاعرہ یہاں عطا کی گئی ہے۔ میں اپنی مسرت کو بہت زیادہ قیمتی محسوس کر رہا ہوں۔

موسم گرما کی یہ وداع ہونے والی انتہائی گھڑیاں اور اس موسم کی یہ آخری چاندنی راتیں، مجھ جیسے والہانہ فطرت رکھنے والے شاعر کو "ارضِ تاج" میں بسر کرنی تھیں۔ جن کی شعریت و کیفیت کا مشاہدہ بشرطِ حیات پھر ایک سال بعد ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات کچھ کششیں اپنی قوت سے انسان کو کہیں سے کہیں کھینچ لیجاتی ہیں میں بھی اسوقت ایک کشش ہی کا شکار ہوں۔ جو محبت و خلوص کی قوتوں اور عقیدت و احترام کی عظمتوں سے مرتب ہے۔ میرا مطلب اپنے محترم دوست منشی ہرگوبند دیال صاحب نشتر وکیل اورئی کی عنایت و توجہ سے ہے۔ جنھوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے سفرِ اورئی کا وعدہ لے لیا۔ اور جن سے میں نے لفظوں لفظوں میں یہاں حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا۔ ورنہ ایک فطرت پرست اور عزلت پسند غریب شاعر کے لئے اس موسم میں "تاج" کا ایک منور گوشہ مرمریں فی الحقیقت خدا کی تمام موعودہ جنتوں سے

زیادہ خوشگوار تھا۔

"اورئی" کا ادبی جغرافیہ

جس طرح میں اورئی میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا ہوں۔ اسی طرح میں نے اورئی میں پہلے مشاعرہ کا اعلان بھی پڑھا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اورئی میں جہاں متعدد خوش فکر و خوش آہنگ شعرا موجود ہیں، اس سے پہلے کوئی مشاعرہ نہ ہوا ہوگا، لیکن کم از کم میں نے نہیں سنا۔

اورئی کی تاریخی حیثیت جو کچھ ہو اگر جغرافیائی حیثیت سے میں اورئی کو یوپی ہی کا ایک حصہ سمجھنے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا، اس ترقی یافتہ زمانے میں اورئی۔ آگرہ سے صرف ، گھنٹے کی مسافت پر۔ لکھنؤ سے ۸ گھنٹے کی مسافت پر اور دہلی سے ۱۱ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ مسافت اتنی طویل نہیں کہ ہم اورئی کو کسی طرح بھی۔ مراکز،۔ دوادوادبی محاذوں سے بعید سمجھ سکیں۔ لکھنؤ۔ دہلی اور آگرہ سے اتنے قریب ہوتے ہوئے اورئی کی آہنگِ ادب کا غیر مسموع اور پست رہ جانا یقیناً قابلِ افسوس ہے۔ آپ یہ خیال ہی یوں کریں کہ اورئی ہندو ستان کا ایک حصہ ہے۔ جسے زبان اور ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور آپ یہ کیوں نہ باور کریں کہ اورئی یوپی کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ اور اہلِ زبان کی دسترس سے کسی طرح باہر نہیں۔

شاعری اور بقائے عمرانیت

علم و ادب کی بلند آہنگی ایک ایسی رفعت ہے جو اپنے سہارے سے پست ترین طبقاتِ ارض کو بھی بلند کر دیتی ہے۔ بانس، بلگرام، مارہرہ۔ موہان۔ یہ سب معمولی قصبے تھے۔ مگر یہاں کچھ ارباب علم پیدا ہوئے جن کے فیض سخن سے یہ قصبے مشہور ہوگئے۔ اور نہ صرف مشہور ہوگئے بلکہ اس قابل بن گئے کہ اگر ہندوستان کا کوئی ادبی جغرافیہ مرتب کیا جائے تو اس میں ان قصبوں کا نام بہت سے شہروں سے زیادہ نمایاں لکھا جائے گا۔

شہر یا قصبے، حقیقت میں مجازی حدود متعینہ ہیں۔ اصل چیز وہ ہے جو ان حدود میں کار فرما ہے۔ اس لئے اگر آپ کا ذوقِ علم و ادب پر جوش اور قوی ہے تو اس کے متواتر مظاہرے آپ کے نام کے ساتھ اس قصبے کو نمایاں حیثیت دے سکتے ہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں اٹھتے۔ پھر آپ کیوں ایک ایسی منظم آواز بلند نہیں کرتے جو دوسرے شہروں میں بھی سنائی دے اور جو دوسرے صوبوں میں بھی آپ کے قصبے

کو شہرت و قبولیت حاصل کرنے کے قابل بناتے۔

اس اختلاط و انقلاب کے زمانے میں بھی جب کہ ہمارا ملک حنیف کی طرف بڑھا چلا جارہا ہے ہماری بقاء حیات کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ادبی ذوق ہے۔ ہم اسی ذوق کے سہارے آج اور آج کے بعد زندہ رہ سکتے ہیں۔ جن قوموں نے اپنے ملک کے ادب کو زندہ رکھا وہ آج صدیوں کے بعد بھی زندہ ہیں یونان کا طبقہ الٹ گیا۔ مگر یونان کا ادب آج بھی مشرق و مغرب سے داد خواہ اور باجگیر ہے۔ عرب کے فصحا کا سلسلۂ پیدائش ختم ہوگیا۔ مگر عربی ادب آج بھی عرب کو کششِ جہاتِ عالم میں برتری و امتیاز دے رہا ہے۔

شاعر کا تفوق جنسی

ادب اردو، ہندوستان اور ہندوستان کی تمام اقوام کے لئے عروج و ارتقا کا واحد ذریعہ ہے۔ آج ہندوستان کے ادیب دنیا بھر میں مشہور و مقبول ہیں اور آج ہندوستان کا ادب کسی ملک کے لٹریچر سے کم سرمایہ دار نہیں۔

پھر ادب میں شاعری کا حصہ! ایک ایسا خوشگوار اور روحانی جزو ہے جو ہر نوع افراد کو قبولیت و شہرت کے ارتفاع و معراج پر پہونچانے کے لئے، ایک مستند ذریعہ اور واسطہ ہے۔

زمانہ مرہٹہ سرداروں اور بندیلے ٹھاکروں کے نام بھول سکتا ہے۔ مگر کبیر داس اور کالیداس کو نہیں بھول سکتا دنیا لودی سلاطین اور ان کے کارناموں کو بھلا سکتی ہے۔ لیکن اس عہد کے شعرا کو خواہ وہ کسی زبان کے شاعر ہوں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ میر اکبر آبادی سے امیر لکھنوی تک اور داغ دہلوی سے آپ کے متعارفہ کسی نام آور شاعر تک لاتعداد انسان محض اپنے کلام کے سبب زندہ ہیں۔ اور ابھی خدا جانے کب تک زندہ رہیں گے۔ یہی زندگی ابدی زندگی ہے۔ اور اسی زندگی کا نام دراصل زندگی ہے۔

شاعری سے دنیا کا کوئی دور اور کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ روایات کا سلسلہ تو یہاں تک پہونچتا ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے انسان نے اپنے سب سے پہلے فرزند کی موت پر ہی ماتم موزوں کیا تھا معلوم ہوا کہ شاعری ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اور جس کا کام میں لانا نہ لانا امر اختیاری ہے۔ اس فطری جذبے میں علم و ادراک، غور و فکر، تحقیق و تخیل،

ایجاد و اختراع، اور نظر و نقد سے ایک قسم کی فنی صنعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاعر کا الہام انسانوں کی سماعت کے لئے ایک ایسا دلکش گیت بن جاتا ہے، جس کا کیف و سرور کبھی کم نہیں ہوتا۔ اور جس کے سازِ ترنم پہ دل وجد کرتا ہے اور روح رقص کرتی ہے۔

شعر کی عروضی ولغوی تعریف سے اس وقت بحث نہیں۔ اس زمانے میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دل میں چبھنے والا ایک نثر اور تکلم کی عام سطح سے بلند ایک کلام ہو۔ یعنی جو خیال شعر میں نظم کیا جائے، وہ عامۃ الناس کے خیالات سے ممتاز و مرتفع ہونا چاہئے۔ اگر شاعر کے خیالات عام خیالات کے متوازن ہوں تو شاعر کو ان کے موزوں کرنے کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں ہر خیال کے نظم کر دینے کا نام شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری نام ہے خیالاتِ بلند و محفوظ کی موزوں ترجمانی کا۔ اور شاعری نام ہے اُس تصویر میں جان ڈالنے کا جو نقاشِ فطرت شاعر کے دماغ پر مرتسم کرتا ہے۔

موجودہ شاعری اور تنوعِ خیال

حضرات، شاعری کی قدامت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ایک حد تک بجا ہے کہ اب شاعری میں نئے اور تازہ خیالات کی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن انسان شاعری سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جب اس کی تخلیق میں ہنوز ندرت و تنوع باقی ہے تو کیا سبب ہے کہ شعر، الہامی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اب بھی نادر و متنوع نہ ہو۔

نہ دنیا کی کوئی صبح نئی صبح ہے، نہ کوئی شام نئی شام ہے۔ نہ تارے نئے ہیں۔ نہ چاند نیا ہے، نہ سورج نیا ہے۔ نہ دریا۔ نہ پہاڑ، نہ آبشار، نہ لالہ زار، مگر پھر بھی ہر صبح میں ایک نئی طلعت، ہر شام میں ایک نئی نزہت ہر رات میں ایک نئی پھبن۔ غرضکہ ہر چھپ کر طلوع و نمودار ہونے والی چیز میں ایک نیا پن موجود ہے۔ اسی طرح موجوداتِ عالم، واقعات و کیفیات کے لحاظ سے اپنا رنگ و اثر اور اپنے احول کا عالم بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ لاتعداد اشعار کہے جانے کے بعد بھی کوئی نیا شعر دماغ سے پیدا نہ ہو۔ یا اُس میں کوئی ندرت محسوس نہ کی جا سکے؟ ۔ الا ماشاء اللہ۔

جس طرح فطرت کی قدامت، نئے واقعات و حادثات سے ہمارے لئے تنوع پذیر کی جاتی ہے

اسی طرح ہماری شاعری میں بھی، الفاظ نہ سہی کم از کم خیالات و احساسات اتنے نئے ہونے چاہئیں جو ہمارے اشعار کے نئے اور نادر سمجھے جانے پر دنیا کو مجبور کر دیں۔

اسی نظریئے کے ماتحت اردو شاعری کا وہ رنگِ قدیم، جسے تغزلِ محض کہتے ہیں، بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اسکی جگہ جدید خیالات کو مل رہی ہے۔ جسے جدید شاعری کہتے ہیں وہ حقیقت میں جدید شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری کا جدید اسلوب ہے۔ فنِ شاعری تو اب تک انہیں اصولوں اور بنیادوں پر مبنی ہے۔ جو اصنافِ فن نے اب سے صدیوں پہلے قائم کی تھیں۔ مگر نفسِ شاعری بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اور یہ تبدیلی نہ صرف وقت اور زمانے کے مطابق ہے بلکہ دنیا کا مستقبل بھی اس تبدیلی کے بعد خوش آئند نظر آتا ہے۔ اب ہماری شاعری میں جذبات کے ساتھ درسِ پیام بھی ہے۔ یعنی جو کڑوی سی کڑوی بات ہم نثر میں نہیں کہہ سکتے وہ نظم میں بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔ اور سننے والوں پر اس کا کوئی تلخ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اب ہمارے اشعار۔ ایک خاندان کے ہر بزرگ اور ہر فرزند کے سامنے سنائے جانے کے قابل ہیں۔ اور اب ہمارے خیالات اس درجہ مہذب، پاکیزہ اور رستھرے ہو گئے ہیں۔ کہ ہم صرف اپنی شاعری سے اصلاح و تہذیب اور تعمیرِ و تاسیس کا کام بہ آسانی لے سکتے ہیں۔

آخری گذارش

میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ کو اردو کی ادبی شہرت و نمود اور اعلان و اشتہار میں ضرور حصہ لینا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح مارچ کے مہینے میں یہاں فصلوں کی تیاری پر ایک نیا عالمِ رنگ و بو پیدا ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کی توجہ اور کوشش سے سال میں ایک مرتبہ یہاں ادبی فصل بھی ضرور آیا کرے۔ اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ سال بھر تک متواتر ادبی کیاریاں بناتے رہیں اور ان میں اپنی فکر اور اپنے ذہن سے آبیاری فرماتے رہیں۔

مجھے یقین ہے کہ "بزمِ ادب اردو" کے ماہانہ جلسے اگر بالالتزام ہوتے رہیں اور انمیں شاعروں اور ناظموں کا باقاعدہ انتظام ہو۔ اور انکی روداد ہندوستان کے مشہور موقت المتنوع رسائل و جرائد میں شائع ہونے کیلئے بھیجی جایا کرے۔ تو چند سال ہی میں اردو کا نام ادبی دنیا میں متعارف ہو سکتا ہے۔

شعرالحیات

اپنی شاعرانہ زندگی کے مختصر حالات

اپنا بیان اپنی زبان

اردو سوانح نویسی کی رسم متروک ہے کہ شعرا کے حالات عموماً انکی وفات کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں۔ پھر ان میں جانب داری، رعایت اور غلط روایات سے اس قدر خلط بحث ہو جاتا ہے کہ صحیح واقعات تک ذہن کی رسائی دشوار ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح ایک دنیادار انسان، انتظارِ وقت میں اپنے متعلقین کے لئے وصیت نامہ لکھنا فالِ نیک نہیں سمجھتا اور مر جاتا ہے اسی طرح روحانی دنیائے ادب کے فرشتے بھی اپنی روداد حیات کہنے سے پہلے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔

اگر یہ دستور عام ہو جائے کہ ادبا و شعرا اپنا حیات نامہ اپنی زندگی ہی میں لکھ جایا کریں تو میری دانست میں عین مصلحت ہے۔ میں نہ فرشتۂ ادب ہوں، نہ مشاہیر ادبا و شعرا کا ہم صف، مگر ایک دیوانۂ ادب ہونے کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ انسانوں کی اس دنیا میں عرصۂ دراز تک رہا ہوں (صرف اس خیال سے کہ شاید میرے بعد میرے حالات کی مورخ کو ضرورت ہو) اپنی حیاتِ شاعرانہ پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پیدائش، تعلیم اور فطری ذوقِ شعرگوئی

میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی۔ گلو گلی والی دالے مکان میں پیدا ہوا۔ یہ مکان اب بھی اپنی حدود و متعارفہ کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن اس کے مکین اپنی سکونت دوسری دنیا

میں منتقل کر چکے ہیں اور نئے مالکانِ مکان نے وہ املی کا درخت بھی کاٹ دیا ہے۔ جو برسات کے موسم میں ہمیشہ محلّے بھر کی خواتین کے جھولے سے جھوما کرتا تھا۔ اور جس کے قرمزی پھولوں کا ترش و شیریں ذائقہ اب تک میرے کام و دہن میں محفوظ ہے۔ آہ! وہ آباد گھر، مقدس نفوس سے معمور خاندان! دادا صاحب، اُن کے بھائی، اُنکی بہن، دادی صاحبہ، والد صاحب، والدۂ ماجدہ، میرے دو بھائی، دو بہنیں، چھوٹے دادا صاحب کا فرزند ——— کیسی زندگی افروز دنیا تھی! جسے انقلاب نے نقشِ موہوم بنا دیا ——— وہ چہل پہل، وہ میٹھے کنوؤں کا پانی، کڑوے تیل کا چراغ، وہ پسنہاریوں کا کاغذی ہلکے ظروف (ٹھانٹوں) میں آٹا پیس کر لانا وہ شہنشاہ اکبر کے نام سے سکوک سکّے، ایک ڈبل (پیسے) میں دو۔ وہ زندگی کی ارزانی، وہ فراغ و آسودگی اور شگفتہ سامانی! ——— اب وہ زمانہ خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ حقیقتیں فسانہ ہو گئیں۔ اور وہ زمانے بدل گئے۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنَ النَّاسِ۔ اب صرف ایک بھائی (صادق حسین) اور ایک بہن باقیات الصالحات سے ہیں خدا اُنھیں سلامت رکھے۔

والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ) فاضلِ عصر اور عالم متبحر تھے۔ اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ دینیات کے دلدادہ اور مذہب کے پابند۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ گلدستۂ عطّار کے چار حصے۔ مجموعۂ شہادت۔ کراماتِ غوثیہ۔ آپ کی تصانیف سے اب تک مقبول و مروج ہیں "مشعرالحدیث" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ "رسالۂ رہنما" اجمیر کی ترتیب میں بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن عام طرزِ شاعری سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حکیم امیر الدین عطّار اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ تمام راجپوتانے میں اُس وقت مرحوم سے بہتر کوئی واعظ نہ تھا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری میرا فطری ذوق اور پدری میراث ہے۔ جب میں حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم، حضرت مولانا قمر الدین مرحوم، اور حضرت مولانا عبد الغفور مرحوم، (اناراللہ برہانہم) سے عربی ادب، اصول، اور منطق کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اور فارسی میں سکندر نامہ، ضیا بارانِ مثنوی غنیمت، رقعاتِ میرزا قتیل، سہ نثرِ ظہوری، ابو الفضل وغیرہ کتابیں ختم کر چکا تھا۔ اور علمِ عروض بھی میرے درس میں تھا اُس وقت میں دیکھتا تھا کہ اس علم سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ کتبِ متداولہ عربی و فارسی کی

تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا۔ جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق والحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا اور اب بھی بدستور موجود ہے۔

برانچ اسکول کے مدارج درس لجلت طے کر کے جب میں کالج پہونچا تو وہاں مولوی سدید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اس ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریکِ درس ہوتے میں اُن کا ترجمہ اردو نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ اور یہ مقدس حضرات میری اس جسارت کی حوصلہ افزائی سے پذیرائی فرماتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستاں کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔ ؎

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور   پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرمادیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض اب یہ میری عادتِ جاریہ تھی کہ میں نظامی، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی، وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزوِ نصاب تھا) ہمیشہ بصورتِ نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کرتا رہا۔ اور صاحبِ ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں ایف۔ اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ گرچونکہ شاہراہِ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا۔ اس لئے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک ہوتی تھی۔

والد مرحوم تعلیم کے ساتھ میرے ذوقِ سخن کے مخالف تھے۔ اور میں اُن سے چھپ چھپ کر بہ دشواری مشاعروں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ جب کہیں مشاعرہ ہوتا تو میں چاہتا تھا کہ خدا کرے آج والد صاحب کہیں دعوت کھنے

تشریف لے جائیں۔ اکثر یہ خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تھا مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اور مشکل سے نیند آتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب والد مرحوم نے یقین کر لیا کہ یہ میرا ذوق فطری اور موروثی ہے تو پھر میرے لئے زیادہ سخت گیری نہ رہی۔ بلکہ میں نے اُن کے بعض تلامذہ و احباب سے یہ بھی سنا کہ وہ میرے مستقبل شاعری کے لئے دعا گو ہیں۔

ملازمت اور تلمذ والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزندِ اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پر آپڑا۔ اور مجھے بہ سلسلۂ معاش کانپور جانا پڑا۔ حکیم آزل لکھنوی، جناب محب لکھنوی، اور کانپور کے اکثر شعرا سے مجالست رہی۔ اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ اور قرب وجوار کی وجہ سے کانپور لکھنؤ کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن میری طبعیت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ اس لئے میں ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔

۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے برادرِ محترم ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی ادارت میں رسالہ "معیار الانشاد" شائع ہوتا تھا۔ نواب فصیح الملک کے کہنے سے میں اُس کا خریدار ہوا۔ اور غزلیں بغرضِ اصلاح حیدرآباد بھیجنے لگا۔ لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصے کے لئے بند کر دی۔ اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب میرا دستور العمل یہ تھا کہ میں صبح سے شام تک بادامی کاغذ کا ایک دستہ اشعار سے سیاہ کر دیا کرتا تھا۔ اور یہ دفترِ بے معنی شام کو پھاڑ کر نالی میں بہا دیا تھا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ "دم نکلتا ہے۔ کم نکلتا ہے" میں نے ایک سیر غزل کہی اور استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔ "آفریں ہے، کیا خوب غزل کہی ہے" بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے۔ طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا یہ سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک برابر جاری رہا۔ اُنکی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ ادھر تو مشقِ سخن تکمیل کو پہونچ چکی تھی۔ ادھر چند سالہ سلسلۂ اصلاح نے کافی معلومات سے

بہرہ مند کر دیا تھا۔ غرضکہ سلسلۂ اصلاح ختم ہو گیا۔ اسی اثنا میں اکبر آباد کے بعض اربابِ ذوق، مثلاً امیر الدین نظر اکبر آبادی مرحوم، حاجی عبد الستار سیفؔ اکبر آبادی، قمر الدین بازغ اکبر آبادی، بشیر الدین بشیر اکبر آبادی میرے شاگرد ہو گئے اور میری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

بیعت اور شاعری

نظر مرحوم وارثی تھے۔ کانپور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں بمقام گوال ٹولی، رہا کرتے تھے۔ اُنکی تشویق سے اُنھیں کی ہمراہی میں، ایکدن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا۔ بیعت کے دن بازدید کی حسرت میں ایک غزل کہی۔ بعدِ عصر حضوری کی اجازت ملی۔ غزل لے کر حاضر ہوا، حضور نے غزل مجھ سے لے لی۔ سرنامہ پڑھا جس پر لکھا تھا۔ "شیخ عاشق حسین سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہوی"۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سرنامہ پڑھ کر اوگھٹ شاہ سے فرمایا "فصیح ہیں" اوگھٹ شاہ صاحب نے سرنامے پر نظر ڈالتے ہوئے عرض کی "حضور فصیح الملک کے شاگرد ہیں"۔ ارشاد ہوا "ہاں اور فصیح ہیں"۔ اوگھٹ شاہ صاحب نے دست بستہ اعتراف کیا کہ "ہاں حضور فصیح ہیں"۔ مرشد کا ارشاد، خدا کا کرم، اُدھر "فصیح" کا خطاب ملا، اِدھر گویا شاعری کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

شاگردوں کا مرجوعہ

کانپور سے بیمار ہو کر آگرہ آیا۔ تو یہاں منشی محمد اسمٰعیل فضا، منشی ولایت علی تبسم، منشی محمد ایوب بازغ، محمد یوسف بہار، عبد الحمید خاں شاداب، شفیع احمد خاں شفاؔ، حفیظ الدین بیتاب، محمد صادق، دادا چاند پوری، ارشاد احمد خاں ارشاد نظامی، محمد حسین ناظر، عبد المجید خاں نایاب، محمد خاں شفق، وغیرہ چند نوجوان شاگرد ہو گئے۔ ان دنوں میری نظمیں، غزلیں اور میرے مضامین صوفی نظام المشائخ، سالک، صبح بنارس، ہمدرد وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ آگرہ سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ وہاں ذمہ دارانہ حیثیت پائی۔ جہاں شعر کہنے کی ابتدا کی تھی۔ وہاں انتہائی عزت و عظمت ملی۔ یہاں فصیح الملک کے شاگردوں میں اس وقت حکیم بہاؤ الدین بہاؔ، محمد بخش ضبط، اور حکیم رام نراین جیرا، دہلوی بہت مقبول تھے۔ اُنکے ساتھ شاعرے پڑھے۔ اور شاگردوں

کی تعداد یہاں بھی بڑھی۔ پیرزادہ سید علی حسرتؔ اجمیری، حافظ محمد عبدالرؤف آسیؔ اجمیری، محمد علی تیرؔ احمدی اجمیری، منشی محمد حنیف کاتبؔ اکبرآبادی، احمد بخش تائبؔ نصیرآبادی مرحوم، میر احمد صدیق قابلؔ لکھنوی وغیرہ شاگرد ہوئے۔ رسالہ "فانوسِ خیال" اپنی ادارت میں جاری کیا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہ کر ۱۸۹۹ء میں پھر آگرے آیا۔ اور یہاں مرزا خادم حسین رئیسؔ، ماسٹر تصوف حسین واصفؔ، مولانا نثار علی نثارؔ، اور شیخ بزرگ علی عالیؔ (مرحوم و مغفور) کے ساتھ اکثر مشاعرے پڑھے، اس مرتبہ مولوی ضمیر عالم ساحرؔ، محمد محسن محسنؔ، سراج الدین سراجؔ شاگرد ہوئے۔ اور "رسالہ مرجع" کا مدیر رہا جو منشی فریدالدین خاں گوہرؔ مرحوم کے مطبع سے شائع ہوتا تھا۔ یہاں کچھ روز رہ کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بہ صیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ ڈی۔ ٹی۔ ایس آفس میں اس وقت سید محمد احسن شہیدؔ شمس آبادی مرحوم ہیڈ کلرک تھے، جب انھوں نے سنا کہ میں آگرہ آگیا ہوں تو بہ کمال اصرار مجھے بلایا اور دفتر میں جگہ دے دی۔ خدا مغفرت کرے مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ اور شعر و شاعری سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ ارباب دفتر میں بابو شوکت حسین معشوقؔ اٹاوی، بابو محمد صغیر اثرؔ اکبرآبادی، بابو ممتاز علی علیؔ گڑھی اور بیرونجات میں سالکؔ نظامی وغیرہ اسی زمانہ میں شاگرد ہوئے "آگرہ اخبار" کی ادارت بھی ٹونڈلے کی ملازمت کے ساتھ شریکِ شاغل تھی۔

ترکِ ملازمت اور قیامِ مرکز

اجمیر شریف اور ٹونڈلے کی ملازمتوں میں ہر دن کا نصف حصہ شعر کہنے یا شعر کی اصلاح میں صرف ہوتا تھا۔ اور دیکھنے والے حیران تھے کہ میں اتنی ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے ذوقِ شاعری کی تکمیل کیونکر کر لیتا ہوں۔ آخر معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کروں۔ بلکہ میری تخلیق خدمتِ ادب کے لئے ہوئی ہے اس انکشافِ ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دے دیا۔ اور اکبرآباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

لیکن خدمتِ ادب کا فرض محض غزل کہنے یا غزل دیکھ لینے سے پورا نہ ہوتا تھا۔ دماغ جو ہمیشہ کاوش پسند رہا ایک ایسا مشغلہ ڈھونڈ رہا تھا جو تخیلِ حیات کی تعریف میں آسکے۔ اس لئے نچلا نہ بیٹھا گیا آخر موسمِ بہار ۱۹۲۳ء کے آغاز میں یہ ذوق "پیمانہ" کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ اور اب زندگی یکسر کیف و سرور کی روحانیت سے مست رہنے لگی۔ شاگردوں کا مجموعہ بہت عجلت و وسعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ اور یہ دور

میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ یکایک ایک غلط مشورے کے ماتحت مجھے اپنا ادبی مستقر لاہور منتقل کرنا پڑا۔ یہ انقلاب بہت غیر خوشگوار ثابت ہوا۔ پنجاب کی آب و ہوا مجھے اور میرے متعلقین کو قطعاً راس نہ آئی اور بالآخر طبی مشورے کے مطابق مجھے واپس آگرے آنا پڑا۔ مثنوی مولانا روم کے چھ دفتروں کا مکمل اردو ترجمہ اسی زمانہ قیامِ لاہور کی یادگار ہے۔

آگرے واپس آیا تو یہاں جی نہ لگا۔ اتفاق سے سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ریاست کی ادارت کے لئے دہلی بلایا۔ طبیعت غیر آسودہ تھی ہی۔ چلا گیا۔ اور "پیمانہ" کا ایک نمبر بھی وہاں سے نکالا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں اپنے وطن میں پاؤں توڑ کر بیٹھوں اور یہاں میری ادبی مرکزیت قائم رہے چنانچہ ۱۹۲۹ء سے اپنے وطنی مستقر پر قائم و باقی ہوں۔

طبیعت نئے نئے مشاغل ڈھونڈتی رہی۔ مرکزیت کی بار بار تبدیلی سے "پیمانہ" چھلکنے لگا۔ اس کے دورِ اشاعت میں اضمحلال سا پیدا ہوگیا۔ ۱۹۲۹ء سے ہفتہ وار "تاج" جاری کیا جو میرے سیاسی خیالات و افکار کا ترجمان تھا۔ پھر ۱۹۳۰ء سے "شاعر" کا اجرا ہوا۔ "پیمانہ" اب بھی جاری تھا۔ مگر طلب الکل فوت الکل "وسعتِ کار"، فراوانیٔ مشاغل اور گوناگوں مصروفیات نے پریشان کر دیا۔ آخر ۱۹۳۲ء میں "پیمانہ" بند کر دینا پڑا۔ "تاج" ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ بالآخر اس سے بھی دست کشی اختیار کرنی پڑی۔ جریدۂ "شاعر" جاری رہا۔ جو اب تک جاری ہے۔
ان تمام انقلابات کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف گوشہ ہائے زندگی میں آوارہ خرامی کے بعد بالآخر ذہنی و عملی آسودگی کی منزل وہ ہی "شعر و شاعری" رہی، جو میرا منشائے تخلیق تھی، اور جس کو نظر انداز کر دینا تکلیفِ فطرت تھا۔

مشاعروں کی شرکت

ہندوستان کا کوئی مشہور اور بڑا شہر ایسا نہیں (سوائے پشاور، کراچی، اور مدراس کے) جہاں میں نے متعدد مشاعرے نہ پڑھے ہوں۔ حضرت جلال لکھنوی مرحوم، حضرت کمال مرحوم، خلفِ حضرت جلال لکھنوی۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم، حضرت طاہر فرخ آبادی مرحوم، جناب جاوید لکھنوی مرحوم، حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم، جناب عزیز لکھنوی مرحوم حضرت وسیم خیرآبادی مرحوم، حضرت حافظ بیلی بھیتوی مرحوم، حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب نوبت رائے

صاحب نظرؔ لکھنوی مرحوم، حضرت تجملؔ جلالپوری مرحوم، حضرت چکبستؔ لکھنوی مرحوم، کے دوش بدوش مشاعروں میں شریک ہوا ہوں۔ اور ساحر موجودہ میں حضرت حسرتؔ موہانی، حضرت سائلؔ دہلوی، حضرت آغا شاعرؔ دہلوی، حضرت بیخودؔ دہلوی، حضرت فانیؔ بدایونی، حضرت احسنؔ مارہروی، حضرت نوحؔ ناروی مولانا صفیؔ لکھنوی، حکیم آزادؔ انصاری، مولانا شفیقؔ عماد پوری، مولانا تمناؔ عماد پوری، حضرت جلیلؔ مانکپوری حضرت قمرؔ بدایونی، اور جناب بزمؔ اکبرآبادی، کے ساتھ سیکڑوں مشاعرے پڑھے ہیں۔ مگر اب طبیعت مشاعروں سے گھبراتی ہے۔ اور ساری رات جاگنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے مشاعروں کی شرکت متعذر سی ہے۔

معنوی و صوری اولاد خدائے قادر و قیوم نے اپنے فضل و کرم سے اولاد بھی دی، عزت بھی دی، ثروت بھی دی، اور نام بھی دیا۔ ان نعمتوں کا اخفا کفرانِ نعمت ہے۔ چار لڑکے اور دو لڑکیوں میں بفضلہ اب چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ جن کے نام بہ ترتیب عمر یہ ہیں۔

تمنا حسین منظرؔ، جمیلہ خاتون، اعجاز حسین اعجازؔ، سجاد حسین، مظہر حسین، اسلمہم اللہ تعالیٰ اجمعین، لیکن معنوی اولاد خدا نے مجھے اتنی دی ہے کہ شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ صوبہ سرحد، پنجاب اور بلوچستان سے لے کر عدن تک سیکڑوں شاگرد موجود ہیں۔ اور ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں یہ میری معنوی اولاد موجود نہ ہو۔ ان میں مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ غرضکہ ہر فرقے کے لوگ ہیں۔ جن میں بکثرت بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور فاضل ادب ہیں۔ اور مدرس، ہیڈ ماسٹر، پروفیسر، وکیل، ایڈیٹر، رئیس و والیانِ ملک بھی ہیں۔ خدا ان سب کو زندہ و پائندہ رکھے، اور ان کے ذوق کی تکمیل فرمائے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء و اللہ ذوالفضل العظیم۔

میری ناچیز خدمات چونکہ سنِ شعور کو پہونچتے ہی کدوراتِ حیات نے گھیر لیا اس لئے میری زندگی کا زیادہ حصہ غیر مطمئن گذرا۔ اس کے باوجود میں حیران ہوں کہ فطرت نے وہ کام مجھ سے کب اور کس طرح لے لئے جن کی انجام دہی میرے بس کی نہ تھی۔ تالیف و تصنیف کا شوق مجھے عہدِ طفولیت سے ہے اس وقت تک ۲۰۴ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہینِ کشش ہیں۔

جو ناشران کتب سے حقِ تالیف لے کر میں نے لکھیں۔ ان میں خواتین کے لئے لٹریچر بھی ہے۔ تاریخ بھی ہے۔ جامع الخطب اور عزیز الخطب، خطباتِ عربی کے منظوم تراجم ہیں۔ الہامِ منظوم، ترجمہ مثنوی مولانا روم کے چھ دفتروں کا مکمل ترجمہ مولوی فیروز الدین لاہوری کی فرمائش پر کیا۔ یہ بھی چھ جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ سیرۃ الحسینؑ۔ سیرۃ الکبریٰؓ۔ نبوت الرسولؐ سیرۃ و تاریخ میں ضخیم کتابیں ہیں۔ ادبی موتی کے نام سے چار کتابیں شریک نصاب ہیں۔ ۱۲ ڈرامے اور ۲۲ مراثی بھی لکھے مثلاً۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے لکھی۔ سیرۃ الکبریٰؓ۔ کا ترجمہ گجراتی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

جو کتابیں میرے قائم کردہ ادبی مرکز "قصر الادب" کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

کارِ امروز ۔ میری قومی اخلاقی اور ادبی نظموں کا مجموعہ

کلیمِ عجم ۔ خطباتِ شاعری اور غزلوں کا پہلا مجموعہ۔

نئے آستاں ۔ مذہبی نظموں کا مجموعہ۔

رازِ عروض ۔ علمِ عروض کے ابتدائی مسائل و مباحث۔

جو کتابیں زیرِ تصنیف و ترتیب ہیں اُن کے نام یہ ہیں:۔

مرآۃ المطالب ۔ جدید شرح دیوانِ غالب۔ الفاظ کے معنی اور مطالب و مفہوم کی توضیح کے ساتھ۔

پیامِ فردا ۔ ادبی، اخلاقی اور اصلاحی نظموں کا دوسرا مجموعہ۔

توراتِ مشرق ۔ غزلوں کا دوسرا دیوان۔

آیاتُ الادب ۔ رباعیوں کا مجموعہ۔

شاہراہ ۔ فنِ شاعری پر ایک مفصل کتاب۔

پیغامات ۔ وہ منظوم پیغام جو سیاسی نقطۂ نگاہ سے جرائد "تاج" و "شاعر" کے ذریعے مختلف افرادِ عالم کے نام دیئے گئے ہیں۔

اساطیر ۔ میرے لکھے ہوئے افسانے۔

شاعر کی راتیں ۔ اُن مشاعروں کے دلچسپ حالات جن میں میں شریک ہوا ہوں۔

شعرِ منثور ۔ وہ ادبی شذرات جو وقتاً فوقتاً میرے قلم سے نکلے ہیں۔
منہاج الادب ۔ مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین کا مجموعہ۔
کلجگ ۔ ڈراما۔

اگر توفیقِ الٰہی رفیقِ حال اور زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ یہ تمام کتابیں یکے بعد دیگرے آپ کی نگاہوں سے گذریں گی۔ اور یہ سب "قصر الادب" کی ملکیت ہونگی۔ واللہ المستعان علیٰ ما تصفون۔

ان تصنیفی خدمات کے علاوہ من حیث الشاعر میں ہمیشہ نظرِ اصلاح رہا ہوں۔ مشاعروں میں خطبہ خوانی کا رواج، مناظموں کا رواج، آگرہ اسکول کی تاسیس، مشاعروں کا جدید نظام، یہی میری ناچیز خدمات سے تعلق ہیں۔ خدا میری ان مساعی کو کامیاب فرمائے۔ اور مجھے خدمتِ ادب کے مزید مواقع و امکانات سے بہرہ مند کرے۔

میرے شاعرانہ معتقدات

اوائلِ مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا۔ رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ حالانکہ میرے رنگِ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر متین، اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۰ء سے میرا رنگِ تغزل بالکل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اُس کے متعلقات ہوں، یا جوامرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشقِ محض ہے۔ اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو جمالِ حسن اور مرکزِ محبت ہے۔ جس طرح علم ہشاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ اور خیالات میں تصنع یا بوٹ کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے۔ گر میں نظم، غزل، اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کار آمد نہیں۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ مبتدی شعرا کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے مگر "نظم" کا میدان ہنوز وسیع ہے۔ اور یہ صنفِ سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونی چاہیئے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے"۔ کائنات بغیر "شاعر" کے ایک سازِ بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و وحی کا وہ سلسلہ جو پیغمبروں کے مبعوث نہ ہونے سے ختم ہو چکا ہے "شاعر" کے دماغ اور سرورش میں اب بھی باقی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

یہ میری ۵۵ سالہ زندگی کے شاعرانہ حصے کی روداد ہے جسے میں نے بے کم و کاست اپنے قلم سے لکھ دیا۔ زندگی کے باقی حصوں میں کوئی ایسی دلچسپ بات نہیں۔ جو قابلِ گذارش ہو۔ دراصل زندگی اسی دور سے عبارت ہے۔ جو ذوقِ شعر کی کیفیات و سرخوشی میں گذرا۔ باقی بچپن اور جوانی میں مافوق الانسانیت کوئی خصوصیت نہ تھی اور اب جوانی گذر جانے کے بعد تو بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

بزمِ افسانہ کرو ختم جوانی گذری
قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہیں

میں شعر کیونکر کہتا ہوں؟

اس عنوان کی توضیح کے لئے مجھے اپنی عمرِ شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

پہلا دور (۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک) میری طبیعت ۱۸۹۲ء سے شعر کہنے کی طرف فطرتاً مائل ہوئی۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال سے زیادہ تھی جس وقت جو کتاب یا بیاض میرے سامنے آگئی۔ میں نے اس پر پنسل یا قلم سے ایک شعر لکھ دیا۔ یہ شعر فی الحقیقت اُن سنے سنائے اشعار کا چربہ ہوتا تھا۔ جو بیرونی فضا سے کسی نہ کسی طرح کانوں تک پہونچتے رہتے تھے۔ یا جنھیں میں اپنی ابتدائی درسی کتابوں میں پڑھتا تھا۔ رفتہ رفتہ شعر کہنے سے ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہونے لگی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سب اشعار موزوں ہوتے تھے یا ناموزوں۔ لیکن میں نے بالآخر ایک وقتِ خاص اس روحانی و ذہنی لذت سے تکیف ہونے کیلئے مقرر کر لیا اب میں اچھے کاغذ کی چھوٹی نفیس بیاض بنوا کر اُن پر اپنے اشعار لکھنے لگا۔ قاعدہ یہ تھا کہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں چراغ شمعدان پر رکھ لیتا اور فکر کرنے لگتا۔ جس زمین میں شعر کہتا اُس کے تمام قوافی جو بقدرِ معلومات مجھے اُس وقت یاد آتے پہلے ایک کاغذ پر لکھ لیتا۔ اور پھر اُنھیں کی مناسبت سے شعر کہتا۔ اس زمانے میں شعر کے موزوں یا غیر موزوں ہونے کا سوال نہ تھا۔ بلکہ یہ خبط تھا کہ کسی طرح شعر کہوں اور روز کہوں۔ یہ خبط بڑھتے بڑھتے بتدریج ذوق میں تبدیل ہو گیا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں محرم کے زمانے میں والدۂ ماجدہ (نور اللہ مرقدہا) کے ساتھ ہر سال اجمیر سے آگرہ آتا۔ تو ساتویں تاریخ کو اپنے محلے کے عزا خانے میں کچھ اُلٹے سیدھے اشعار ضرور پڑھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں واقعی شاعر ہوں۔ چھ برس تک ذوقِ سخن کا یہی حال رہا۔ مگر اس دور کی کوئی غزل اب محفوظ نہیں۔

دوسرا دور - (۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک) جب ۱۸۹۸ء میں بعد تلمذ میری باقاعدہ نہائی

ہونے لگی تو اب مجھے شعر کہنے میں ایک حقیقی مسرت حاصل ہونے لگی۔ اب میرے شعر کہنے کا طریقہ یہ تھا کہ طعام دنا ز سے فارغ ہونے کے بعد میں کرسی پر بیٹھ جاتا۔ میز پر طشت میں پان، الائچی، چھالیا، زنگیں، لکھنؤ کا قوام وغیرہ ہوتا۔ اور کرسی کے پاس حقہ؛ چھوٹی میز پر سگریٹ کیس۔ ان سامانوں کے ساتھ میں رات کے ایک بڑے حصے تک شعر کہنے میں مصروف رہتا۔ اور اکثر ۳۰-۴۰ اشعار ایک ہی نشست میں کہہ ڈالتا۔ پھر ان میں سے اچھے اشعار منتخب کر کے صبح ایک غزل بنا لیتا۔ اور اصلاح کے لئے بھیجا کرتا تھا۔

قافیہ پیمائی کا مرض ہنوز موجود تھا۔ مگر اب اسکی نوعیت یہ تھی کہ جس زمین میں جو قافیہ زیادہ دشوار ہوتا میں اس پر کئی کئی شعر کہتا۔ اور آسان قافئے علی العموم ترک کر دیتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء تک شعر کہنے کا کم و بیش یہی دستور رہا۔ مشق کے ساتھ ذوق جس قدر پختہ ہوتا گیا۔ خیالات میں آمد آمد اسکی سنجیدگی اور بالیدگی پیدا ہونے لگی۔ اُستاد کا سایہ میرے سر سے اٹھ چکا تھا۔ اُن کے بعد کسی کو غزل دکھانا خودداری نے گوارا نہ کیا۔ پہلے جو شعر بہ اُمید اصلاح کہا جاتا تھا اُسکی خامیوں پر نگاہ کم رہتی تھی کہ اگر کوئی نقص ہوگا تو اصلاح میں نکل جائے گا۔ اب ذمہ داری محسوس ہونے لگی۔

اب تک یہ تکلف باقی تھا کہ جب کسی مشاعرے کے لئے غزل کہنی ہوتی تو پہلے غسل کرتا۔ پھر مکلف لباس پہنتا۔ کچھ خوراکہات، کچھ سگریٹ، کچھ پان میز پر ضرور موجود ہوتے۔ اس کے بعد غزل کہتا۔ دس بارہ سال کی مشق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب غزل اُٹھتے بیٹھتے ایک دن میں پوری ہو جاتی تھی۔ اور ایک دن نظر ثانی میں صرف ہوتا تھا مشاعرے کی اطلاع گویا عید کی نوید ہوتی تھی۔ مشاعرے میں شرکت کا اہتمام دو ایک روز پہلے سے کیا جاتا تھا۔ لباس میں جو الحاقی و اضافی چیز کم ہوتی وہ بازار سے خرید کر اُس دن ضرور لائی جاتی تھی۔ اور بڑے کرّوفر اور شاعرانہ افتخار کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی جاتی تھی۔

تیسرا دور (سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک) یہ زمانہ بھی ملازمت کا تھا۔ اس لئے دن کو شعر کہنے کے لئے اچھا موقع نہ ملتا۔ تاہم کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا کہ میں معاشی کاروبار ختم کر کے دن کا کچھ حصہ شعر کہنے کے لئے نہ نکال لیتا۔ وہ ذوق و شوق کے زمانے، ولولے اور اُمنگوں کے دن، ذہن و دماغ کی آزادی کا موسم، دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا۔ ادھر شاگردوں کا ہجوم بڑھا۔ اُدھر قبولیت و شہرت شریکِ حال ہوئی۔ اب دوسروں کی

ذمہ داری بھی شریکِ احساس تھی۔ رفتہ رفتہ جو چیز ذوقِ طبیعت تھی۔ وبالِ طبیعت ہو گئی۔ تکلف برطرف جہاں اور جب ضرورت ہوئی قلم جیب سے نکالا اور نظم یا غزل جو کچھ کہنی ہوئی کہہ ڈالی، نہ اب اچھی جگہ کی ضرورت تھی۔ نہ بانِ الائچی کی احتیاج۔ نہ لباس کی پابندی۔ نہ وقت کی قید۔ غرضکہ طبیعت تمام قیود سے آزاد ہو گئی۔ مگر رات کو بستر پر جانے کے بعد شعر کہنے کی عادت اب بھی باقی رہی۔

چوتھا دور۔ (۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک) مشق کا زمانہ ۱۹۱۰ء میں ختم ہو چکا تھا۔ پندرہ سولہ سال کسی کام کی مشق کے لئے کم نہیں ہوتے۔ پھر چودہ پندرہ سال تک ذمہ دارانہ حیثیت سے غزل یا نظم کہتے رہنا فنِ شاعری پر عبور حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے اب شاعری کے تمام مرحلے طے ہو چکے تھے۔ شعر زادن و شعر گفتن کا فرق و امتیاز اس زمانے میں معلوم ہوا۔ مجھے اب شعر کہنے میں وہ کوفت نہ ہوتی تھی۔ جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اول اول شعر کہتے وقت ایک ایسا ذہنی ماحول پیدا ہو جاتا تھا جس میں نسائیات و نفسانیات کا غلبہ ہوتا تھا۔ مگر اب میرا ماحول قطعاً روحانی اور مادیات کے تصور سے بھی خالی تھا۔

۱۹۱۸ء سے شعر کہتے وقت میں ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہوں۔ جہاں ظواہر اور رسمیات کی گنجائش نہیں۔ جہاں ایک محیطِ سرور و لذت میں میری روح اور دماغ دونوں سرخوش ہوتے ہیں۔ جہاں حسن بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ مگر معصوم اور ازلی، اور جہاں محبت بحدِ غایت ہوتی ہے مگر بے لوث اور ابدی، اب بعض اوقات بغیر فکر بھی شعر دماغ پر نازل ہو جاتا ہے۔ آسودگیٔ خلوت، شورشِ محفل، لوگوں کا ہجوم، رباب و سرود کی آوازیں، ریل کی گھڑگھڑاہٹ۔ موٹروں اور تانگوں کی سماعت خراش رفتار میرے شعر کہنے میں حائل و مانع نہیں ہوتی۔ اب میں چلتے پھرتے "اٹھتے بیٹھتے" اور دورانِ گفتگو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ اب میرے لئے شعر کہنا اور باتیں کرنا برابر ہے۔ البتہ جب کثرتِ افکار سے دل پریشان اور دماغ پراگندہ ہوتا ہے تو مجھ سے شعر نہیں کہا جاتا۔

مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کرتے وقت میں نے "دو" دو سو شعر ایک دن میں کہے ہیں۔ "کارامروز" کی جدید نظمیں صرف بیس روز کا نتیجۂ فکر ہیں۔ اور یہ کام اس وقت ہوئے ہیں جب تین تین اخباروں اور رسالوں کی نگرانی وادارت بھی میرے ذمہ تھی ہمت پر فرض تھی تلامذہ کو اصلاح دینا" ذاتی خطوط کے

جواب لکھنا، اور بیرونی رسائل کی فرمائشوں کی اطلاعاً تعمیل کرنا بھی اسی انہماک کے ساتھ ساتھ تھا۔

برسات میں جب ابرِ سیاہ آسمان پر چھایا ہوا ہو۔ اور ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا ہو۔ اُس وقت میں بے ضرورت بھی شعر کہنے لگتا ہوں۔ یہ موسم مجھے ہر فصل سے زیادہ محبوب ہے۔ منشیات سے مجھے کبھی ذوق نہیں رہا۔ پان کھانا بھی چار سال سے متروک ہے۔ اب صرف حقہ یا سگرٹ خیالات کو یکسو کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ باقی شعر کہنے کے لئے مجھے کسی سامان کی ضرورت نہیں۔

دورِ موجود — ۴۴ سال تک فکرِ سخن کرنے کے بعد اب شعر کہنے کا طریقہ یہ رہ گیا ہے۔ کہ جس وقت چاہتا ہوں، خلوت ہو یا جلوت، باغ ہو یا جنگل، ایوان ہو یا جھونپڑا، سمندر کا ساحل ہو یا کوہسار کی چوٹی مسہری ہو یا تخت، کرسی ہو یا مسند کسی مصرع کو دو چار بار ذہن میں گردش دی اور خاموش بیٹھ گیا، دو منٹ کے بعد سانچے میں ڈھلے ڈھلائے شعر کاغذ پر برسنے لگتے ہیں۔ جن پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر نظرِ ثانی کرتا ہوں تو شعر میں وہ الوہیت و بداہت نہیں رہتی۔ جو دماغ سے نکلے ہوئے پہلے شعر میں ہوتی ہے۔

جب آدھی رات کو بیدار کر کے بھی آپ مجھ سے کوئی غزل، نظم یا قطعۂ تاریخ، وغیرہ لکھوا سکتے ہیں تو پھر اب کیا بتاؤں کہ میں شعر کیونکر کہتا ہوں؟ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دماغ مجسم اشعار اور طبیعت یکسر شاعری بنکر رہ گئی ہے۔ اُدھر کسی بحر کا کوئی مصرع دماغ میں گونجا ادھر قلم سے اشعار برسنے لگے۔ ادھر نظم کے لئے کوئی عنوان یا موضوع سامنے آیا ادھر ذہن نظم کا موزوں خاکہ کھینچنے لگا۔ بعض اوقات تو قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے۔ اور بندہ لکھ رہا ہے۔

قصر الادب آگرہ
۱۴- دسمبر ۱۹۳۵ء

سیمابؔ وارثی
اکبرآبادی

متروکات

زبان کی صفائی، اور تحفظ فصاحت کے لئے بعض متروکات کی پابندی لازمی ہے۔ چونکہ مجھ سے اکثر اس قسم کے استفسارات کئے جاتے ہیں۔ اس لئے جو الفاظ میں متروک کر چکا ہوں اُن کی ایک فہرست یہاں دی جا رہی ہے۔

الفاظ	تشریح	الفاظ	تشریح	الفاظ	تشریح
آبھی	به اختلاط ہائے ہوز	وہم بسمل	یعنی وقتِ ذبح	ایجان	خطاب بہ محبوب
انجھی		دلا، ناصحا	بہ استثنائے خدایا ساقیا	مریجان	
اوپر	علی اور پر کا ترجمہ	دکھلا	بہ زیادتی لام	قران	بقافیۂ پیران
آخرش	بجائے "آخر"	تپلا وغیرہ		سدا	یعنی ہمیشہ
آن کر	بجائے "آ کر"	مت	حرفِ نفی	قدم دینا	بجائے قدم رکھنا
بل بے	کلمۂ تحسین	واں	بجائے یہاں وہاں	ٹھیرنا	بجائے ٹھہرنا۔
پراور پہ	گر اور لیکن کے معنی میں	یاں		سو	پس کی جگہ
پہناما	پہنانے کی جگہ	اس طرح پہ	بجائے اس طرح	تلے	بجائے نیچے
تب	جب کا مرادف	اسی طرح سے		کاہے کو	بجائے کس لئے
تلک	تک کا مرادف	کیجے	بجائے کیجئے دیجئے	کیسے	بجائے کیوں کر
جاناں	بہ انفراد	دیجیے		وصلت	بجائے وصل
جانانہ		حضور	خطابِ محبوب	قافیۂ معمولہ	خواہ ترکیبی ہو یا تحلیلی
خنجر	بقافیۂ قمر	جناب		اعلان نون	جیسے رگِ جان
دہرنا	رکھنا کا مرادف	کیونکر	بجائے کیونکر	(بالاضافت)	

مختارات

(۱) میں آغوش، اخلاط، فکر، التماس، اور فاتحہ کو مونث کہتا ہوں۔

(۲) "لفظ غور" اور "نقاب" میرے یہاں مذکر ہے

(۳) جو الفاظ انفرادی صورت میں مونث ہیں اُنکی جمع بھی مونث ہی لاتا ہوں۔ اور مذکر واحد کا تثنیہ بھی مذکر ہی کرتا ہوں۔

(۴) میں شعر میں قید "ایطا" کا قائل نہیں لیکن احتیاط اولیٰ سمجھتا ہوں۔

(۵) "اور" بہ حذف و اخفائے واؤ میرے یہاں جائز ہے۔

(۶) اٹھا، اُٹھے، رکھا، رکھے وغیرہ بغیر تشدید بھی میرے یہاں جائز ہیں

فہرست غزلیاتِ "کلیم عجم"

نشیدِ نو

سنہ ۱۹۱۹ عیسوی تا سنہ ۱۹۳۵ عیسوی

بادۂ دوشیں

سنہ ۱۹۰۹ عیسوی تا سنہ ۱۹۱۸ عیسوی

صہبائے کہن

۱۸۹۸ سنہ عیسوی تا ۱۹۰۸ سنہ عیسوی

صحت نامہ حصۂ نظم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۲	۵	میں سے در جام رکت	کہیں سے جام ذرکت	۳۳۸	۱۲	دل کا	اپنے
۲۲۳	۹	کھلے	کھلے	۳۴۹	۱۰	نگہ	جگہ
۲۵۳	۱۱	عالم سکون	عالم سکوں	۳۶۸	۱	سلسلۂ	سلسلہ
۲۵۶	۲	شمع زندگی	شمع زندگی	۳۷۳	۱	دعدہ	دعدہ
۳۱۱	۱	انسان	انساں	۳۸۵	۷	میرے سامنے	تیرے سامنے
۳۱۸	۱۲	ظاہر نہاں	ظاہر و نہاں	۳۹۸	۱۰	دو	دو
۳۲۸	۱۰	وہی پہلا	نہیں پہلا			——	

صحت نامۂ خطباتِ شاعری

اس صحت نامے سے کتاب کی غلطیاں قبلِ مطالعہ صحیح کر لیجئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۱	قالین	قالیں
۱۰	۶	غیر متاثر	غیر شاعر
۱۰	۱۲	تمین	ثُنین
۱۱	۱۳	بطور واضح کردینا چاہتا ہو	واضح کردینا چاہتا ہوں
۱۲	آخری سطر	مخلوطِ زبان	مخلوط زبان
۱۷	۳	زمالے	زمانے
۲۰	۱۲	حلومت	حکومت
۳۰	۱۵	ادلی	ادبی
۳۲	۱	کبھی وزن یعنی الفاظا	کبھی وزن یعنی الفاظ
۴۸	۲۱	شاگر رشید	شاگرد رشید
۵۲	۷	فتس	قفس
۸۹	۳	محررہ دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	محررۂ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء
۱۰۳	۴	۲ر دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	۲ر دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء
۱۱۶	۹	شاعوے	مشاعرے
۱۱۹	۱۲	کارردان	کاروان
۱۲۳	۱۰	مھتم بالشان	مہتم بالشان
۱۲۶	۱۴	کرتے رہیں	کرتی رہیں
۱۲۹	۱۸	غیر مفید ہوں لی	غیر مفید ہونگی
۱۲۹	۲۰	کون لون	کون کون
۱۳۱	۱	کہ ں مشاعرون	کہ اِن مشاعرون
۱۳۸	۳	معتقد ت	معتقدات
۱۳۸	۵	سیاسی مصاح	سیاسی مصالح
۱۴۰	۳	متاتر	متاثر
۱۵۲	۵	مادر المثال	نادر المثال
۱۵۴	۹	صوفیالے	صوفیانے
۱۵۴	۱۶	سمجھاجاتا	سمجھا جائے
۱۵۵	۲	مشارٌ الیہ	مشارٌ الیہ
۱۶۲	۶	تیل کا چراغ	تیل کے چراغ
۱۶۶	۳	سنہ ۱۸۹۸ء	سنہ ۱۹۱۳ء
۱۶۶	۸	مغفرت کرکے	مغفرت کرے
۱۶۹	۲	عزیزا کخلب	عزیز الخلب
۱۷۱	۷	علی ادر بر کا ترجمہ	علی اوبر کا ترجمہ

برقِ ایمن را صلائے بازگشت
آنچہ موسیٰؑ کرد ما ہم می کنیم

سیماب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عروسِ فطرت، مری نگاہوں پہ چھا رہا ہی شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہی جمال زیرِ نقاب تیرا
زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہی تو
حدوث کی خستہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا
اگرچہ صبر آزما بہت ہے تری خموشی و پردہ داری
مگر ہے دامن کشِ عقیدت سکوت تیرا حجاب تیرا
جلال و جبروت نے لگا دی ہی مُہرِ حیرت زبان و لب پر
جبال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارۂ انقلاب تیرا
غمِ عذاب و ثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں

نہ اختیاری کرم ہے تیرا، نہ اختیاری عتاب تیرا
ترے جلال و جمال ہی سے ہی اعتدالِ مزاجِ عالم
کبھی غضب بے پناہ تیرا، کبھی کرم بے حساب تیرا
نہ حسن پرتو سے تیرے خالی، نہ بے نیازِ آب و رنگ مجھے
تمام کافر جوانیوں پر برس رہا ہے شباب تیرا
تو محوِ آرائشِ مسلسل ہے اپنے جلووں کی انجمن میں
اک آئینہ ماہتاب تیرا، اک آئینہ آفتاب تیرا
مری رسائی سے دُور ہی تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہو گا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا
جبیں سے دل تک بھری ہوئی ہی خلش ترے عشقِ جاں گزا کی
ترے ارادے کو ہو مبارک، کہ دردِ ہے کامیاب تیرا
ہی روح سیماب ساز تیرا، تو سوز بن کر نہاں ہی اس میں
تڑپ رگِ جاں میں ہی یہ کس کی؟ اگر نہیں اضطراب تیرا

اکہ ترا وجود ہے آئینہ کائنات کا　　　ذوقِ نگاہ کو دیا تو نے تجلیات کا
تیری نمود، ارتقا جلوہ گہِ حیات کا　　　تیرا ورود معجزہ عالمِ ممکنات کا
کھینچ دیں اصل و فرع میں صافِ حدودِ امتیاز　　　ذہن و نظر کو دیدیا علم صفات و ذات کا
محشرِ ہست و بود سے جادۂ نو نکال کر　　　رنگ کچھ اور کر دیا شورشِ کائنات کا

تیرگیٔ جمود سے زندگیاں ہوئیں طلوع ۔۔۔ عقدہ کیا جو تونے حل فلسفۂ حیات کا

کشمکشِ مآل سے روح کو کر دیا رہا ۔۔۔ آخری رہنما ہے تو مرحلۂ نجات کا

دَیرِ خودی و کبر میں تونے اذانِ صبح دی ۔۔۔ تیرا جمالِ زندگی، چاند ہے پچھلی رات کا

رہنے دی محوِ بیخودی خاطرِ پُرخروش کو، ۔۔۔ راز کہیں نہ فاش ہو قیدِ تعینات کا

اے دل و جانِ وارثی، نور و ضیائے زندگی
تجھ سے فروغ ہے مری ہستیٔ بے ثبات کا

اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا ۔۔۔ عرفانِ غم ہوا مجھے دل کا پتا ملا

جب دور تک نہ کوئی فقیر آشنا ملا ۔۔۔ تیرا نیاز مند ترے در سے جا ملا

منزل ملی۔ مراد ملی۔ مدعا، ملا ۔۔۔ سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا

خودبین و خودشناس ملا خودنما ملا ۔۔۔ انساں کے بھیس میں مجھے اکثر خدا ملا

سرگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ ۔۔۔ ہر ذرے کے حجاب میں اک آئینا ملا

پایا تجھے حدودِ تعین سے ماورا ۔۔۔ منزل سے کچھ نکل کے ترا راستا ملا

کیوں یہ خدا کے ڈھونڈنے والے ہیں نامراد ۔۔۔ گذرا میں جب حدودِ خودی سے خدا ملا

یہ ایک ہی تو نعمتِ انسان ساز تھی ۔۔۔ دل مجھ کو مل گیا تو خدائی کو کیا ملا؟

یا زخمِ دل کو چھیل کے سینے سے پھینک دے ۔۔۔ یا اعتراف کر کہ نشانِ وفا ملا

سیماب کو شگفتہ نہ دیکھا تمام عمر
کم بخت جب ملا ہمیں غم آشنا ملا

جاگ اور دیکھ ذرا عالمِ ویراں میرا
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

تو بھی اب چاہے تو ممکن نہیں درماں میرا
مرض الموت ہے ظالم غمِ پنہاں میرا

فطرت آرائے جنوں ہے تنِ عریاں میرا
میری بے چارگیاں ہیں سرو ساماں میرا

بند آنکھیں کئے یوں جاگ رہا ہوں شبِ غم
کہ انھیں آئے نظر خوابِ پریشاں میرا

ہے پریشانیٔ دل کا یہی صرف ایک علاج
پوچھ لو حال بہ اندازِ پریشاں میرا

شمع سوزاں ہے مرا دل بھی، مگر فرق یہ ہے
جل کے پھر بجھ نہیں سکتا دلِ سوزاں میرا

غلبۂ یاس بجا، شدتِ حرماں معلوم
میں سمجھتا ہوں کہ مرنا نہیں آساں میرا

مدتوں بوئے وفا آئے گی بت خانوں سے
عود بن بن کے جلا ہے دلِ سوزاں میرا

مجھے پروائے تغافل نہیں، شکوہ یہ ہے
کہ ترے علم میں کیوں ہے غمِ پنہاں میرا

عشق دیدار طلب، حسن تمنا آزار،
ہو چکا تم سے علاجِ غمِ پنہاں میرا

توڑ کلیاں، گرائے خانہ برانداز چمن
عرض یہ ہے کہ نشیمن نہ ہو عریاں میرا

تمھیں کیوں مضطراب ہی خرابی اسکی
تم تو کہتے تھے کہ گھر ہے دلِ ویراں میرا

پڑ گئی کس کی نگاہِ تبسم سیماب
ہو گیا حرفِ غلط دفترِ عصیاں میرا

جلوہ گاہِ دل میں مرتے ہی اندھیرا ہو گیا
جس میں تھے جلوے ترے وہ آئینہ کیا ہو گیا

پھر تصور نے بڑھا دی نالۂ موزوں کی لَے
پھر فضائے درد میں اک شور پیدا ہو گیا

برہمن کہتا تھا "انحد" شیخ بول اٹھا "احد"
نکتہ رس دونوں نہ تھے، آپس میں جھگڑا ہو گیا

نجد کے ہرنوں سے اعجازِ محبت پوچھئے
پڑ گئی جس پر نگاہ قیس لیلےٰ ہوگیا
جان دیدی میں نے تنگ آکر وفورِ درد سے
آج منشائے جفائے دوست پورا ہوگیا
اب کہاں یادوسیوں میں ضبط کی گنجائشیں
وہ بھی کیا دن تھے کہ تیرا غم گوارا ہوگیا
دل کھچا جتنا قفس میں آشیانے کیطرف
دُور اتنا ہی قفس سے آشیانا ہوگیا

رفتہ رفتہ ہوگئے جذب اسمیں جلوے سینکڑوں
دل مرا سیماب اک آئینہ خانہ ہوگیا

روزِ فراق ہر طرف اک انتشار تھا
میں بے قرار تھا تو جہاں بیقرار تھا
نقشِ طلسم میرا دلِ داغدار تھا
تھا دن کو پھول - رات کو شمع مزار تھا
یادش بخیر - یاد ہیں دل کی مصیبتیں
پہلو میں اک ستم زدہٴ روزگار تھا
اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی،
تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا
وحشت طراز تھی کشش شامِ بیکسی
مرکز سے اپنے دور چراغِ مزار تھا
کیا دیتے ہم کسی کو دعائے سلامتی
اپنی ہی زندگی کا کسے اعتبار تھا

سیماب نالہ کرکے پشیمانیاں فضول
وہ کام کیوں کیا جو انھیں ناگوار تھا

سُنا ہے حسن کا مستقبل مسلک، وفا ہوگا
وفا ہے حسن کا جوہر کسی سے سُن لیا ہوگا
ہوس رکھا ہے اس نے نام جذباتِ محبت کا
نہ جانے اے مذاقِ دل ترا انجام کیا ہوگا؟
اٹھا ہے حسن پھر محفل سے پیغامِ وفا لے کر
نیا اب شیوہٴ آئینِ دنیائے وفا ہوگا

نیازِ عشق کو ہوگی اجازت باریابی کی　　اب اُن کے آستانِ ناز پہ سجدہ روا ہوگا
وفا و حسن مل کر اک نئی دنیا بنائیں گے　　نہیں معلوم کب ہوگا وہ عالم اور کیا ہوگا
جسے تکلیفِ احساس محبت میں سمجھتا تھا　　خدا رکھے وہ درمانِ دلِ درد آشنا ہوگا

وفا کے گیت جب حسن و محبت مل کے گائیں گے
وہ دورِ عاشقی سیماب کتنا دل رُبا ہوگا،

فضائے گوشۂ دل میں تجھے جب جلوہ گر دیکھا
مری نظروں نے حیرت سے مجھی کو عمر بھر دیکھا

توقع سے ترے فضل و کرم کو بیش تر دیکھا
مجھے شرم آگئی - جب اپنا دامن مختصر دیکھا

رہا لب تشنۂ تسکیں مرا امکانِ نظارہ
اگرچہ دیکھنے کی طرح تجھ کو عمر بھر دیکھا

تصوّر کی حدوں کو ناز تھا جن کی تجلّی پر
نظر والوں نے اُن جلووں کو تا حدِ نظر دیکھا

سب اپنے دل میں اک تیرِ نظر محسوس کرتے ہیں
مگر کوئی بتا سکتا نہیں اُس نے کدھر دیکھا

ترے سجدوں سے مطلب تھا۔ مکان و لامکاں کیسا
نہ ہم نے رہگذر دیکھی نہ ہم نے سنگِ در دیکھا

نظر آتا نہ تھا جو گردِ افکار و حوادث میں،
وہ ساحل آنکھ نے طوفانِ غم میں ڈوب کر دیکھا
نیازِ عشق کو آزادِ قیدِ رنگ و بو پایا،
جنوں کو بے نیازِ بندشِ دیوار و در دیکھا
دلِ یک قطرۂ خوں اور اُس میں سوز و اضطراب اتنا
ذرا سی چیز میں ہنگامۂ برق و شرر دیکھا
تمہارے سنگِ در کو سنگِ در اب کس طرح کہدوں
کہ جب سجدہ کیا سر کو جبینِ عرش پر دیکھا
وہ آئے نزع میں تجدید کرنے رسمِ الفت کی
بڑھا دی داستاں جب میرا قصہ مختصر دیکھا

عجب منزل تھی اے سیماب اپنی منزلِ ہستی
نہ دم لینے کی فرصت تھی نہ یارائے سفر دیکھا

دل ہے نظارۂ ہم جنس سے حیراں کیا کیا
محو ہے اپنی ہی تصویر میں انساں کیا کیا

دلربا عالمِ صورت میں ہیں انساں کیا کیا
حسن ہے خاک کے پتلے میں نمایاں کیا کیا

یاس کی موج جب اُٹھی تو سنبھالی نہ گئی
یوں تو اُٹھے مرے جذبات میں طوفاں کیا کیا

جب تصور میں وہ ہمراہ ہوا کرتے ہیں
شعر کہتا ہے مرا قلبِ غزل خواں کیا کیا

وہ عبا قیس کی، فرہاد کا وہ جامۂ تنگ
دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

طورِ موسیٰؑ، دلِ طائف، چمنستانِ خلیلؑ		یادگاریں ہیں تری جلوہ جا !! ں کیا کیا

لغزشیں دیکھ کر احسانِ کرم کو سیماب
جمع ہے خاطرِ اندیشہ بداماں کیا کیا

ہم ہیں سر تا بپا تمنّا		کیسی امید، کیا تمنّا!
ہو کتنی ہی خوشگوار پھر بھی		ہے دل کے لئے بلا تمنّا
دیتے ہو پیامِ آرزو تم		جب ترک میں کر چکا تمنّا
دنیا کو فریب دے رہی ہے		جلوہ ہے سراب کا تمنّا
اپنی منزل پہ ہم نہ پہونچے		جب تک رہی رہنما تمنّا
مابینِ نگاہ و جلوۂ حسن		ہے ایک حجاب سا تمنّا
اُلجھا رہا آرزو میں غافل		کیوں خود ہی نہ بن گیا تمنّا
آواز تو دو کسے پکاروں		تم ہو مرے دل میں یا تمنّا

سیماب مآلِ شوق معلوم!
اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی

جب مذاقِ نظر حسن آزما ہو جائے گا		لاکھ پردوں سے بھی وہ جلوہ نما ہو جائیگا
یہ نکما پن جمودِ دل کا اک انجام ہے		دل سے کوئی کام لے دل کام کا ہو جائیگا
برہمن اور شیخ میں ہے مدتوں سے گفتگو		تم کہیں جلوہ دکھا دو۔ فیصلا ہو جائیگا
صفحۂ تاریخ پر کام آئے گا میرا لہو		کم سے کم رنگین عنوانِ وفا ہو جائیگا

مصلحت یہ ہے خودی کی غفلتیں طاری رہیں
جب خودی مٹجائے گی بندہ خدا ہوجائیگا

طالبِ کل ہو کے، قوت الکل کی محرومی نہ لے
ایک کا ہوجا تو پھر سب کچھ ترا ہوجائیگا

پردۂ خلوت اُٹھا، پروانہ بن محفل میں آ
سوزِ دل خود درس آموزِ فنا ہوجائیگا

زندگی دو دن کی ہے لمبی سہی میعادِ قید!
آج آیا ہے قفس میں کل رہا ہوجائیگا

سو کے اُٹھنا بھی ہے اے سیماب دنیا میں محال
مر کے جی اُٹھنا مرا۔ اک معجزا ہوجائیگا

شکریہ ہستی کا! لیکن تم نے یہ کیا کردیا؟
پردے ہی پردے میں اپنا راز افشا کردیا

مانگ کر ہم لائے تھے اللہ سے اک دردِ عشق
وہ بھی اب تقدیر نے اوروں کا حصا کردیا

دو ہی انگارے تھے ہاتھوں میں خدائے عشق کے
ایک کو دل، ایک کو میرا کلیجا کردیا

جب تجلی اُن کی برق ارزانیوں پر آ گئی
آبلے سے دل کے پیدا طورِ سینا کردیا

میں تو اپنی بے خودیِ شوق کا ممنون ہوں
بارہا مجھ کو بھری محفل میں تنہا کردیا

واقعاتِ عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی
ہر نفس میں میں نے اک دامان پورا کردیا

مرحمت فرما کے اے سیماب غم کی لذتیں
زیست کی تلخی کو فطرت نے گوارا کردیا

جلوہ کوئی نگاہ میں باطل نہیں رہا
اب امتیازِ لیلیٰ و محمل نہیں رہا

یہ غم نہیں کہ شادِ مرادِ دل نہیں رہا
ماتم یہ ہے کہ میں ترے قابل نہیں رہا

بیدار اُسکا حسن رہا چشمِ خواب میں
مجھ سے تو نیند میں بھی وہ غافل نہیں رہا

ویراں ہے دل کہ تیرے تصوّر سے دُور ہے ـ یہ آئینہ بھی درخورِ محفل نہیں رہا
گُم ہوں رہِ طلب میں بقدرِ کمالِ ذوق ـ مجھ کو دماغِ ساحل و منزل نہیں رہا
آئے ہیں چارہ ساز بھی نشتر فروش بھی ـ جب میں دوا و درد کے قابل نہیں رہا
طوفاں نے زندگی سے مجھے سیر کر دیا ـ اچھا رہا کہ تشنۂ ساحل نہیں رہا
ممنون ہوں تری نگہِ دلنواز کا ـ اے دوست شکریہ مگر اب دل نہیں رہا

منظور اُن کو پرستشِ سیمابؔ ہے مگر
سیمابؔ عرضِ حال کے قابل نہیں رہا

جب تک غمِ الفت کا عنصر نہ مِلا ہوگا، ـ انسان کے پہلو میں دل بن نہ سکا ہوگا
خوابِ سرِ منزل سے مقصد نہ فنا ہوگا، ـ وارفتۂ حیرت کا دل ڈھونڈ رہا ہوگا
میں اور ترا سودا۔ تو اور یہ استغنا! ـ شاید مجھے فطرت نے مجبور کیا ہوگا
در پردہ گناہوں پر ہے ناز تجھے ناحق ـ جو دیکھنے والا ہے وہ دیکھ رہا ہوگا
اک دائرہ ذرّوں کا خورشیدِ طریقت تھا ـ شاید وہ تمہارا ہی نقشِ کفِ پا ہوگا
تم درد کے خالق ہو، میں درد کا بندہ ہوں ـ جب نام لیا ہوگا دل تھام لیا ہوگا
نغمہ وہ سُنا جس سے کونین تڑپ جائے ـ فریاد ہے بے معنی فریاد سے کیا ہوگا
میں علمِ تغافل پر نازِ تغافل ہوں ـ مجھ سا بھی نہ دنیا میں مجبورِ وفا ہوگا

سیمابؔ جب اس دل میں تصویر نہیں اُن کی
یہ آئینہ دھندلا ہے، یہ آئینہ کیا ہوگا

جو انتظار ترا وجہِ اضطراب نہ تھا　　تہا بتا کہ میں کیوں آشنائے خواب نہ تھا؟
مری سکوں طلبی بزمِ دوست میں معلوم　　وہاں تو میرا تڑپنا بھی مستجاب نہ تھا
مآلِ انس ہے میرا تباہ ہو جانا　　بجا کہا کہ تمہیں مجھ سے اجتناب نہ تھا
بنا لیا مجھے دریا نے جانشینِ حباب　　جہاں میں ڈوب کے اُبھرا وہاں حباب نہ تھا
لطیف تر تھی ترے انتظار کی تکلیف　　کہ اضطراب تھا اور پھر بھی اضطراب نہ تھا
مثالِ رنگِ زمانہ بدل گیا مجھ سے　　ترا مزاجِ وفا تھا مرا شباب نہ تھا
یہ اتفاق تھا سویا تو نیند آ ہی گئی　　مجھے تو قبر میں بھی اعتبارِ خواب نہ تھا
اک انقلاب زمانے میں تھا شباب کے بعد　　نظر اُٹھی تو کسی چیز پر شباب نہ تھا
ہزار رنگ کے پردوں میں چھپ کے پھیل گئے　　یہ اک ظہور کی ترکیب تھی حجاب نہ تھا
نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی　　میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا
یہ تیرا نقصِ طلب تھا کہ تو رہا تشنہ　　جو ڈھونڈتا تو یہ سارا جہاں سراب نہ تھا

بخیر حشر کا دن بھی گذر گیا سیمابؔ
ہوئی یہ خیر کہ میں گرمِ اضطراب نہ تھا

اے بیخبری دل کو دیوانہ بنا دینا　　ہر سانس کو مستی سے بیگانہ بنا دینا
ٹوٹا ہوا دل شمعِ بت خانہ بنا دینا　　جب رات ڈھلے ساقی، پیمانہ بنا دینا
پُرشور گھٹاؤں کا ممنون نہ ہونے دو　　تم کو بھی تو آتا ہے دیوانہ بنا دینا
دل سازِ وفا بھی ہے اور سوزِ نوا بھی ہے　　بنجائے تو ناقوسِ بت خانہ بنا دینا

ایسا نہ ہو یہ دنیا پھر ہوش میں لے آئے — دیوانے کی فطرت کو دیوانہ بنا دینا
اس گھر سے نکل کر بت آخر کہیں رہتے بھی — کعبے کی عنایت ہے بتخانہ بنا دینا
وہ نورِ چمن بن کر برسات میں آئے ہیں — منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا
کام آئے گا اے ساقی یہ دامنِ تر میرا — چھوٹا سا کوئی ابرِ میخانہ بنا دینا
تمہیدِ خرابی کی تکمیلِ خرابی ہے — اک بت کا بنانا ہے بتخانہ بنا دینا
اللہ رے سوزِ غم آتش نفسی تیری — جس ساز کو چھو لینا پروانہ بنا دینا
اے حسن، ہے اک رحمت یہ تیری جنوں کاری — انسان بنانا ہے دیوانہ بنا دینا
خود قصۂ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے — دنیا نے بہت چاہا افسانہ بنا دینا

سیماب یہ ہیجانِ گرمیٔ محبت ہے،
انساں کو ہم انجام پروانہ بنا دینا

ترے خیال سے بھی رسم و راہ کر نہ سکا — میں اپنے دل کے لئے یہ گناہ کر نہ سکا
کوئی تلافیٔ جرمِ نگاہ کر نہ سکا — کیا گناہ تو عذرِ گناہ کر نہ سکا
جہاں ملی وہیں پی لی، یہ بیخودی تھی مری — خیالِ مدرسہ و خانقاہ کر نہ سکا
کوئی گنہ نہ کیا۔ اعترافِ رحم کے بعد — میں کوئی اس سے زیادہ گناہ کر نہ سکا
تمھیں تو حدِ نظر تک گزرو آساں تھا — اگر بلند میں اپنی نگاہ کر نہ سکا
یہ ایک راز تھا اعلانِ عفو میں اُن کے — کہے نہ کوئی کہ انساں گناہ کر نہ سکا
ہر اک نگاہ میں تھا شوق کچھ نہ کچھ تیرا — مگر میں تجزیۂ ہر نگاہ کر نہ سکا

فغاں کا اُس پہ ہی الزام واہ ری انصاف جو زیرِ لب بھی کبھی ایک آہ کر نہ سکا
نہ پوچھ مجھ سے، ترے جبر و اختیار کی خیر گناہ ہو نہ سکے، یا گناہ کر نہ سکا
یہ ایک بھول ہوئی مجھ سے وقتِ نظارہ کہ اپنی بے خبری کو گواہ کر نہ سکا
جسے تمہاری نگاہیں تباہ کر نہ سکیں کبھی پھر اُس کو زمانہ تباہ کر نہ سکا

سرائے دہر میں سیمابؔ نیکیاں کیسی!
گناہ بھی تو بقدرِ گناہ کر نہ سکا

ہے کرم مجھ پر، مگر ایسا کرم کس کام کا تیرے لطفِ خاص میں ہی، رنگ لطفِ عام کا
میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا گرمیٔ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا
کاہشِ غم ہی مداوا ہے غمِ ایام کا ہے شفق کے خون سے رنگین گیسو شام کا
دل کبھی ٹوٹا، تو سر گشتہ نہ درماں کا ہوا میں کہ تھا دیکھے ہوئے عالم شکستِ جام کا
سب مرے انجام پر آمادۂ تنقید ہیں اور پھر ضامن نہیں ہوتا کوئی انجام کا
اسکی ہستی وہم، مستی وہم، اور پستی بھی وہم نام ہے انسان اک مجموعۂ اوہام کا
ہے فریبِ طولِ عشرت، محفلِ ہستی کی شام صبح ہونے تک ہی وقفہ گردشِ یک جام کا
کم نگاہی سے تری ساقی وہ کیا مسرور ہو جس نے ان آنکھوں سے دیکھا ہی چھلکنا جام کا
عشق کے عنوان سے تجدیدِ ایماں کیجئے بے مزہ نکلا فسانہ کفر اور اسلام کا
صبحِ منزل اور شامِ کارواں ہوں ہمکنار کاش ایسا دور بھی ہو گردشِ ایام کا
وہ تری خود مست آنکھیں، وہ تبسم بادہ ریز، آجتک نظروں میں عالم ہے چھلکتے جام کا

ہے تپش اندوزِ دل اک برقِ نامعلوم سے ۔۔۔ پوچھئے کس سے پتہ اس جلوۂ بے نام کا

عمر بھر سینے میں درماں کی خلش باقی رہی ۔۔۔ ایک کانٹا چبھ گیا تھا آرزوئے خام کا

شامِ غربت کی درخشانی کا یہ ہے انتظام ۔۔۔ بن گیا ہے صبح کا آنسو ستارہ شام کا

رونے والو! موت لائی ہے سکوں میرے لئے ۔۔۔ یہ خوشی کا وقت ہے یا وقت ہے کہرام کا

رہنے دے دردآشنا نظروں کو صرفِ التفات ۔۔۔ تکملہ جب تک نہ ہو میرے جنونِ خام کا

پہلے اے **سیماب** اس دنیا میں ملتا تھا خدا
اب تو ٹکڑا بھی نہیں ملتا خدا کے نام کا

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا ۔۔۔ خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے ۔۔۔ حجاب کا یہ انھیں اور اک بہانہ ملا

سُنا ہے طور پہ تم بے حجاب آئے تھے ۔۔۔ یہ رشک ہے کہ ہمیں کیوں نہ وہ زمانہ ملا

نگاہ پڑ گئی جب دل پہ پچھلی راتوں میں ۔۔۔ بھرا ہوا ترے بھیدوں سے اک خزانہ ملا

کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو ۔۔۔ تری تلاش میں گمراہ اک زمانہ ملا

جسے نہ دیکھ سکیں میری ظاہری آنکھیں ۔۔۔ وہ مجھ سے روح کی خلوت میں غائبانہ ملا

یہ اعتبار مرا، یا ترا تصرف تھا ۔۔۔ جدھر گیا مجھے تیرا ہی آستانہ ملا

وفا کی سطح سے گزری ہوئی ملی دنیا ۔۔۔ غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

وہ سوزمند ہوں، وہ مرکزِ حوادث ہوں ۔۔۔ کہ بجلیوں کو بھی میرا ہی آشیانہ ملا

دراز تھی مری شامِ فراق کی روداد ۔۔۔ زبانِ شمع پر اک آخری فسانہ ملا

یہ میری تیرہ نصیبی، یہ سادگی، یہ فریب،　　گری جو برق، میں سمجھا چراغِ خانہ ملا
ہجومِ بزم ہوا حائلِ وصالِ نظر　　تمہاری دیر نگاہی کو اک بہانہ ملا

سرائے دہر میں سیماب دل لگا نہ سکا
سفر کی بات تھی سب سے مسافرانہ ملا

دامانِ سحر پرکندہ ہے اب تنگ دہانِ غم میرا
یہ تارے میری آنکھیں ہیں، یہ گریہ ہے شبنم میرا
اب مایوسی امید مری، اب عین خوشی ہے غم میرا
اب عشق نئے عالم میں ہے، اب دیکھ ذرا عالم میرا
ہر آنسو تسکیں پائے گا اک دن ایسا بھی آئے گا
ساحل خود ہی بن جائے گا، یہ طوفانِ پیہم میرا
ہے روزِ ازل سے دنیا کی اس وسعت میں محفل میری
میں ہر ذرے سے واقف ہوں ہر ذرہ ہے محرم میرا
جب ہستی میری ہستی تھی جب مستی میری مستی تھی
فطرت کی معصوم آنکھوں نے دیکھا ہے، عالم میرا
عریاں ہے میری نظروں میں گہرائی فریبِ عشرت کی
اک رحمت ہے میری کاہش، اک نعمت ہے ہر غم میرا
جو کچھ موجودِ خلقت ہے، یا شعر ہے یا شعریت ہے

یہ ذوق عطائے فطرت ہے، یہ ذوق ہے کیف کم میرا
شام اور سحر دو میرے ہی ہموار و پریشاں جلوے ہیں
یہ میری جبینِ تاباں ہے، وہ گیسوئے برہم میرا
سیماب وہ دن اب دور نہیں، سیماب وہ دور آپہنچا
جب دنیا کی ہر رفعت پر لہرائے گا پرچم میرا

ابھی درمانِ جنونِ غمِ پنہاں ہوتا　　چارہ گر کاش ترے ساتھ بیاباں ہوتا
کوئی نغمہ جو ترا جذب رگِ جاں ہوتا　　میں غزلخوانِ سراپردۂ امکاں ہوتا
ننگِ گلشن تھا، تو ہمرنگِ بیاباں ہوتا　　گُل بداماں نہ سہی، خاک بداماں ہوتا
چند اجزائے پریشاں سے تھی میری ترکیب　　اب نہ ہوتا تو پسِ مرگ پشیماں ہوتا
کاش ہوتا گنہِ قتلِ غلامی مجھ سے　　مسکراتا ہوا میں داخلِ زنداں ہوتا
موت، سنتے ہیں کہ ہے دردِ محبت کا علاج　　مر نہ جاتا میں اگر قابلِ درماں ہوتا؟
اُسے معلوم تو ہے میری پریشاں خوابی　　کیوں مرے خواب میں آ کر وہ پریشاں ہوتا؟
خود غرض آدمی آوارۂ آزادی ہے　　درد ہوتا تو شریکِ غمِ زنداں ہوتا
عہدِ موسیٰ میں نہ تھا قابلِ جلوہ کوئی دل　　ورنہ وہ، اور پہاڑی پہ نمایاں ہوتا!
میں جس انداز میں دیتا تجھے پیغام طلب　　سازِ فطرت بھی اُسی لَے میں غزلخواں ہوتا
بجلیاں کوندتیں اس باغ میں بے موسم بھی　　میں اگر شاخِ نشیمن سے پرافشاں ہوتا
شوخیٔ جلوۂ طغرائے ازل ہم سے ہے　　ہم جو افسانہ نہ بنتے تو یہ عنواں ہوتا؟

نقصِ نظّارہ سے ہے حاصلِ نظارہ تباہ ۔۔۔ دیکھتا تجھ کو سمجھ کر تو نہ حیراں ہوتا
دل کے بجھنے سے ہی تاریک فضائے ہستی ۔۔۔ دل سے لَو اٹھتی تو دنیا میں چراغاں ہوتا

کفر کی ضد پہ ہے سیماب اساسِ اسلام
عشق کا فرتھا اگر حسن مسلماں ہوتا،

مرتّب ہو کے اک محشر غبارِ دل ہی سے نکلے گا ۔۔۔ نیا اک کارواں گردِ رہِ منزل سے نکلیگا
نیا حاصل ہماری سعیٔ لا حاصل ہی سے نکلے گا ۔۔۔ نہ نکلا کام جو ماضی سے، مستقبل سے نکلیگا
خرابِ رہگذارِ قیس رکھ اپنی نگاہوں کو ۔۔۔ جو لیلےٰ بن کے نکلیگا اسی منزل سے نکلیگا
ہمارے منہ سے اور شکوہ تمہارا، ہو نہیں سکتا ۔۔۔ تمہارا نام بھی شاید بڑی مشکل سے نکلیگا
نہ ہوگا گوشۂ دامن مراد البستۂ منزل ۔۔۔ نہ جب تک ہاتھ تیرا پردۂ منزل سے نکلیگا
مری آنکھیں ہیں بزمِ رنگ و بو میں منتظر تیری ۔۔۔ نہیں معلوم تو کب تک حجابِ دل سے نکلیگا
سمجھ لے ناخدا یہ بات اور پھر ڈوب جانے دے ۔۔۔ ہمارا حال سن کر کیا لبِ ساحل سے نکلیگا
جو کچھ کھویا ہے پروانے ہوا ہوں شمع کے آنسو ۔۔۔ یہ سب کچھ ایک دن خاکسترِ محفل سے نکلیگا
قیامت میں نہ ہو پردہ دری حسن و محبت کی ۔۔۔ سنا ہے قیس، اے لیلیٰ ترے محمل سے نکلیگا
خدا کی جستجو کر یا نہ کر، رکھ بے خودی طاری ۔۔۔ وہ خود تیری خودی کے پردۂ حائل سے نکلیگا
تو دل کو دیکھتا رہ، اور پچھلی رات ہونے دے ۔۔۔ جلوسِ حسن تیری جلوہ گاہِ دل سے نکلیگا
نکالا تم نے محفل سے گراں تا نہ سمجھے تم ۔۔۔ کہ اک حسرت زدہ تنہا بھری محفل سے نکلیگا

میں اپنے دل کو یوں پیشِ نظر سیماب رکھتا ہوں

کہ میرا چاند جب نکلا اسی منزل سے نکلیگا

مجھ سے پہلے کوئی جلوہ نگرِ دل نہ ہوا — یہ وہ منصب ہے کہ موسیٰ کو بھی حاصل نہ ہوا

میں پسِ پردۂ آئینۂ محمل نہ ہوا — تم جسے دیکھ رہے تھے وہ مرا دل نہ ہوا

اس لئے کیفِ حقیقت تجھے حاصل نہ ہوا — کہ تو حق بیں تو ہوا، عارفِ باطل نہ ہوا

میں وہ پروانہ ہوں، جو نازشِ محفل نہ ہوا — سوز کا ظرف نہ تھا، ساز کے قابل نہ ہوا

اے خبر وسعتِ کونین کی رکھنے والے! — با خبر وہ ہے کہ جو بے خبرِ دل نہ ہوا

منزل اک پردۂ غفلت تھی سرِ راہِ عمل — خیر گذری کہ میں دامن کشِ منزل نہ ہوا

کیا بساط اسکی تھی اک پارۂ لرزاں کے سوا — دل پہ جب تک تری نظریں پڑیں، دل نہ ہوا

جذبِ خورشید ہو ذرہ، تو ہے عینِ خورشید — حسرت اُس محوِ تماشا پہ جو محمل نہ ہوا

سینۂ حسن کو ہلکی سی خلش مل جاتی — تھی جہاں حسن کی تخلیق وہاں دل نہ ہوا

تھا نہ ہم قسمتِ آئینہ، تو پتھر ہوتا — میں کہ اب تک نگہِ دوست کے قابل نہ ہوا

بھول ہنگامِ ازل ہو ہی گئی فطرت سے — صبر مجھ کو نہ ملا، تجھ کو عطا دل نہ ہوا

پھر وہی شورِ جرس اور وہی بانگِ درا — میں تو منزل پہ بھی آسودۂ منزل نہ ہوا

سہل و دشوارِ محبت کا خلاصہ یہ ہے — ضبط آسان نہ تھا، صبر بمشکل نہ ہوا

ختمِ ہستی پہ ہے ادراکِ حقیقت موقوف — اور اگر ختم یہ ہنگامہ ہوا، حل نہ ہوا!

اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟ — آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

کوئی نسبت بھی ہو، اُس طور کو میرے دل سے — جو تری ایک نظر کا متحمل نہ ہوا

ہائے وہ کشتۂ اغراض و ہوس اے سیمابؔ
جس نے دی جان مگر عشق کے قابل نہ ہوا

تو اب اُن سے بھی بیزار اے دلِ دیوانہ خُو ہو جا　نظر سے ماسوا کو محو کر کے تو ہی تو ہو جا
مثالِ نکہتِ آوارۂ گُل چار سو ہو جا　سکوں چاہی تو آزادِ قیودِ رنگ و بو ہو جا
سپردِ گردِ بادِ دشت کر دے اپنی خاکستر　کہیں مل جائیگی منزل، خرابِ جستجو ہو جا
اگر تو چاہتا ہی آرزو تیری کرے دنیا　تو دل پر جبر کر کے۔ بے نیازِ آرزو ہو جا
تصور میں کسی کی طلعتوں کا منتظر کیوں ہی؟　خود اپنا آئینہ بن جا۔ خود اپنے روبرو ہو جا
بہار آئی تھی گلشن میں تو کرتی بارشیں لیکیں　یہ کس نے کہدیا تھا شورشِ فریادِ نمو ہو جا
فضا میں کھو کے رہجاتی ہیں ہشیاروں کی فریادیں　طوافِ عرش کرنا ہی تو دیوانے کی ہُو ہو جا
مٹا دے اپنی غفلت پھر جگا اربابِ غفلت کو　انھیں سونے دے پہلے نیند سے بیدار تو ہو جا
سُنا جا برق بن کر ہی ترانہ لن ترانی کا　نہ ہو ہم سے تو آنکھوں ہی سے گرمِ گفتگو ہو جا

غرض تو صرف ای سیمابؔ ہستی کا مٹانا ہے
نتیجہ ایک ہی ہے۔ خاک ہو جا یا لہو ہو جا

غم، قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا　پُتلہ ہوا عذاب کا انسان کیا ہوا!
تقدیر میں اضافۂ سوزِ وفا ہوا　دل میں جو تم نے آگ لگا دی تو کیا ہوا
عرفانِ نفس ہی مجھے عرفانِ دوست تھا　خود آشنا ہوا تو خدا آشنا ہوا
کہتے ہیں جس کو موت، ہی اک بیخودی کی نیند　اُس کو فنا کہاں ہی جو تجھ پر فنا ہوا

ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں — شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

میرا ہی ایک جلوۂ نادیدہ حسن تھا — اپنی ہی اک ادا پہ رہا میں مٹا ہوا

یوں تو فتادگی ہے مذاقِ سرِ نیاز — سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پر ادا ہوا

اے خادمانِ حُسن یہ کیا انتظام ہے؟ — اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا!

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں — یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈھتا ہوا؟

مُنہ سے دعا نکل ہی گئی وقتِ قتل بھی — کہنا یہ تھا کہ حقِ محبت ادا ہوا

محفل کسے دکھاؤں کہ ہے زندگی اُداس — اب شمع کیا جلاؤں کہ دل ہے بجھا ہوا

کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقیِ بہار؟ — جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

بحثِ نیاز و ناز تھی کل بزمِ حُسن میں،
سیمابؔ کچھ خبر نہیں کیا فیصلا ہوا؟

مجبورِ التفات تغافل کسی کا تھا — اللہ کیا اثر نگہِ ملتجی کا تھا

وہ دل جو ایک سازِ مری زندگی کا تھا — در اصل نغمۂ پسِ پردہ کسی کا تھا

سوزِ وفا کی پہلی ہی منزل میں رہ گیا — جگنو کہاں حریفِ مری عاشقی کا تھا

پاؤں جس نے قافلے والوں کو کر دیا — پہلا وہ جادۂ مری واماندگی کا تھا

تم آرزو کی زندگیاں لیکر آئے تھے — یادش بخیر ایک وہ دن زندگی کا تھا

حسرت کہ اپنے دل میں جگہ دی نہ دوست نے — میں مدعا بھی تھا تو کسی مدعی کا تھا

تا چند اعتبار پہ یوں سجدۂ نیاز — ہوتے وہ سنگ تو مزہ بندگی کا تھا

شیشوں سے پوچھتا ہوں جب آتا ہوں ہوش میں
کیا ذکر انجمن میں مری بیخودی کا تھا ؟

نازک سا امتیاز رہا جانبین میں
جو رنگ تھا خودی کا وہی بیخودی کا تھا

جو قدسیوں کے درس میں تھا درسِ آخری
ایک جزوِ مختصر وہ مری آگہی کا تھا

سیماب، غمگسار نہ تھے وہ، نہیں سہی
احساس تو انھیں مری آزردگی کا تھا

دلِ خوں گشتہ کو سیلاب بہ داماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

کسی کہسار پہ پہونچے نہ بیاباں دیکھا
پاؤں وحشت میں نکالے تھی کہ زنداں دیکھا

اس نے کیا رنگِ مریضِ شبِ ہجراں دیکھا؟
شمع کو پچھلے پہر طشت میں لرزاں دیکھا

غالباً فطرتِ دنیا ہی پریشانی تھی،
جسے دیکھا اُسے دنیا میں پریشاں دیکھا

اُنس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دیدیا منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

نغمۂ عشق کو ہنگامہ گرِ دل پایا
حُسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

جو تماشا تھا وہ اب میرا تماشائی ہے
تو نے کچھ اور بھی اے دیدۂ حیراں دیکھا!

شبِ غم جب نظر آتا تھا بھرا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

دلِ ویراں کو ہے یہ خبط کہ محفل بن جائے
آپ نے حوصلۂ بے سروساماں دیکھا؟

شمع ہو، گرمیٔ محفل ہو کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اُسے اک رات کا مہماں دیکھا

طور پر پھر نظر آ جا، نظر آنے کی طرح
یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں
آنکھ جب بند ہوئی خوابِ گلستاں دیکھا

ہوش آیا تو غشی آ گئی دشت پہ مجھے اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا
کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودۂ خواب سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا

کس سے سیمابؔ پریشانیِ دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

رات کا جانا، وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا صبح کا تارا نہ تھا، قفلِ درِ میخانہ تھا
حسن تنگ آ کر بھڑک اٹھا فضائے طور پر کیا سوالِ طالبِ دیدار گستاخانہ تھا؟
ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا
دشتِ غربت میں یہی تھے غمگسارِ بیکسی شبنمِ آوارہ تھی یا سبزۂ بیگانہ تھا
میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو جو پتنگا دل کے شعلوں سے اڑا پروانہ تھا
یہ ہمارا کعبۂ دل ہے ابھی تک بت کدہ لوگ کہتے ہیں دل کعبہ کبھی بت خانہ تھا
آنکھ والو سوزِ فطرت کے کرشمے دیکھنا ہے ابھی خاکسترِ محفل، ابھی پروانہ تھا
محشرِ پندار برپا تھا بمقدارِ خودی بت نہ تھے تخیلِ عالم میں، مگر بتخانہ تھا

رات دن سیمابؔ میں دنیا میں سرگرداں رہا
پاؤں کا چکر، جوابِ گردشِ پیمانہ تھا

محرومِ تصور کر نہ دیا، مجبورِ تماشا کر نہ دیا
محفل کو مری برہم کر کے، تم نے مجھے تنہا کر نہ دیا!
پیغامِ محبت کے دے کر، ہم ذوقِ زلیخا کر نہ دیا!

آخر ہمنے اے حسن تجھے پابندِ تمنا کر نہ دیا!؟
انسان کے دل میں گھُٹ گھُٹ کر جو روح کو کھائے جاتا ہے
ہمت تھی اگر تو دنیا نے اُس راز کو افشا کر نہ دیا!
اب میرے دلِ خوں گشتہ کی ہر موج تمنا پر ور ہے
مایوسِ محبت کر کے مجھے بیزارِ تمنا کر نہ دیا!
اب تک میرا ظلمت خانہ ہے بے شمع و بے پروانہ
تاروں نے چراغاں کر نہ دیا، سورج نے اُجالا کر نہ دیا!
میں ایک نظر سے آسودہ اپنی خلوت میں بیٹھا ہوں
اے جلوۂ ہر سوئے فطرت، تو نے مجھے رسوا کر نہ دیا!
ایوانِ تصور سے اپنے، نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرّے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا!
میں نے تو کہا تھا پہلے ہی، ڈوبا تو اُبھرنا مشکل ہے
اے بے خبری کھو کر مجھ کو پھر تو نے پیدا کر نہ دیا!
سیماب جو ترکِ دنیا پر طعنے مجھے اکثر دیتے ہیں
اُن لوگوں نے دامن کو مری وابستہ دنیا کر نہ دیا!

دل[۵۱] اک قطرہ لہو ہی، یہ ہے اس کے سوا کیا پھر اس کی آرزو کیا، پھر اس کا مدعا کیا

---

۵۱ مفاعیلن فعولن، مفاعیلن فعولن۔

حریمِ دل رہے گا یوں ہی بے آشنا کیا　　　نہیں دنیا میں کوئی، پرستارِ وفا کیا

محبت اور دل پر، کسی کا بس نہیں ہے　　　وہ ہم سے کیوں خفا ہیں، ہماری ہے خطا کیا؟

دلِ نالہ سرا سے نہ بہلے گی طبیعت　　　صدائے چنگ و نے سن، نوائے بے نوا کیا!

محبت کا ستانا تمھیں شایاں نہیں ہے　　　ستم آخر ستم ہے، روا کیا نا روا کیا

سرِ وادیِ ایمن گھٹائیں اٹھ رہی ہیں　　　کہیں سے در جام در کف، کوئی پھر آ گیا کیا

یہ فطرت کی عنایت، یہاں بھی ہے وہاں بھی　　　قفس ہو یا نشیمن، غمِ آب و ہوا کیا

تخیل کی حدوں سے نکل کر ڈھونڈ جلوے　　　ہو جب صورت نظر میں، تصور کا مزا کیا!

جوانی سے ابھی نہیں ہوں سیر ابھی میں　　　یہ موسم جا رہا ہے، تو پھر بھی آئے گا کیا؟

جبیں سائی سے تسکیں، نہ سجدوں سے تسلی　　　اٹھا کر سر میں رکھ لوں، تمہارا نقشِ پا کیا؟

پریشاں ہو چکے ہیں محبت میں ہزار دل
پھر اے سیماب میں کیا، مرا خوابِ وفا کیا

آیا مری محفل میں غارت گرِ ہوش آیا　　　صد جام بکف آیا، صد شیشہ بدوش آیا

مستانہ مرا ساقی، ہنگامہ فروش آیا　　　خاموش ہوا مطرب، ہنگامِ خروش آیا

وہ خود لیے بیٹھے تھے آغوشِ توجہ میں　　　بیہوش ہی اچھا تھا، ناحق مجھے ہوش آیا

میخانے میں کیا موجِ بادہ مترنم تھی!　　　بے کیف گیا تھا میں، صد نغمہ بگوش آیا

اُڑ کر دلِ ویراں سے آنکھوں میں کچھ آیا ہے　　　پیمانۂ خالی میں کیا تھا جسے جوش آیا؟

تو محفلِ الفت میں فریاد بہ لب کیوں ہے؟　　　اس بزم میں جب آیا، پروانہ خموش آیا!

کیوں دامنِ ہستی تک بڑھنے دیا ہاتھوں کو؟ دیوانہ اگر تھا میں، دنیا کو نہ ہوش آیا!
ہے سعیٔ طرب کوشی، پھر مائلِ مے نوشی پھر آج مرے آگے ذکرِ غمِ دوش آیا

سیماب میں جنت میں جب شعر بہ لب پہونچا
اک شور ہوا برپا، جانِ سروش آیا

بقدرِ شوقِ اقرارِ وفا کیا ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا
دلِ آفت زدہ کا مدعا کیا شکستہ ساز کیا، اُس کی صدا کیا
محبت کا یہی جب شغل ٹھہرا تو پھر آہِ رسا کیا، نارسا کیا
میں اپنے حال سے خود بے خبر ہوں تمہاری کم نگاہی کا، گلا کیا
دعا دل سے جو نکلے کارگر ہو یہاں دل ہی نہیں، دل سی دعا کیا
قفس کی زندگی پھر زندگی ہے غمِ ہنگامۂ رنگ و نوا کیا
ڈبویا تھا جہاں طوفاں نے ہم کو وہاں سب تھے، خدا کیا نا خدا کیا،
جو کہتے ہیں "اب اس میں کچھ نہیں ہے" کوئی اُن سے یہ پوچھے، مجھ میں تھا کیا
مری ہستی مری ہستی نہیں ہے تمہیں تم ہو تو ذکرِ ما سوا کیا
نہ اس پر اختیار اپنا نہ اُس پر سرِ آغاز و فکرِ انتہا کیا

سلامت دامنِ امیدِ سیماب
محبت میں کسی کا آسرا کیا

ایک طوفاں تھا مگر کوزہ نشیں ہوتا رہا ہائے وہ آنسو کہ جذبِ آستیں ہوتا رہا

جذبۂ عیشِ دو عالم دل نشیں ہوتا رہا ‏ اور میں با ہمہ اندوہ گیں ہوتا رہا

مجھ پہ آخر گرم وہ سوچ ہو کیوں مدتوں ‏ آشیاں کے سائے میں پردہ نشیں ہوتا رہا

میرے سجدوں کو وہ ننگِ آستاں سمجھا کئے ‏ منفعل کیا کیا مرا ذوقِ جبیں ہوتا رہا

بزمِ فطرت روز فردوسِ نظر بنتی رہی ‏ روز سامانِ نشاطِ بہتریں ہوتا رہا

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائیگی ‏ گر یونہی انساں پیوندِ زمیں ہوتا رہا

منتہائے ذوقِ خاطر دیکھ اے کنجِ قفس ‏ تجھ پر اپنے آشیانے کا یقیں ہوتا رہا

ہم نشیں ذوقِ رسائے خواب جادہ کچھ نہ پوچھ ‏ ہر نفس میں اپنی منزل سے قریں ہوتا رہا

بادۂ الفت تھا اے سیماب کتنا خوشگوار
اس کی تلخی پر گمانِ انگبیں ہوتا رہا

دل کی آنکھوں سے ترا میں نے نظارا نہ کیا ‏ غیرتِ رشک نے اتنا بھی گوارا نہ کیا

مجھے مرہونِ غمِ دوست دوبارا نہ کیا ‏ آپ نے خوب کیا، درد کا چارا نہ کیا

خلوتِ دل نے کیا شمعِ تمنا کو پسند ‏ انجمن بن کے تجھے انجمن آرا نہ کیا

تو نے دیکھا نہ ہمیں نیم نگاہی سے کبھی ‏ ہم نے پھر بھی تری محفل سے کنارا نہ کیا

ادب آموز تھی پاکیزگیٔ نیتِ عشق ‏ بے وضو میں نے کبھی ذکر تمہارا نہ کیا

شوق تھا وقتِ سحر گشت جبیں بوسی کا ‏ تیرہ بختی نے مجھے صبح کا تارا نہ کیا

غیر مشروط معافی مجھے دیدی سیماب
اس نے منظور گناہوں کا کفارا نہ کیا

زندانِ کائنات میں محصور کر دیا / محفل سے اپنی تم نے بہت دور کر دیا

اب کیوں ہمارے سامنے آتے ہو بے حجاب / جب خوگرِ تجلّیِ مستور کر دیا

ہم اور تیری بزم میں آتے محال تھا / لیکن کسی خیال نے مجبور کر دیا

آئے ہو دینے دعوتِ دار و رسن ہمیں / جب ہم نے ترکِ شیوۂ منصور کر دیا

فطرت یہی ازل سے ہے برقِ جمال کی / اِس نے جسے تباہ کیا، طور کر دیا

تم نے ہمارے ظرفِ نظر پر نہ کی نگاہ / سارے جہاں کو حسن سے معمور کر دیا

مخصوص میرا ذوقِ وفا تھا ترے لئے / تائیدِ عام نے جسے دستور کر دیا

اب میں ہوں اور وسعتِ رنگینِ کائنات / تم نے بٹھا کے پاس بہت دور کر دیا

سیماب کوئی مرتبہ منصور کا نہ تھا
نقطۂ خودی کی شرح نے مشہور کر دیا

سکوں پذیر جنونِ شباب ہو نہ سکا / شگفتِ موسمِ گل کامیاب ہو نہ سکا

شباب، سرخوشِ کیفِ شباب ہو نہ سکا / ہمیں تو نشہ بقدرِ شراب ہو نہ سکا

نظر سے چھیڑ دیا جس کو حسن کافر نے / ہلاکِ نغمۂ چنگ و رباب ہو نہ سکا

میں تیری کم نگہی کا رہینِ منت ہوں / مرا نظامِ تمنا خراب ہو نہ سکا

چمن بہارِ سراپا تو بن گیا لیکن / جوابِ رنگ و بہارِ شباب ہو نہ سکا

یہ کیوں سنوں کہ ہے رسوائے دہر جلوۂ دوست / یہ کیوں کہوں کہ مجھی سے حجاب ہو نہ سکا

مری سکوں طلبی سے نصیب کو ضد تھی / پیامِ موت بھی، پیغامِ خواب ہو نہ سکا

نگاہ و دل نے دیے رازداریوں کے فریب — نہاں کسی سے مرا اضطراب ہو نہ سکا
ہزاروں پردوں سے تنزیہ کے نکل آیا — وہ جلوہ ہوں جو اسیرِ حجاب ہو نہ سکا
وہاں ہم آرزوئے خوابِ عیش کیا کرتے — جہاں قیام بمقدارِ خواب ہو نہ سکا
اُڑا سے برق و گل و لالہ نے بہت خاکے — مگر کوئی مرے دل کا جواب ہو نہ سکا
فروغِ میکدہ، صبحِ نشاطِ عید نہ پوچھ — غروبِ شام کو بھی آفتاب ہو نہ سکا
تمام عشق پہ ہے اختیارِ حسنِ تمام — پھر اس پہ طعن کہ میں کامیاب ہو نہ سکا
بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر — پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

وہاں پیام کی گنجائشیں کہاں سیماب
جہاں سلام مرا مستجاب ہو نہ سکا

میں نے خاک میں مل کر منصبِ بقا پایا — اے اجل بتا تو نے مجھ کو کھو کے کیا پایا
ترکِ مدعا کر کے کیا بتاؤں کیا پایا — ہم نے ساری دنیا کو حسبِ مدعا پایا
"ہوش" و "رازِ فطرت" میں دشمنی ازل سے تھی — جس نے پا لیا کھویا، جس نے کھو دیا پایا
گو غلط سہی، فطرت آرزو سمجھتی ہے — تخت کی دعا مانگی اور بوریا پایا
جادۂ محبت میں دل کا نام لینا کیا — ہم نے کچھ یہاں پھینکا، تم نے کچھ پڑا پایا
وہ تسند تھا جتنا، کیف بھی تھا اتنا ہی — حُسن کے تناسب سے عشق کا مزا پایا
پھر نئی ترے غم سے مانگ لی خلش ہم نے — جب کسی مسرت کو صبر آزما پایا
کم سے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا — آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا؟

عشق و حسن دونوں تھے مائلِ خودی **سیماب**

اس کو خود غرض دیکھا، اس کو خود نما پایا

حریمِ گلستاں میں تو اگر ہو ہم نشیں میرا　دماغ افسردہ کر دے کیوں ہوائے یاسمیں میرا

الٰہی مائلِ معراج ہے ذوقِ جبیں میرا　اٹھا سکتی نہیں اب بارِ سجدہ یہ زمیں میرا

قبولِ حسن کوئی کام ہی گویا نہیں میرا　نہ ہنسنا دل نشیں میرا، نہ رونا دل نشیں میرا

میں اس کی روشنی میں اُن کے جلوے دیکھ لیتا ہوں　چراغِ طور سے کیا کم ہے داغِ آستیں میرا

بنائے قصر و ایواں میں کروں کیوں وقت صرف اپنا　سمجھتا ہوں مری منزل ہے دنیا، گھر نہیں میرا

یہ عادت ہی سہی، عادت بھی کتنی خوبصورت ہے　جمالِ دوست سے دل سیر ہوتا ہے کہیں میرا!

تمہارے ساتھ ہوں ہر وقت خلوت ہو کہ جلوت ہو　جہاں تم ہو فضا افروز، دل بھی ہے وہیں میرا

گذرگاہِ جہاں سے بے تحاشا جا رہا ہوں میں　نظر جمتی نہیں میری، قدم رکتا نہیں میرا

میں جس میں آگ بھر کر عشق کی دن رات پیتا ہوں　کوئی چھو بھی نہیں سکتا وہ جامِ آتشیں میرا

یہی دو صورتیں جلوہ نمائے حسنِ کامل ہیں　ہے کچھ تصویرِ رعنا، کچھ تصور ہے حسیں میرا

چمن سے تا عدن **سیماب** ہے فیضِ سخن جاری

عرب بھی خوشہ چیں میرا، عجم بھی خوشہ چیں میرا

پھر مری تخئیل کی زینت ہوا ہے جانِ شباب

مجھ کو آج اک نظم کہنی ہے بہ عنوانِ شباب

چھیڑ دو نغمہ، ہو پیدا جس سے طوفانِ شباب

لے جواں آہنگ مطرب، اے غزل خوانِ شباب

ہائے وہ فصلِ جوانی اور وہ جوشِ جنوں،
وہ شبِ مہتاب اور وہ اک پریشانِ شباب!

عشق ہے اک جوشِ سیلابِ جوانی، تند و تیز
حسن ہے اک موجۂ رنگینِ طوفانِ شباب

آخرِ شب کھل نہ جاتی آنکھ گھبرا کر اگر
دیکھنے کی چیز تھا خوابِ پریشانِ شباب

ہیں تبسم میرا تارے، کہکشاں انگڑائی ہے
ہر شبِ ہستی میں ہے میرا ہی سامانِ شباب

دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہوگئی
لائی تھی عمرِ شفق شامِ گلستانِ شباب

کچھ تو اس دن کے لئے محفوظ رہتے مستیاں
یہ خبر کیا تھی کہ بے کیفی ہے پایانِ شباب

مدتوں سیماب روشن کی ہے شمعِ آرزو
رنگ و بو کی انجمن میں زیرِ دامانِ شباب

کھل گیا آخر مرا رازِ نہانِ اضطراب
ہوگیا آخر میں رسوائے جہانِ اضطراب

قلبِ مضطر میں نہ تھی گنجائشِ طوفانِ غم
بڑھ گیا منزل سے آگے کاروانِ اضطراب

مٹنے والے اضطرابِ عشق میں، کیا چیز تھے — ان کی مٹی سے بھی ملتا ہے نشانِ اضطراب

درد کے ہر لحظۂ مضطر میں ہیں حق سے قریب — اللہ اللہ رے عروجِ بے کسانِ اضطراب

لےکے آیا تھا ازل سے فطرتِ برق و شرار — عمر بھر میں نے نہ چھوڑا آستانِ اضطراب

لگ گئی آسودگانِ عیش کے محلوں میں آگ — برقِ خاطف بن گئی آہِ جہانِ اضطراب

عندلیبِ عشق کو گلشن نہ تھا کوئی پسند — شاخِ تخیّل دل پہ باندھا آشیانِ اضطراب

بیقراری ابتدائے عشق کی کیا ہو گئی — دیکھنے کی چیز تھا وہ عنفوانِ اضطراب

التہابِ عشق کی ذرہ نوازی دیکھئے — اک مرا چھوٹا سا دل ہے اک جہانِ اضطراب

ہو رہے ہیں تذکرے میری دعائے ہجر کے — کیا فرشتے بھی سمجھتے ہیں زبانِ اضطراب!

سننے والے کیوں نہ ہوں سیمابؔ سن کر مضطرب
بیقرار ایسی زباں، ایسا بیانِ اضطراب

تا نہ آنے پائے کوئی خواب میں بھی سوئے دوست
رات بھر فرضِ تصوّر ہے طوافِ کوئے دوست

پھر مجھے آنے لگی اپنے نفس سے بوئے دوست
آ گیا شاید دلِ گم گشتۂ گیسوئے دوست

اختیارِ دوست دل پر، ضبط پر قابوئے دوست
یہ مرا نالہ نہیں، دراصل ہے یاہوئے دوست

یاد آیا میکدہ تھا ہمرنگ ذوقِ حسن و عشق

رفتہ رفتہ میری عادت ہو گئی تھی خوئے دوست
ہو چکا ہوں بارہا عذرِ نزاکت کا شہید
کر چکا ہوں امتحانِ قوّتِ بازوئے دوست
رنجِ غربت کیا کہ تیرا دوست تیرے ساتھ ہے
اے مسافر، اے غریب، اے رہگرائے کوئے دوست
بزمِ کثرت میں مری وحدت پرستی دیکھنا
اک نظر ہے سوئے دنیا، اک نظر ہے سوئے دوست
التفاتِ دوست پر جن کو ہے نازِ مستقل
اُن سے کہہ دو اک تلوّن بھی ہے جزوِ خوئے دوست
کعبے کی بنیاد اک محراب میں رکھی گئی
میکدہ کھولا گیا زیرِ خمِ ابروئے دوست
ہے ہوس کو ہمکناری وہم آغوشیِ نشاط
یعنی اک ہنگامہ ہے اندیشۂ پہلوئے دوست
کار فرمائے دو عالم ہیں اشارے دوست کے
دونوں عالم ہیں خرابِ جنبشِ ابروئے دوست
تکیۂ سر تھا کبھی سیماب زانو دوست کا
اب مرا سنگِ لحد ہے تکیۂ زانوئے دوست

عشق خود مائلِ حجاب ہے آج — حُسن مجبورِ اضطراب ہے آج

نالۂ دل کو دل سے لاگ نہیں — نغمہ، آزردۂ رباب ہے آج

میکدہ غم کدہ ہے تیرے بغیر — سرنگوں شیشۂ شراب ہے آج

بزمِ عالم کو فرصتِ انجام! — میری نیت میں انقلاب ہے آج

متغیر ہے عالمِ جذبات — کون اس دل میں باریاب ہے آج

زندگی جس میں سانس لیتی تھی — وہ زمانہ خیالِ خواب ہے آج

مٹ گئے دل کے ولولے سیماب

ختم افسانۂ شباب ہے آج

ہے حقیقت کی چمن کو جستجو میری طرح — رنگ و بو بھی ہے اسیرِ رنگ و بو میری طرح

تو بھی ہو سکتا ہے جانِ رنگ و بو میری طرح — پہلے پیدا کر چمن میں آبرو میری طرح

پھر ذرا ماہ و کواکب کا تکلم دیکھئے — کیجئے خاموش ہو کر گفتگو میری طرح

خونِ دل روتا ہوں ناموسِ وفا کے درد سے — کون ہے انسانیت کا چارہ جو میری طرح؟

کیا عجب میری گرفتہ خاطری کو ہو شگفت — پھول نے پائی ہے کانٹوں میں نمو میری طرح

دیکھ وقتِ صبح جب چھٹتی ہے تاروں سے شراب — آ کبھی فطرت کے میخانے میں تو میری طرح

صبح کا ساقی صبوحی لے کے خود آجائیگا — بیٹھ جا آ کر کنارِ آبِ جو میری طرح

منہ شفق کے آئینے میں دیکھ کر نازاں نہ ہو — خود ہوا اپنے ہی لہو سے سرخرو میری طرح

لالہ و گل کی ہے میرے بعد شکلِ تازگی — کون انہیں اپنا پلائے گا لہو میری طرح

محفلِ رندی و سرمستی میں ساغر بن کے آ
جذب کر کیفیتِ جام و سبو میری طرح

شش جہت سیماب ہے گہوارۂ نورِ جمال
غور سے دیکھے تو کوئی چارسو میری طرح

جسم پھر بنتے ہیں، صرفِ خاکداں ہونے کے بعد
جمع پھر ہوتے ہیں ذرّے رائیگاں ہونیکے بعد

حاصلِ سوزِ محبت تھا فنا ہونا مرا
ذوقِ پروانہ ملا، آتش بجاں ہونیکے بعد

مانعِ امن و مسرت ہے حیاتِ آشیاں
یہ سکوں ملتا ہے خاکِ آشیاں ہونیکے بعد

دودِ دل سے سوختہ جانی میری تعبیر کر
ناگہاں اک آگ بھڑکے گی دھواں ہونیکے بعد

پھر مجھے کرنا پڑا آغازِ غم کا انتظار
شادمانی کیوں ملی ناشادماں ہونیکے بعد

شکوۂ ہمسایہ برحق ہے دلِ غمگیں، مگر
ہوش رہتا ہے کسے محوِ فغاں ہونیکے بعد

بجلیاں ٹوٹیں، بلائیں آئیں، دیکھئے انقلاب،
پھر ملا ربطِ زمین و آسماں ہونیکے بعد

سیکڑوں شمعیں جلادیتی ہے فیضِ سوز سے
چند پروانوں کی مٹی رائیگاں ہونیکے بعد

غور کرکے دیکھ، کیا تھا اور کیا ہو جائے گا
آدمی بننے سے پہلے، رائیگاں ہونیکے بعد

وصل کو سمجھا ہے دیوانے نشاطِ زندگی
وصل ہوتا ہے فراقِ جسم و جاں ہونیکے بعد

وسعتِ ذوقِ طلب کو ختم ہوتا دیکھ کر
لوٹ جاتا ہوں قریبِ آستاں ہونیکے بعد

آگے آگے اشک، پھر کچھ دل کے ٹکڑے، پھر لہو
یوں ہوا راہی، مرتب کارواں ہونیکے بعد

ہمنوائے طائرِ سدرہ ہوں اے سیماب میں
ہمزبانِ بلبلِ ہندوستاں ہونے کے بعد

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سی چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

تسلط ہے جنوں کا اس قدر میرے بیاباں پر
اُٹھاتا ہوں جو پتھر، ہاتھ پڑتا ہے گریباں پر

لہو سے میں نے لکھا تھا جو کچھ دیوارِ زنداں پر
وہ بجلی بن کے چمکا دامنِ صبحِ گلستاں پر

اسی سے روشنی پھیلی بساطِ بزمِ امکاں پر
محبت اک بڑا احسان ہے تاریخِ انساں پر

جنوں ہوتا تو اُڑتیں دھجیاں دامانِ ہستی کی
کمالِ ہوش ہے یہ ہاتھ کا رُکنا گریباں پر

نظامِ جزر و مد میں ہر نفس کی آمد و شد سے
نئے ساحل کئے ہیں میں نے قائم موجِ طوفاں پر

نہ دنیا ہے، نہ عقبیٰ ہے، نہ ہستی ہے نہ مستی ہے
یہ ہنگامہ ہے سب میری نواہائے پریشاں پر

مغنی تو اگر سن لے سراپا سوز ہو جائے
جو نغمے گائے جاتے ہیں مرے سازِ رگِ جاں پر

نہ رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی
مری تصویر کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پر

جب اے سیماب اُٹھتے ہیں کبھی الہام کے بادل
برس جاتے ہیں کچھ نغمے مرے قلبِ غزل خواں پر

اُن کی نظروں تک رسائی اپنی مشکل دیکھ کر
لوٹ آتا ہوں در و دیوارِ محفل دیکھ کر

خاطر آزردہ ہوں کیوں خاکسترِ دل دیکھ کر
اب تو محفل سے اُٹھیں گے صبحِ محفل دیکھ کر

یادِ آشوبِ گذشتہ کی تباہی آ گئی
رو دیئے ہم عشرتِ یارانِ ساحل دیکھ کر

ہو گئی تکمیلِ تعمیرِ محبت بیسہ شکست
تم نہ گھبراؤ مرا ٹوٹا ہوا دل دیکھ کر

دل کی تنقیدِ مناسب سے نہ یوں تیور بدل
مدتوں نکھرا ہے تو آئینۂ دل دیکھ کر

اب یہ سوچا ہے پیامِ بے نیازی دوں تجھے
اپنے اعلانِ وفا کو حدِ فاصل دیکھ کر

میں حدودِ عالمِ ظاہر سے آگے بڑھ گیا
اس جہانِ رنگ و بو کا حسنِ باطل دیکھ کر

ذرّہ ذرّہ رہگذر کا بن گیا ہے راہبر
کاروانِ شوق کو آوارۂ منزل دیکھ کر

آگئی ہستی فریبِ عشرتِ تخلیق میں
ایک دُھندلا سا خوشی کا نقشِ باطل دیکھ کر

بے تعیّن ہو گیا منزل سے وہ دیر آشنا
کوششِ پائے طلب منزل آ منزل دیکھ کر

اب بتا اے جانِ محفل تجھ کو دیکھوں یا نہیں
شوخیٔ نظارۂ یارانِ محفل دیکھ کر؟

میرا ذوقِ حسن کوشی بن گیا دامانِ طور
تیرے جلووں کو شریکِ قسمتِ دل دیکھ کر

اک تری تصویرِ رعنا بھی قلم نے کھینچ دی
خوب سوجھی فطرتِ رنگینیٔ دل دیکھ کر

خامۂ تقدیر کی قوت میں لرزش آگئی
پھٹ گیا سینہ مری قسمت کا حاصل دیکھ کر

آدمیّت کے حجابوں میں کیا پیدا تجھے
آدمی کو تجھ پہ مٹ جانے کے قابل دیکھ کر

ایسی دولت، اور بے مانگے، بہت مسرور ہوں
غم کو اپنی سعیٔ لاحاصل کا حاصل دیکھ کر

کر نہ تکلیف اپنی محفل سے اٹھانے کی ہمیں
ہم تو خود اکتا رہے ہیں رنگِ محفل دیکھ کر

آ کہ دل میں ہیں تری انداز کی گنجائشیں
تجھ کو رعنائی ملی ہے وسعتِ دل دیکھ کر

میں نے پھر طوفاں کی جانب اپنی کشتی پھیر دی
بھر گیا دل انتشارِ گردِ ساحل دیکھ کر

اب یہی ضد ہے کہ ان ٹکڑوں کو پھر ترکیب دے
لیکن اندازِ شکستِ شیشۂ دل دیکھ کر

یاد آجاتا ہے اے سیمابؔ عہدِ قبلِ عشق
دل بھر آتا ہے سکونِ ماہِ کامل دیکھ کر

جو سالک ہے تو اپنے نفس کا عرفان پیدا کر

حقیقت تیری کیا ہے؟ پہلے یہ پہچان پیدا کر
وجود اک نقطۂ ایجاد ہے، ثابت اسے کردے
نیا پہلو میں دل، پھر دل میں تازہ جان پیدا کر
مذاقِ "بے ہمہ بودن" اگر پیدا ہی کرنا ہے
نہ ہو سامان جس میں کوئی، وہ سامان پیدا کر
حصولِ مدعا بھی کوئی شئے ہے، چھوڑ دے اسکو
حصولِ مدعا سے بڑھ کر ایک ارمان پیدا کر
مزہ جب ہے سراپا اضطرابِ شوق بن جائے
تُو اپنے دل کی یکسوئی میں بھی ہیجان پیدا کر
جہاں جانے کو سب دشوار ہی دشوار کہتے ہیں
وہاں جانے کا کوئی راستہ آسان پیدا کر
جمالِ آشنا سے اپنے دل کو کر نہ آسودہ
کوئی بیخود کہیں سے لا، کوئی حیران پیدا کر
تصور اُڑ کے جانے ہی نہ پائے چشمِ عرفاں سے
جہاں اُس کا تصور ہے وہیں ایمان پیدا کر
حقیقت کا کہے جو حال، کر ایسی زباں پیدا
محبت کے سنیں جو گیت ایسے کان پیدا کر

حدودِ عالمِ تکویں میں سب ممکن ہی ممکن ہے
تو ناممکن کے جھگڑے میں نہ پڑ، امکان پیدا کر

الٰہی بھید تیرے اس نے ظاہر کر دیئے سب پر
کہا تھا کس نے، تو سیمابؔ کو انسان پیدا کر

بصیرت کو عطا کر وسعتیں، جلوہ نما ہو کر
حقیقت آشنا ہو جاؤں، صورت آشنا ہو کر

وہ بامِ طور پر کیوں آئے عالم آشنا ہو کر
مذاقِ دید پیدا کر دیا جلوہ نما ہو کر

نہ ضبطِ جور آساں ہے، نہ ترکِ عشق ممکن ہے
میں کس مشکل میں ہوں یارب پریشانِ وفا ہو کر

میں اب سمجھا، تمہارے جورِ پیہم کا یہ مطلب ہے
کہ ناموسِ جفا ہو جاؤں یا ناموسِ وفا ہو کر

اُسی دل کی ضرورت پھر ہوئی ہے عہدِ پیری میں
جسے ہم پھینک آئے تھے جوانی میں خفا ہو کر

مٹا دے آرزو دل کی، دلوں کی آرزو بن جا
کہاں بیٹھا ہوا ہے سرگرانِ مدعا ہو کر

جنونِ عاشقی اور قیدِ زنداں، اے معاذ اللہ
مری کیفیتیں خود رہ گئیں زنجیرِ پا ہو کر

خلافِ رسمِ دنیا، جو شعارِ عشق ہوتی ہے
وہی اک بات رہ جاتی ہے قانونِ وفا ہو کر

پراگندہ کیا ہے دفترِ حسنِ محبت کو
ہوس کے چند حرفوں نے شریکِ مدعا ہو کر

بڑھانا چاہتا ہے حسن، نظارے کی حیرانی
ہر اک صورت، ہر اک تصویر ہے جلوہ نما ہو کر

انہیں سے کائنات اک نغمۂ نو اخذ کرتی ہے
مرے دو بول رہ جاتے ہیں محفوظِ فضا ہو کر

چھپی برقِ تجلی کوند کر، موسیٰ، تو شکوہ کیا
تماشا تھا، بانداز تمنا رہ گیا ہو کر

خودی و بیخودی سیمابؔ کچھ مجھ میں نہیں لیکن

مرے پندار میں کوئی جھلکتا ہے خدا ہو کر

آ، کہ ہستی بے لب بے گوش ہے تیرے بغیر ۔۔۔ کائنات اک محشرِ خاموش ہے تیرے بغیر
تو نہیں تو رات ہے محرومِ سوزِ زندگی ۔۔۔ شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر
ایک تیرے حسن میں رقصاں ہیں لاکھوں میکدے ۔۔۔ تشنۂ بادہ لبِ مے نوش ہے تیرے بغیر
آ، کہ پھر دل میں نہیں اٹھتی کوئی موجِ نشاط ۔۔۔ سرد پانی، بادۂ سرجوش ہے تیرے بغیر
نیند آ آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں ۔۔۔ تارِ بستر نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر
جلوۂ ہر روز، جو ہر صبح کی قسمت میں تھا ۔۔۔ اب وہ اک دھندلا سا خوابِ دوش ہے تیرے بغیر
زندگی تجھ سی عبارت تھی، مگر جب تو نہیں ۔۔۔ زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر
زحمتِ تکیہ ترے زانو کو دیتا ہے خیال ۔۔۔ سر پہ ہر پہلو وبالِ دوش ہے تیرے بغیر
بیٹھ کر بوندوں میں کس کے ساتھ دیکھوں گا بہار ۔۔۔ ابر کی آمد وداعِ ہوش ہے تیرے بغیر
آ، کہ موضوعِ غزل کو ڈھونڈتی ہے ہر نگاہ ۔۔۔ نغمۂ مطرب بلائے گوش ہے تیرے بغیر

کیا خبر سیماب کب گھبرا کے دیدے اپنی جان
ضبط گو اب تک تحمل کوش ہے تیرے بغیر

مجھے فکرِ وسرِ وفا ہے ہنوز ۔۔۔ بادۂ عشق نارسا ہے ہنوز
بندگی نے ہزار رخ بدلے ۔۔۔ جو خدا تھا وہی خدا ہے ہنوز
او نظر دل سے پھیرنے والے ۔۔۔ دل تجھی پر مٹا ہوا ہے ہنوز
ساری دنیا ہو نا امید تو کیا ۔۔۔ مجھے تیرا ہی آسرا ہے ہنوز

نہ وہ سرمستیاں نہ فصلِ شباب
عاشقی صبر آزما ہے ہنوز

دل میں تجھ کو چھپائے پھرتا ہوں
جیسے تو میرا مدعا ہے ہنوز

آستاں سے ابھی نظر نہ ہٹا
کوئی تقدیر آزما ہے ہنوز

دل میں باقی ہے سوزِ غم شاید
ہر نفس میں گداز سا ہے ہنوز

محویت بے سبب نہیں سیماب
روح پہ کوئی چھا رہا ہے ہنوز

میری مرگِ قفس کی عمر دراز
لے اُڑی مجھ کو کاہشِ پرواز

کر نہ جام و سبو پر اتنا ناز
تو ہے ساقی تو میں ہوں ساقی ساز

کوئی در ہے نہ کوئی سجدہ نواز
یہ کہاں جھک گئی جبینِ نیاز ؟

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھہرے
سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

رفتہ رفتہ سمجھ میں آئے گا
میرا نغمہ ہے دور کی آواز

اپنی نظروں پہ اعتبار نہ کر
ہیں مظاہر یہاں بصیغۂ راز

میری بے اختیاریوں کی نہ پوچھ
نہ حقیقت ہی بس میں ہے نہ مجاز

کر رہی ہے خود آشیاں سے قریب
میرے لیل و نہار کی پرواز

روح میں نغمہ خواں ہے کوئی ضرور
ہر نفس میں ہے ساز کی آواز

نہیں پابندِ بندگی سیماب
اُسکا بندہ ہوں جو ہے بندہ نواز

دے اب تو مجھے نہ طعنۂ ہوش ... لے تجھ کو بھی کر دیا فراموش!

فرقت تری موت سے نہیں کم ... ہے قبر کی طرح رات خاموش

وہ ایک جھلک حیاتِ کونین ... وہ ایک نظر وداعِ صد ہوش

اب رات نہ آئے یہ دُعا ہے ... کیا عرض کروں فسانۂ دوش

وہ ہوتے ہیں ہمکلام مجھ سے ... جب ہوتی ہے کائنات خاموش

اللہ رے فروغِ خلوتِ غم ... کون آگیا آفتاب بردوش!

ہے اب بھی تصور اُنکا سیماب
فردوسِ نظر بہار آغوش

اب اجتناب اُنھیں مجھ سے ہے بجائے خلوص ... مرے خلوص کا یہ ہے مآل! ہائے خلوص!

مجھی خلوص کی حسرت تھی بربنائے خلوص ... وہاں وہ ہی ہے فریبِ کرم بنائے خلوص

ہزار شکوے ہیں بے مہریٔ جہاں سے مجھے ... سُنے بھی کوئی گر میرا ماجرائے خلوص

یہ آبگینہ نہیں، آب آبگینہ ہے ... نہ دیکھو گرم نظر سے، نہ چوٹ کھائے خلوص!

نگاہ پاک ہے، نیت ہے صاف، دل خالص ... ہمارے پاس نہیں کچھ بھی ماسوائے خلوص

مجھے بتا کہ سزائے خلوص کیا ہوگی؟ ... الٰہی جور و ستم ہے اگر جزائے خلوص

نگاہِ حسن سے کیا اس میں انتقامِ فریب ... نہ اقتضائے محبت نہ اقتضائے خلوص

نہ کر خلوص بڑھانے کی فکر اے سیماب
بہت خراب ہے انجامِ انتہائے خلوص

التفات اُن کا مرے حالِ پریشاں کیطرف ایک موجہ سا ہے نکہت کا بیاباں کی طرف
مطمئن ہو سکے کبھی سُن تو سہی سازِ ضمیر اب بھی در پردہ ہے مائل کوئی انساں کی طرف
روح پر چھائے ہوئے ہیں وہ بصد رنگ و نوا دل میں بیٹھے ہیں نگاہیں ہیں رگِ جاں کی طرف
پھر کوئی جلوہ ترنم میں ہوا چہرہ کشا سب کی نظریں ہیں مرے قلبِ غزلخواں کی طرف
پردہ رکھ لی میری رسوائی کا اے مستِ شباب آستیں اپنی بڑھا چاکِ گریباں کی طرف
جن کی نظروں میں یہ ہستی ہے فقط عیش و نشاط بھیجدے یارب اُنھیں گورِ غریباں کی طرف
پھر گئی میری نگاہوں میں مساواتِ زوال چاند جب چھپنے لگا گورِ غریباں کی طرف
اُف رے یہ زورِ جنوں اُف ری یہ ایامِ بہار ہے ہر ایک شے کی کشش میرے گریباں کی طرف

فصلِ رنگیں کا ہوا سیماب اثر جلوہ نما
اُڑ کے پروانہ چلا شمعِ فروزاں کی طرف

عشق ہے ہمنوائے حسن، حسن نوا نوازِ عشق رحمتِ کائنات ہے نغمۂ حُسن و سازِ عشق
اہلِ وفا گذر گئے مٹ گیا جادۂ رضا دامنِ ریگ زار پر پھر نہ ہوئی نمازِ عشق
تیرے حریمِ ناز میں سجدے وہ کیوں ادا کرے جس کو خدا عطا کرے فطرتِ بے نیازِ عشق
محفلِ اہلِ حسن میں آئے ہیں اس کو بیچنے عشق کا دل خرید لے ہے کوئی دلنوازِ عشق
عشق کی تھی جو ابتدا، ہے وہی اسکی انتہا کس کی سمجھ میں آئیگا، سلسلۂ درازِ عشق
باطنِ عشق سے ترا ذہن نہیں ہے آشنا تو یہ کہاں ٹھہر گیا، حیرتیِ مجازِ عشق
فارغِ مدعا بھی ہے، پھر ہوسِ وفا بھی ہے کیا تو جنوں زدہ بھی ہے؟ واہ رے پاکبازِ عشق!

جل گئی اُس کی روح میں شمعِ حیاتِ جاوداں
جس کو خدا نے وارثی بخشدیا گدازِ عشق

نظر کو عجز رفعت ہے تجلّی گاہِ جاناں تک — تجلّی خود چلی آئے کسی دن چشمِ حیراں تک
برائے قبر لیتی آئے خاکِ آشیاں میری — ہوائے گل اگر تکلیف فرمائے بیاباں تک
نظر کو علم ہے چشمِ تماشا کی اسیری کا — پشیماں کیوں ہو جا کر روزنِ دیوارِ زنداں تک
بڑے تاریک، لمبے، اور پیچیدہ دوراہے ہیں — تری زلفِ پریشاں ہے مری قلبِ پریشاں تک
تماشا در تماشا، محوِ نازش، صرفِ حیرانی — نظر کس رنگ سے پہونچی تجلّی گاہِ جاناں تک
یہی قطرے جھلکتے ہیں یہی ذرّے چمکتے ہیں — فضائے شبنمستاں سے بساطِ انجستاں تک
الٰہی کام آجائے دعا یارانِ ساحل کی، — تباہی کھینچ لائی ہے مری کشتی کو طوفاں تک
مٹایا کاہشِ واماندگی نے اس قدر مجھ کو — کہ آخر ایک ذرّہ بھی نہ پہونچا کوئے جاناں تک
شعاعِ آفتابِ عشق کتنی شوخ فطرت تھی — فرشتوں کی نظر سے چھپ کے پہونچی قلبِ انساں تک
جسے کہتے ہیں رنگِ بزم ہے موقوف ویرانی — یہ سب رونق ہے پروانوں کی اجزائے پریشاں تک

مبارک ہو دلِ سیماب کو آشوبِ سینائی
نگاہِ شوق جا پہونچی تجلّی گاہِ جاناں تک

ہر سحر کو ہے سر ہمرنگیٔ صبحِ فرنگ — شرقِ حسن و جوانی ہے فریبِ آب و رنگ
تنگنائے دل میں ہے طوفانِ مستی یہ اُمنگ! — بند اک نقطے میں ہے گویا طلسمِ کیف و رنگ
ہے فنا فی الحسن ہونا عشق میں عینِ بقا — آگ ہو جاتا ہے خود بھی آگ میں جل کر پتنگ

فصلِ گل میں ہے فلک پرواز، پروازِ نمو　　نکہتیں بنکر فضاؤں میں اُڑا پھرتا ہے رنگ
دل ہدف ہونے تک اک رنگین آنسو رہ گیا　　تھا فقط یک قطرہ خوں مقسومِ آغوشِ خدنگ
سبزۂ مینائی پر سینے سے ہیں اُبھرے ہوئے　　ہے شبابِ صبحِ گلشن چند کلیوں کی اُمنگ
عشقِ رسوائی کی لاکھوں منزلیں طے کر چکا　　عقل ہے ابتک اسیرِ اعتبارِ نام و ننگ

کس قدر وسعت ہے اے سیمابؔ ظرفِ عشق میں
حسن کے صد رنگ جلوے اور ایک آغوشِ تنگ

کھُل گیا صبح سے پہلے درِ میخانۂ دل　　جسقدر پھول کھلے بن گئے پیمانۂ دل
سازِ فطرت ہے مرا آوازِ طرب خانۂ دل　　سر جھکا کر کبھی سن نغمۂ مستانۂ دل
مدتیں ہو گئیں لب خشک ہے پیمانۂ دل　　پھر ضرورت ہے تری ساقیٔ میخانۂ دل
تھا کبھی عرش درآغوش نہاں خانۂ دل　　اب تو انسان کا گھر بھی نہیں کاشانۂ دل
یوں تو پتھر لئے پھرتے ہیں سبھی پہلو میں　　دل وہ دل ہے جو محبت میں ہو دیوانۂ دل
شکریہ اے نگہِ ظرف شناسِ ساقی　　اب نہ خالی ہے نہ لبریز ہے پیمانۂ دل
بجھ گئی برقِ سرِ طور زمانے گزرے　　سرد ابتک نہ ہوئی گرمیٔ افسانۂ دل
کس سے لوں دادِ تپش ہائے محبت یارب　　بیمحابا ہے شمع کوئی قابلِ پروانۂ دل
کعبۂ دل تو حقیقت کی ہے پہلی منزل　　اور کچھ بڑھ کے پہونچ تا درِ بتخانۂ دل
دیکھ اے شمعِ جوانی کے بجھانے والے!　　ہے بدستور ابھی رقص میں پروانۂ دل

کس نے دیکھی ہے حقیقت کی تجلی سیمابؔ

ہے غنیمت کہ نگاہیں نہیں بیگانۂ دل

شبستاں میں ہو شمع پروانہ چیں تم — گلستاں میں ہو بوئے غنچہ نشیں تم

کبھی مصر کی نکہتِ نازنیں تم — کبھی طور کا جلوۂ سرمگیں تم

کہیں حسن کی تم ہو رنگیں بشارت — کہیں عاشقی کا پیامِ حسیں تم

کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر — ہو رنگینیِ دامن و آستیں تم

بیاباں کے ذرّوں میں تم جلوہ آرا — پہاڑوں کی چوٹی پہ تنہا نشیں تم

اشاروں میں بجلی کے تم کوندتے ہو — ستاروں میں ہو لرزشِ شرمگیں تم

کہیں رازِ جذباتِ الہام تم ہو — کہیں سازِ نغماتِ روح الامیں تم

کھلے تو ہوئے رنگِ کثرت کا مظہر — چھپے تو ہوئے لامکاں کے مکیں تم

غرض یہ کہ اٹھیں جدھر بھی نگاہیں — بصد رنگ ہو جلوہ گر تھے تمھیں تم

مگر جب بصد غور ڈھونڈا تو پایا

کہ ہو ہر جگہ اور کہیں بھی نہیں تم

کتابِ محبت کا حرفِ غلط میں — نگاہِ مسرت کا حق الیقیں تم

ہے پائے طلب خستۂ دیر و کعبہ — کسی شکل سے مل بھی جاؤ کہیں تم

فریبِ طلب ہیں تمھارے ٹھکانے — کسی کو تو ملتے جو ہوتے کہیں تم

تمھاری مسیحائی میں جانتا ہوں — کہ ہو دل کی رگ رگ میں درد آفریں تم

یہ ہے حاصلِ داستانِ محبت — ہو جانِ فسانہ کہیں میں کہیں تم

کڑی ہے ہمارے فسانے کی دنیا کبھی قیس و لیلیٰ بنے تھے ہمیں تم
تمہارا ہی سیماب ہو عکس لرزاں
ہو سیماب کے دل میں پردہ نشیں تم

اک تڑپ رکھتے ہیں دل میں، برقِ صد کاشانہ ہم
کیوں کسی سے مانگنے جائیں چراغِ خانہ ہم

ضبط سے ناآشنا ہم، صبر سے بیگانہ ہم
انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم

کیوں در و دیوار بھی ہوں واقفِ حالِ تباہ
توڑ دیتے ہیں چراغِ شامِ ماتم خانہ ہم

خود ہی سازِ بے خودی کو چھیڑ دیتے ہیں کبھی
خود ہی سنتے ہیں حدیثِ ساغر و پیمانہ ہم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دوست کی
اک تجلی خانہ دنیا، اک تجلی خانہ ہم

شمعِ ایوانِ حرم ہو یا چراغِ طاقِ دَیر
ہم کو دونوں سے تعلق ہو کہ ہیں پروانہ ہم

غم کی تاریکی میں خود جل کر لگالیں کیوں نہ آگ؟
خود بھڑک کر کیوں نہ بن جائیں چراغِ خانہ ہم
اے معاذ اللہ! شبِ تاریکِ غم کا اہتمام
صبح سے کرتے ہیں تجویزِ چراغِ خانہ ہم
یہ تڑپ، یہ سوز آگینی، یہ ظرفِ مختصر
غور سے دیکھا کیے پیراہنِ پروانہ ہم
دل جلا، پھر خود جلے، پھر ساری دنیا جل اُٹھی
سوز لائے تھے بقدارِ پرِ پروانہ ہم
جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت؟
مصلحت کو بھی بنالیں گے ترا دیوانہ ہم

بسکہ ہے سیمابؔ بے مہری یگانوں کا شعار
ہیں رہینِ التفاتِ خاطرِ بیگانہ ہم

تجلّیاتِ حقیقت کا آئینہ ہوں میں، 　خدا نمائی یہی ہے کہ خود نما ہوں میں
نہ ابتدا ہوں کسی کی نہ انتہا ہوں میں، 　بس ایک خوابِ سحر ناتمام سا ہوں میں
خجل ہے ذوق، نہ شرمندۂ وفا ہوں میں، 　جو کام مجھ سے ہے ممکن وہ کر رہا ہوں میں
نہ سمجھیں بزم میں یارب وہ میرا رازِ سکوت 　خموش رہ کے بھی اک بات کہہ رہا ہوں میں
نہ پوچھ مجھ سے وفا و جفا کی خود غرضی 　کہ ان حدود سے آگے نکل گیا ہوں میں

اسی سے فیصلہ کر مشکلاتِ طوفاں کا　　خدا پکار رہا ہے کہ ناخدا ہوں میں!

سنبھالنے مجھے آئی ہے احتیاطِ خودی　　جب اپنی موج میں تا دُور بہہ گیا ہوں میں

تو یہ میرے تصور کے دست و بازو کو　　حریمِ حسن کے پردے اُٹھا رہا ہوں میں

تو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ　　کہ اپنی حدِ نظر تک تڑپ رہا ہوں میں

جلالِ مشربِ منصور، اے معاذ اللہ!　　کسی نے پھر نہ کہا آج تک خدا ہوں میں

صدا کہاں کہ سراپا میں سوز ہوں سیماب

جو ساز ہو تو کہوں، سازِ بے صدا ہوں میں

گردِ خبرِ امید کی منزلِ پا گداز میں　　پھر ہے خود کارواں رہ گذرِ نیاز میں

یوں نہ جلا مثالِ شمع تو مجھے بزمِ ناز میں　　طور بنا کے پھونک دے وادیٔ سوز و ساز میں

کیفِ مئے الست تھا نغمۂ نے نواز میں　　ہو گیا نے ستاں خموش ایک لئے راز میں

سجدۂ عشق کے لئے حیلۂ عجز چاہیے　　فلسفۂ نیاز ہی مشغلۂ نماز میں

عشق میں گھُل کے جان دے مژدۂ صد حیات لے　　ہے یہی ایک زندگی شمع کے ہر گداز میں

پیکرِ غزنوی میں دی عشق نے دادِ بندگی　　حسن نے کیں حکومتیں بندگیٔ ایاز میں

فطرتِ حسن سے کہو اور کلیم بھیج دے!　　خامشی ناگوار ہے انجمنِ نیاز میں

تم تو خدائے حسن ہو، تم سے گلہ نہیں، مگر　　چاہیے کچھ نیاز بھی بادہ کشانِ ناز میں

مشربِ حسن و عشق میں ترکِ گنہ قصور تھا　　میری وفا کھٹک گئی چشمِ خطا نواز میں

سرخوشِ بادہ نظر تشنۂ جام و مے نہیں　　جب سے کھلا ہے میکدہ نرگسِ نیم باز میں

رقص میں آئے وارثی سیکڑوں آستانِ ناز
سجدے ابھی بنے ہی تھے میری سرِ نیاز میں

کام ممکن کوئی دورِ غمِ دوراں میں نہیں
مجھے دھوکا ہے کہ میں عالمِ امکاں میں نہیں

کثرتِ داغ سے ہوں میں چمنستاں بکنار
کون سا پھول ہے جو میرے گلستاں میں نہیں

اشکِ افتادہ کے کچھ قطرے ہیں سرمایۂ غم
گوہر و لعل مرے گوشۂ داماں میں نہیں

دلِ افسردہ بتا اب یہ کیسی ہے بہار؟
پاؤں چکر میں نہیں ہاتھ گریباں میں نہیں

اک تمنا سے کبھی دل میں تھے لاکھوں ساماں
اب تمنا بھی دلِ بے سر و ساماں میں نہیں

صحنِ گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامانِ بہار
چند ٹکڑے جو مرے چاکِ گریباں میں نہیں

ہے فقط دل سے یہ ہنگامۂ عالم سیماب
دل بدستور ہے باقی، مگر انساں میں نہیں

جو تھی محدود شے بے انتہا جلووں کے طوفاں میں
وہ تجلی جذب ہو کر رہ گئی ترکیبِ انساں میں
کوئی آسودگی ممکن نہ تھی دنیائے امکاں میں
مسلسل اک تباہی تھی مرے خوابِ پریشاں میں
جنوں پہونچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آبیٹھے مرے چاکِ گریباں میں؟
شباب اک سانحہ تھا، ہو چکا، اب صرف کاہش ہے

مری راتیں مجھے اُلجھا گئیں خوابِ پریشاں میں
بس اب رہنے بھی دے اے مدعی! میں تجھ سے کیوں کہدوں
کہ مجھ کو کیا نظر آنے لگا تصویرِ جاناں میں
دلِ غمگیں مداراتِ ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا نوکِ پیکاں میں
تصور نے اُبھر کر نقشِ حسرت کر دیا پھیکا
نئی دنیا نکل آئی مری دنیائے حرماں میں
تجلی کے لئے انساں ہے آوارۂ عالم
تجلی خود پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہے انساں میں
وہ جوہر جو فضا کو رنگ و بُو تقسیم کرتا ہے
پھر آ جاتا ہے شبنم بن کے دامانِ گلستاں میں
دمِ گریہ حدیں ملتی ہیں دنیائے تصور کی
یہ لرزش میرے اشکوں میں ہے یا تصویرِ جاناں میں
تو اپنا غم عنایت کر، کہ ہنگامہ ترے غم کا
سما سکتا نہیں تو گونج سکتا ہے رگِ جاں میں
بتا لے ناخدا ساحل بتا، یا غرق ہونے دے
یہ طوفاں میں دلاسے! اور پھر اس تیز طوفاں میں!!

مرے سامان خود خلاق ہیں میری تباہی کے
جنوں نے پرورش پائی ہے آغوشِ گریباں میں

نہ جانے کون سی، یہ صنف ہے اسرارِ قدرت کی
ابھی تک کاوشیں ہیں عقل کو تحقیقِ انساں میں

ذرا کھل کر پکار اے صور مجذوبانِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

روایاتِ محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک
ہزاروں انقلاب آتے رہے تاریخِ انساں میں

کسی کا عشق ہے سیماب صرفِ کار فرمائی
یہ اک پہلو نہاں ہے میرے ہر کارِ نمایاں میں

دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں
دوسرا دل ہے ہمارا عقدۂ مشکل نہیں

دل کو مٹنے سے بچا لینا کوئی مشکل نہیں
میں تو یوں چپ ہوں کہ وہ کافر فدائے دل نہیں

لذتِ ایذا سے خوش ہے خاطرِ ایذا پسند
میں وہ مضطر ہوں کہ محتاجِ سکونِ دل نہیں

سادگیہائے تمنا کے مزے کیوں چھوڑ دوں؟
مجھ کو پروائے حصولِ مدعائے دل نہیں

کثرتِ حسن تماشا ہے ہجومِ حشر میں
میں باایں کثرت تصور سے ترے غافل نہیں

شکوۂ بے التفاتیہائے بیگانہ فضول
دوستوں سے لذتِ حسنِ وفا حاصل نہیں

سر فروشانِ محبت کو نویدِ امتیاز!
محشرِ اہلِ وفا میں پرسشِ قاتل نہیں

قیس بن کر پھر نہ اُٹھا کوئی خاکِ نجد سے عاشقی دشوار ہے لیلیٰ وشی مشکل نہیں

بحرِ ہستی میں ہوں میں **سیماب** ہم کیشِ حباب
مجھ کو فکرِ ناخداؤ کشتی و ساحل نہیں

گوارا اتنی زحمت اُڑنے والے کارواں کرلیں اسیروں کی طرف سے بھی طوافِ گلستاں کرلیں
اجازت دے کہ اپنی داستانِ غم بیاں کرلیں ترے احساس اور اپنی زباں کا امتحاں کرلیں
حیاتِ جاوداں بھی عشق میں برباد کرلیں گے متاعِ ہستیٔ فانی تو پہلے رائیگاں کرلیں
بہارِ بوستاں کی ہستیٔ رنگیں بس اتنی ہے کوئی اک گیت گالے پھول پیدا درہم تعاں کرلیں
نشاطِ ذوق بھی ہیں اور تکلیفِ تمنا بھی حقیقت میں وہیں لیسے ہی جیسا ہم گماں کرلیں
یہ سازش کر رہے ہیں چند تنکے آشیانے کے کہ بجلی کو کبھی صورت اسیرِ آشیاں کرلیں
شبِ غم اے تصوّر، ان کو مجبورِ تبسم کر مرتب اس اجالے میں ہم اپنی داستاں کرلیں
ذرا انبوہ سے منزل پہ پہونچیں قافلے والے جنازے مرنے والوں کے شریکِ کارواں کرلیں
ہنسے پھول، اور کلیاں تھرتھرائیں، اڑ گئی شبنم ارادہ تھا کہ ان پر اعتبارِ رازداں کرلیں
یہ خاکستر ہی پروانوں کی، اور اتنی گذارش ہی کہ ہم اک دل بنالیں آپ اس کا امتحاں کرلیں

ٹھکانا ہو کہاں **سیماب** پھر نازآفرینی کا
اگر ہم اپنے دل کو بے نیازِ دوجہاں کرلیں

عزمِ فریاد، نہیں اے دلِ ناشاد نہیں! مسلکِ اہلِ وفا ضبط ہے فریاد نہیں
حاصلِ عشق بجز خاطرِ ناشاد نہیں یہ غنیمت ہے کہ محنت مری برباد نہیں

شرطِ شبنم سے نہیں ربطِ شمیم و نگہت / شبنم آوارہ ہے، پھر یہ کہ چمن زاد نہیں

غم کی حد یہ ہے کہ احساسِ خوشی تک نہ رہے / ابھی شائستۂ تسکینِ دلِ ناشاد نہیں

انھیں بکھرے ہوئے پھولوں میں ہمارا دل تھا / تجھے اے خانہ بر اندازِ چمن یاد نہیں!

اور بھی ذہنِ مصور میں ہیں نقشے محفوظ / خوبصورت ہو، مگر حاصلِ ایجاد نہیں

میرے معیارِ محبت کا خدا حافظ ہے / تم بھی اب وجہِ سکونِ دلِ ناشاد نہیں

تم نہ آئے مرے دل کے لئے غم بھیج دیئے / شکریہ، اب بھی مری انجمن آباد نہیں

اے مری قیدِ تمنا کے بڑھانے والے / غیر محدود ترے حسن کی میعاد نہیں

دل کی تجدید کا تھا عزم مگر کیا کہیے / ذہنِ تخلیق میں گنجائشِ ایجاد نہیں

بزمِ افسانہ کرو ختم، جوانی گزری / قابلِ ذکر اب آگے کوئی رُوداد نہیں

آہ غم خانۂ غربت کی جنوں سامانی / ہے جہاں تک مری دنیا کوئی آباد نہیں

موت ہے روح کی معراج تو پھر اے **سیماب**
یہ سرِ علو ہے مری دانست میں اُفتاد نہیں

اے رشک! ہو یہ کیسا انصاف عاشقی میں / تصویرِ مدعا ہے، آغوشِ مدعی میں

پوجا ہے جب سے تجھ کو محرابِ بیخودی میں / سو حسن بڑھ گئے ہیں آدابِ بندگی میں

میں ترجمانِ دل تھا تصویرِ بے کسی میں / اک مدعا نظر میں، اک بات خامشی میں

تھے خود نمائیوں کے انداز بے خودی میں / ہم ہو گئے تماشہ آخر تری گلی میں

بعدِ شباب کتنی بے لطفیاں ہیں طاری / جیسے کوئی کمی ہو سامانِ زندگی میں

کشتی ہی توڑ بیٹھی میری شکستہ بختی، ساحل نظر جب آیا، تاروں کی روشنی میں
آنسو کا قطرہ قطرہ موجِ حیات نکلا لختِ جگر کسی میں خونِ جگر کسی میں
فرقت میں آنسوؤں کے دریا بہا رہا ہوں موجیں بڑھا رہا ہوں طوفانِ زندگی میں
یہ تیری جستجو کا انجام سوچتا ہوں میں جستجو سے تھک کر کھو جاؤں گا تجھی میں
بے پردہ جلوہ گر ہو گل خانۂ نمو سے او مسکرانے والے کھلتی ہوئی کلی میں
شاید پتہ لگا لے یک رنگیٔ تخیل میں ڈھونڈنے خدا کو نکلا ہوں بیخودی میں
کی اپنے ڈھونڈنے کی تحریک بھی مجھی سے پھر یہ ستم ظریفی! وہ آ چھپا مجھی میں
معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

سیماب کب ہے دنیا، حسنِ وفا سے خالی
اب بھی وفا ہے باقی، لیکن کسی کسی میں

جس کو نہ تابِ ضبط ہو، بارِ وفا اٹھائے کیوں؟
وصل میں انتظار کیا، ہجر میں ہائے ہائے کیوں!
کیوں ہو گلی گلی تباہ، ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں؟
تیرا خرابِ آرزو بزم سے تیری جائے کیوں؟
کیوں نہ ازل میں ہو گئے۔ ضبط و وفا کے فیصلے
حسن اگر ہو مطمئن عشق کو آزمائے کیوں؟
سارا جہاں ہے تیرا گھر، چاہیے وسعتِ نظر

سعی کرے کوئی اگر تیرا پتہ نہ پائے کیوں؟

ذرۂ رہگذار دوست کعبۂ اہلِ عشق ہے
جس کو مذاقِ عجز ہو خاک سے سر اُٹھائے کیوں؟

سوزِ وفا کی معرفت شمع کو ہو اگر نصیب
اپنی ہی لَو میں خود جلے دوسروں کو جلائے کیوں؟

مجھ کو ہے تیرا انتظار، اس لئے ہوں میں بیقرار
گر نہ ہو تجھ پہ اعتبار، صبر بھی آ نہ جائے کیوں؟

حشر سُنا نہیں ہے کیا، میری شبِ فراق کا؟
جس کا ہے سب کو انتظار اب وہ قیامت آئے کیوں!

وحشتِ دل ہوئی فزوں، چارہ گروں کو ہی جنوں
بدنظر و بھا سکوں اُس کی گلی میں لائے کیوں؟

جس کو یقین ہو کہ تو جلوہ نما ہے چار سو
وہ تری جلوہ گاہ میں اپنی نظر اُٹھائے کیوں؟

غم تھا اگر نہ سازگار، موت نہ تھی جو خوشگوار،
آدمی بنکے وارثِ بزمِ جہاں میں آئے کیوں؟

شکستہ پا ہوں، شریک اپنے کارواں میں نہیں، مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں
یہی تو قوتِ تحقیق باغباں میں نہیں، کہاں گئیں وہ بہاریں جو بوستاں میں نہیں!

حواس جمع نہیں، ربطِ جسم و جاں میں نہیں
جو چاہتا ہوں وہ ترتیب کارواں میں نہیں

ہر ایک دل کو ہے دشوار معرفت میری
وہ راز ہوں جو ابھی ذہنِ رازداں میں نہیں

محیطِ غلبۂ وحدت ہے فطرتاً انساں
سمجھ رہا ہے کہ مجھ سا کوئی جہاں میں نہیں

اچھالے دیتی ہے غمّازیٔ نگاہ مجھے
میں راز بن کے بھی قابوئے رازداں میں نہیں

قفس کی قید سے چھوٹے بڑے زمانے میں
ہمارے وقت کا تنکا بھی آشیاں میں نہیں

درائے صبح کی آواز ہے نہ بانگِ جرس
خیال یہ ہے کہ میں اپنے کارواں میں نہیں

تعلقات کا رونا ہے۔ یاد کی فریاد
یہ جانتا ہوں کہ میں ذہنِ نوحہ خواں میں نہیں

وہاں ثبوت محبت کا دینے آیا ہوں
جہاں شریک فرشتے بھی امتحاں میں نہیں

خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں غربت میں
کہ میرے پاؤں میں کانٹے سہی زباں میں نہیں

میں چاہتا ہوں کہ منزل ہی منہ سے بول اٹھے
فضا شناس کوئی میرے کارواں میں نہیں

جہانِ عشق کی مٹی خراب ہے سیمابؔ
زمیں تنگ ہے گنجائش آسماں میں نہیں

نہیں آشنا مرے حال سے کوئی آنکھ بزمِ مجاز میں
ہوں وہ آئینہ جو ہے ناتمام ابھی ذہنِ آئینہ ساز میں

یہی راز تھا کہ حقیقتیں رہیں راز بزمِ مجاز میں
وہ ہی غزنوی کی نظر میں تھی جو گرہ تھی زلفِ ایاز میں

مرا داغِ سجدہ مٹائے کیوں، فلک اسکو چاند بنائے کیوں

کہ یہ داغ حاصلِ عاشقی ہے مری جبینِ نیاز میں

نہ یہ شمع بزم فروز ہو، نہ یہ زندگی نہ یہ سوز ہو،
جو نگاہِ گرم اثر تری، نہ بھڑک نوا مرے ساز میں

یہ رکوع کیا، یہ قیام کیا، یہ سجود کیا، یہ سلام کیا
فقط اک فریبِ نیاز ہے جو نہ محویت ہو نماز میں

ترا نغمہ موجِ شگفتگی، مرا نالہ شعلۂ زندگی،
ہے یہی تو فرقِ مغنیہ، مرے سوز میں ترے ساز میں

ہوا خاک ذوقِ نیاز سے، تو سمجھ نہ یہ کہ حقیر ہوں،
مجھے جذب ہونے کا شوق ہے تری بزمِ ذرہ نواز میں

نہیں آنکھ جلوہ کشِ سحر، یہ ہے ظلمتوں کا اثر مگر
کئی آفتاب غروب ہیں مرے غم کی شام دراز میں

وہ عروجِ ماہ، وہ چاندنی، وہ خموش رات، وہ بیخودی
وہ تصورات کی سرخوشی، ترے ساتھ راز و نیاز میں

مجھے خوئے توبہ نہیں تو کیا مرے جرم بخشے نہ جائیں گے؟
ابھی اور چاہئیں وسعتیں کرمِ بہانہ نواز میں

عربی نہیں عجمی سہی، مگر آرزو ہے کہ وارثیؔ،
کبھی اپنا نغمۂ مشرقی میں سنوں نوائے حجاز میں

جس جگہ جمع ترے خاک نشیں ہوتے ہیں
غالباً سب میں نمودار ہمیں ہوتے ہیں

وہ عیاں صبحِ حرم سے بھی نہیں ہوتے ہیں
ہم تو اب شام سے بتخانہ نشیں ہوتے ہیں

حشر اُٹھتا ہے نہ کہرام کہیں ہوتے ہیں
تم جہاں ہوتے ہو، فتنے بھی وہیں ہوتے ہیں

اپنی آوارہ سری روشنیِ شمع میں دیکھ
ہیں فروغ اُنکو جو یوں گوشہ نشیں ہوتے ہیں

کہنے جاتے ہیں کوئی رازِ بہارِ نو سے
ٹوٹ کر پھول جو پیوندِ زمیں ہوتے ہیں

دردِ سر اُن کے لئے کیوں ہے مرا عجز و نیاز
میرے سجدوں سے وہ کیوں چیں بجبیں ہوتے ہیں؟

پوچھتا پھرتا ہوں جنت میں علیٰ قدرِ مذاق
کیا یہاں حسن کا چرچا ہے حسیں ہوتے ہیں

اُن کی محفل سے تصور کا تعلق ہے ہمیں
آنکھ کر لیتے ہیں جب بند وہیں ہوتے ہیں

نظر آتا نہیں حیرت گہِ جلوہ میں کچھ اور
قابلِ دید بس اک چیز ہمیں ہوتے ہیں

پوچھتا کیا ہے خیالات کی محویت کو
ڈوبتے ہیں تو سرِ عرشِ بریں ہوتے ہیں

عشق کا سر نہیں جھکتا ہے، فلک جھکتا ہے
یہ وہ سجدے ہیں جو محسوسِ زمیں ہوتے ہیں

آئے جب کنجِ قفس میں تو قفس چوم لیا
ہم سے آزاد اسیر اور کہیں ہوتے ہیں!

تیرے جلووں نے مجھے گھیر لیا ہے اے دوست
اب تو تنہائی کے لمحے بھی حسیں ہوتے ہیں

اعتکاف ان دنوں ہے فرض، سنا ہے سیماب
رمضان آ گئے، میخانہ نشیں ہوتے ہیں

مستیِ شب ہائے ہستی کا مزا ملتا نہیں
دیکھنے کو اب کہیں خوابِ وفا ملتا نہیں

ڈھونڈنے والوں کو نقشِ مدعا ملتا نہیں
کچھ محبت میں نہ ملنے کے سوا ملتا نہیں

گو مگو ہے فرطِ نیرنگی سے رازِ کائنات — انتہا سے بھی سراغِ ابتدا ملتا نہیں

جام و بادہ چاہیئے زادِ عدم کے ساتھ ساتھ — یہ سنا ہے راستے میں میکدا ملتا نہیں

رہنمائی تو بہت مشکل ہے بزمِ عیش تک — اب تو سجدے کو بھی تیرا نقشِ پا ملتا نہیں

میں بتوں کی گمرہی سے سخت محوِ فکر ہوں — وہ خدا خود ہی نہ ہوں جن کو خدا ملتا نہیں

کون پہچانے مجھے، بیگانۂ محفل ہوں میں — آئینہ بھی کوئی صورت آشنا ملتا نہیں

بےکسی لے آ کسی کو میری ویراں قبر تک — کیا مسافر بھی کوئی بھٹکا ہوا ملتا نہیں!

جذب کر لیتی ہے بڑھ کر میرے سینے کی خلش — پاؤں میں چبھتے ہی کانٹے کا پتا ملتا نہیں

واقعہ یہ ہے کہ بندوں میں خدا موجود ہے — تجربہ یہ ہے کہ بندوں میں خدا ملتا نہیں

عشق اے سیماب جب تک ہو نہ جزوِ روح و تن
زندگی کا لطف مرنے کا مزا ملتا نہیں

مثلِ شبنم رائیگاں عالم برباد ہوں — میں چمن کے پتّے پتّے کو ابھی تک یاد ہوں

پردہ آرائے فنائے عالمِ ایجاد ہوں — جس کی آبادی عبارت ہی میں وہ برباد ہوں

اب مہ و خورشید کو مشکل ہے میرا ڈھونڈنا — گوشۂ تاریک میں اک ذرّۂ برباد ہوں

بو دہر موجود ہے انفاسِ فانی پر مرے — ہوں بنائے قصرِ ہستی اور بے بنیاد ہوں

تکملہ ہے داستاں میری حدیثِ باغ کا — یاسمین و یاسمن کی آخری روداد ہوں

ہے مری تخلیق تعمیلِ تمنائے "کُن" — میری فطرت ہی تمنا، میں تمنا زاد ہوں

اشک کہتے ہیں کہ ہم ہیں نغمۂ سازِ فغاں — درد کہتا ہے کہ مضرابِ لبِ فریاد ہوں

ابتدا ہے میری عریاں، خاک ہے میری سرشت
خلقتاً میں بے نوا ہوں، فطرتاً برباد ہوں

حادثات و نقص سے محدود ہے دنیا مری
وسعتِ عالم سمجھتی ہے کہ میں آزاد ہوں

ظلم اک رخ ہے مری اغلاط کی تصویر کا
پھر نہیں معلوم میں کیوں ستم کی بیداد ہوں

صرف ہونگی حشر تک روحیں مری تکمیل میں
میں تو نقشِ ناتمامِ عالمِ ایجاد ہوں

کوئی ہمدم ہے نہ اے سیماب کوئی ہم نفس
آج کل خود غمگسارِ خاطرِ ناشاد ہوں

رفعتِ فہم سے انساں سرافراز نہیں
کون سی بات ہے وہ جس میں ترا راز نہیں

شکر ہے کوئی غمِ عشق کا غماز نہیں
اب مرے رنگ کو بھی طاقتِ پرواز نہیں

آہ بیکار، کہ مایوسِ پذیرائی ہے
نالہ بے سود، کہ تو گوش بر آواز نہیں

بے پر و بال سہی، سیرِ چمن کیوں چھوڑوں
میری نظروں میں بھی کیا قوتِ پرواز نہیں؟

وجد میں روح مری آتی ہے۔ رہ جاتی ہے
قفسِ جسم میں گنجائشِ پرواز نہیں

ہو لحد میں تری اے خوابِ اجل عمر دراز
اب مری نیند میں کوئی خلل انداز نہیں

دیکھ انجامِ ستم پردے سے باہر آ کر
عرصۂ حشر ہے یہ، انجمنِ ناز نہیں

رازِ دل کہنے پہ مجبور ہوا جاتا ہوں
گو سمجھتا ہوں کہ میرا کوئی ہمراز نہیں

عشق کی دل میں وہ تصویر لئے بیٹھا ہوں
جو تری انجمنِ ناز میں ممتاز نہیں

صرف یک سجدہ مسافت ہے کسی منزل کی
ورنہ کچھ دور تری انجمنِ ناز نہیں

میری فطرت میں ہے سیماب نیاز آگینی

نازہے مجھ پہ زمانے کو، مجھے ناز نہیں

حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں — آخر ہم ایک حال میں کب تک بسر کریں؟

اہلِ نظر وسیع گر اپنی نظر کریں — ذرّے نقاب اُلٹ کے تجھے جلوہ گر کریں

خود ہوگا چاک پردۂ رازِ شبِ فراق — احباب انتظارِ نمودِ سحر کریں

انجامِ اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر — پھر کیوں ہمارے حال کی اُنکو خبر کریں؟

مر جائیں تیرے غم میں تو چرچے ہوں جا بجا — ہو داستاں طویل اگر مختصر کریں

فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گزر چکے — شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

اے اقتضائے ضبط، یہ ضد ہے کہ جبر ہے — کیا آنکھ ہم بحدِّ مژہ بھی نہ تر کریں!

اک محشرِ نظر ہے تماشائے خیر و شر — فرصت کہاں کہ فیصلۂ خیر و شر کریں

فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن — آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں

ہو منتشر نہ سلسلۂ حسن و عشق اگر، — نالے براہِ راست تجھی پر اثر کریں

تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا — ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں!

جب تو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول — اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں؟

اُس مرکزِ جمال پہ اب ہے مری نگاہ — جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

سیمابؔ ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں!

لایا ہوں ساتھ وحشتِ دیوانہ گر کو میں — کروں گا جلوہ گاہِ جنوں اپنے گھر کو میں

کھو کر تری گلی میں دلِ بے خبر کو میں
فکرِ خودی سے چھوٹ گیا عمر بھر کو میں

سازش بقدرِ ربط تھی طورِ جمال میں
سمجھا ہوں آج عقدۂ سنگ و شرر کو میں

قربِ مقامِ دوست کی دیتا رہے نوید
سجدے قدم قدم پہ کروں ہم سفر کو میں

ہے مدعیٔ گمشدگی راہِ کوئے دوست
کھو جاؤں یا تلاش کروں راہبر کو میں

خلوت کو اپنی مشرقِ سجدہ بناؤں گا
لے جاؤں گا اُٹھا کے تری رہگذر کو میں

اب ہر نگہ میں سیکڑوں مہلک جمال ہیں
سمجھا تھا پہلے کھیل مذاقِ نظر کو میں

اب ہے، تو مستقل ہو فروغِ شبِ وصال
ایسا نہ ہو چراغ جلاؤں سحر کو میں

صحرا سے بار بار وطن کون جائے گا
کیوں اے جنوں یہیں نہ اُٹھا لاؤں گھر کو میں!

جھوٹا کیا سرور سے سیماب رات بھر
دیکھا کیا کسی کی نشیلی نظر کو میں

شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں
لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسیٰ نہ کریں

پاسِ آدابِ وفا چاہیے مجبوروں کو
شکوۂ دردِ سے تو ہیں تمنا نہ کریں

کتنا دشوار یہ مسلک ہے خدا والوں کا
رہیں دنیا میں مگر خواہشِ دنیا نہ کریں

اثرِ نقصِ علاجِ دلِ بیمار نہ پوچھ
اب ضرورت بھی کبھی ہو تو مداوا نہ کریں

یہ مسلّم کہ ہر انساں میں ہے پرتو اُسکا
تو ہم اب اپنی ہی ترکیب کو سجدا نہ کریں؟

کیوں تمنا نہ کریں تیری بہ اندازۂ شوق
کیوں تری یاد بہ اندازِ تمنا نہ کریں؟

دوست کی بات کا بالواسطہ افشا ہے گناہ
پھر مزہ کیا جو تجھی سے ترا شکوا نہ کریں

نوحۂ دل کا جہاں میں شنوا کوئی نہیں　　اب بھی اللہ سے فریاد کریں یا نہ کریں
دوستی تشنۂ تکمیل رہی جاتی ہے　　وہ ابھی ترکِ عداوت کا ارادہ نہ کریں
اُن سے کہتا ہوں جو ہیں شاکیِ بے لطفیِ عشق　　غمِ الفت کو شریکِ غمِ دنیا نہ کریں

دامنِ حسن و وفا چھوڑ دیں کیونکر سیمابؔ
ہم نے اب تک نہ کیا ہے کبھی ایسا نہ کریں

یہ کس ادا سے کرشمے دکھائے جاتے ہیں　　ادا شناس بھی دھوکے میں آئے جاتے ہیں
جو عمر تیری طلب میں گنوائے جاتے ہیں　　کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں
بنا کے دل مری مٹی سے لائے جاتے ہیں　　انھیں ستم کے سلیقے سکھائے جاتے ہیں
جنھیں سپرد ہے گلگشتِ حسن کا ساماں　　وہ پھول صبح سے پہلے کھلائے جاتے ہیں
لگاؤ ہے مری تنہائیوں سے فطرت کو　　تمام رات ستارے جگائے جاتے ہیں
سمائی جاتی ہیں دل میں وہ کفر بار آنکھیں　　یہ بتکدے مرے کعبے پہ چھائے جاتے ہیں
جو ساری رات میسر نہیں ستاروں کو　　قریبِ صبح وہ جلوے دکھائے جاتے ہیں
حجاب اپنی نظر سے تو ہم اُٹھا نہ سکے　　انھیں کے حسن سے پردے اٹھائے جاتے ہیں
جنوں کدہ ہے جسے لالہ زار کہتے ہیں　　یہیں بہار میں وحشی بنائے جاتے ہیں
کوئی تو سرخیِ افسانہ یادگار رہے　　ہم اپنا خون قفس میں لگائے جاتے ہیں
دراز سلسلۂ امتحانِ وحشت ہے　　دل آزما کے قدم آزمائے جاتے ہیں
وہاں چمن میں ہے تعمیرِ آشیاں پہ عتاب　　یہاں ہوا پہ نشیمن بنائے جاتے ہیں

ہوائے مرگِ اسیری اُڑی ہے زنداں میں چراغ پچھلے پہر سے بجھائے جاتے ہیں
سمجھ حقیر نہ ان زندگی کے لمحوں کو ارے انہیں سے زمانے بنائے جاتے ہیں!

ہیں دل کے داغ بھی کیا دل کے داغ اے سیماب
ٹپک رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

جلوۂ صد رنگ سے نظریں پریشاں ہو گئیں پھر سجا دو محفلیں میری جو ویراں ہو گئیں
جو امیدیں غم کی راتوں کا چراغاں ہو گئیں صبح ہوتے ہوتے سب خواب پریشاں ہو گئیں
شورِ وحشت کو سلیقہ ہی نہ آیا ضبط کا، اور کڑیاں واقفِ آدابِ زنداں ہو گئیں
عشق کی دشواریاں ہیں حاصلِ ناممکنات مشکلیں ہی وہ نہ تھیں شاید جو آساں ہو گئیں
کس قدر تھیں شوخ، سوزِ عشق کی چنگاریاں راکھ ہو کر شاملِ ترکیبِ انساں ہو گئیں
میں نے کچھ دل میں لگا رکھی تھیں گرہیں ضبط کی وہ بھی صرفِ بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں
اپنے اپنے رُخ سے تھیں ہموار راہیں عشق کی جب قریبِ منزل آ پہنچیں پریشاں ہو گئیں
کثرتِ تعمیرِ عالم وجہِ بربادی ہوئی بڑھ گئیں آبادیاں اتنی کہ ویراں ہو گئیں
میں نے جن اینٹوں پہ آزادی کی رکھی تھی اساس میری قسمت سے وہی بنیادِ زنداں ہو گئیں
پوچھا کیا ہے غلط اندیشیٔ ذہنِ نشاط خوبصورت نیکیاں جتنی تھیں عصیاں ہو گئیں
تیرے دیوانے نے چھیڑا سازِ غم کچھ اس طرح جھوم کر زنداں کی دیواریں غزلخواں ہو گئیں
تو نے تازہ تربتیں گِن کر بہت ماتم کیا جمع کر ان میں وہ قبریں بھی جو ویراں ہو گئیں
اپنی دُھن میں عشق نکلا صد تباہی در نگاہ جو زمینیں سامنے آئیں بیاباں ہو گئیں

چھپنے والی صورتوں کو دے نہ الزامِ حجاب — خاک میں کر دی گئیں پنہاں کہ پنہاں ہو گئیں؟

جھک گئیں سجدے میں اے سیماب تیرے پاؤں پر
آج وہ کافر نگاہیں بھی مسلماں ہو گئیں

ازل سے تشنۂ صہبائے بیخودی ہوں میں — خودی کی گود میں اک سوزِ زندگی ہوں میں
نہ پوچھیے مری ہمرنگی و ہمہ رنگی — جو کچھ سمجھ لیا جس نے مجھے وہی ہوں میں
ہیں مجھ سے دور سب آثار شادمانی کے — الٰہی ہوں غمِ مطلق کہ آدمی ہوں میں
نہیں متاعِ مسرت پہ دسترس میری — برائے نامِ مسرت کا مدعی ہوں میں
ہے سر بمہر بدستور معرفت تیری — فریب خوردۂ عرفان و آگہی ہوں میں
کہاں سے لاؤں شرر کی طرح بلند سری — بنا ہوں خاک سے۔ نقشِ فتادگی ہوں میں
نہ جانے کب تجھے ایفائے عہد کا ہو خیال — یہ مصلحت ہے کہ مجبورِ زندگی ہوں میں
یہ سوچتا ہوں، تو سجدے سے سر نہیں اٹھتا — جو تھا فرشتوں کا مسجود کیا وہی ہوں میں!؟

ازل سے سہو و خطا ہے سرشت میں میری
ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں

جنوں کی نذر سالانہ کا ساماں دیکھ لیتا ہوں — بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں
نزاکت ہے یہ آنکھوں کی یا لطافت ہے تصور کی — انھیں میں برگِ گل پر بھی خراماں دیکھ لیتا ہوں
ضرورت کیا کہ راتیں میرے غم خانے کی روشن ہوں — کہ میں تو روزِ فطرت کا چراغاں دیکھ لیتا ہوں
مآلِ عہدِ وحشت ہے یہی سرمایۂ باقی، — بحسرت پارہ ہائے جیب و داماں دیکھ لیتا ہوں

اسیری میں مذاقِ سیر مٹ جانیکا ماتم کیا　　یہ کیا کم ہے در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں
پریشانی کو یہ وابستگی میرے سکوں ہی ہے　　کہ نیند آتے ہی اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں
ہی کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں　　خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں
ہر اشکِ مختصر اک موج ہی دل کے سمندر کی　　اٹھا کر ایک قطرہ نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں
حدیں عشقِ تصور کی مکمل ہو چکیں شاید　　کھلی آنکھوں سے اب میں روئے جاناں دیکھ لیتا ہوں
خمارِ زندگی سے جب خودی کی موج اٹھتی ہی　　تو ہنس کر جانبِ گورِ غریباں دیکھ لیتا ہوں

سناتا ہوں حدیثِ عشق ہی سیماب مشکل ہے
میں پہلی ہی نظر میں ظرفِ انساں دیکھ لیتا ہوں

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں　　اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
فطرت سے چوک ہو گئی میرے خیال میں　　ہلکا سا رنگِ عشق بھی ہوتا جمال میں
صبر آہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں　　امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں
دنیا کرے تلاش نیا کوئی جامِ جم　　اسکی جگہ نہیں مرے جامِ سفال میں
پھر طور کی نمود ہے خاکِ کلیم سی　　پھر تیرا انتظار ہے بزمِ جمال میں
آزردہ اسقدر ہوں سرابِ خیال سے　　جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں
مٹی کے ٹھیکرے پہ نہ جا میرا ظرف دیکھ　　کونین جذب ہے اسی جامِ سفال میں
تنگ آکے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو　　یا مطمئن کرو کہ تمہیں ہو خیال میں
ابتک ہے نازِ حسن کو تاریخِ طور پر　　اے عشق کاش تو بھی آتا جلال میں!

دنیا ہے خواب حاصلِ دنیا خیال ہے — انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں
یادش بخیر پھر نہ طارات کا سکوں — اک دن سحر ہوئی تھی حریمِ جمال میں
بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر — شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں
عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی — کچھ خواب میں گذر گئی باقی خیال میں
دنیا نے جس کو شعلۂ ایمن سمجھ لیا — تھا اعترافِ شوق زبانِ جمال میں

سیماب اجتہاد ہے حسنِ طلب مرا
ترمیم چاہتا ہوں مذاقِ جمال میں

وہ دل، کہ جس میں محبت کا اضطرار نہیں — ہے سنگِ خام جو شائستۂ شرار نہیں
شراب جوش میں ہے صبح لالہ زار نہیں — یہ اور کیا ہے اگر مستئ بہار نہیں؟
بہار آئی ہے پھر آتشیں لباس کیساتھ — شفق کی گود ہے، صحنِ بنفشہ زار نہیں
کسی کے جلوۂ رنگیں کی یہ نوازش ہے — میں شاکئ ستمِ شامِ انتظار نہیں
قفس سے تا بہ چمن جاؤں اور پھر آؤں — خطا معاف، میں لب تشنۂ بہار نہیں!
مذاقِ بوسۂ گل، احتیاطِ اہلِ چمن — یہ بزمِ رنگ و نوا خلوتِ بہار نہیں
وہ جلوہ ڈھونڈ رہا ہوں جو پھونک دے مجھ کو — کلیم میں بھی نہیں، تم اگر شرار نہیں
جنوں زدہ سہی کانٹوں پہ نیند کیوں آئے — مری نگاہ میں کیا فرشِ سبزہ زار نہیں
سوادِ صبحِ چمن کی ضیا فشانی دیکھ — طلوعِ بادہ ہی، خورشید کا ابھار نہیں
کبھی نشاطِ ساعت، کبھی جراحتِ روح — مغنیہ، ترے نغموں کا اعتبار نہیں

تلاشِ عشق میں ہے حسنِ فطرتِ معصوم

شعاعِ ماہ میں سیماب اضطراب نہیں

محفلِ عشق میں جب نام ترا لیتے ہیں — پہلے ہم ہوش کو دیوانہ بنا لیتے ہیں

روز اک دردِ تمنا سے نیا لیتے ہیں — ہم یونہی زندگیٔ عشق بڑھا لیتے ہیں

دیکھتے رہتے ہیں چھپ چھپ کے مرقع تیرا — کبھی آتی ہے ہوا بھی تو چھپا لیتے ہیں

ہم یہ کیوں بزم میں ہیں گرم نگاہیں! یعنی — دور بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا کیا لیتے ہیں

تجھے کر لیتے ہیں یوں اپنی مصیبت میں شریک — تیری تصویر پہ کچھ اشک گرا لیتے ہیں

حسن کا نام نہ لے عشق کے بندے خاموش! — کہیں یہ نامِ غلامانِ وفا لیتے ہیں؟

رنگ بھرتے ہیں وفا کا جو تصور میں ترے — تجھ سے اچھی تری تصویر بنا لیتے ہیں

جرعۂ عیش جو پیتے ہیں کبھی مجبوراً — اس میں تلخی بھی ترے غم کی ملا لیتے ہیں

دے ہی دیتے ہیں کسی طرح تسلی سیماب

خوش رہیں وہ جو مرے دل کی دعا لیتے ہیں

دامانِ عشق وادیٔ سینا سے کم نہیں — آنسو کی آبرو یدِ بیضا سے کم نہیں

کیفِ خیال نشۂ صہبا سے کم نہیں — قطرہ بھی اپنی موج میں دریا سے کم نہیں

قطعِ امید زود اثر ہے امید سے — جو یاس ڈھب کی ہو وہ تمنا سے کم نہیں

یا رب مری جبیں ہے، کہ اک رہگذارِ حسن — ہر داغِ سجدہ نقشِ کفِ پا سے کم نہیں

وہ سامنے نہ ہوں تو تصور سے کام لے — یہ چیز بھی نگاہِ تماشا سے کم نہیں

یوسف کی طرح عشق میں خودداریاں کہاں　　ورنہ مذاقِ حسن زلیخا سے کم نہیں
پرسانِ غم بھی کوئی نہیں چارہ گر کہاں　　اب پرسشِ غلط بھی مداوا سے کم نہیں
موسیٰ کے بعد پھر نہ وہاں جل سکا چراغ　　گو عمرِ طور عمرِ کلیسا سے کم نہیں
یوں کی ہے مشقِ دشت نوردی کہ تا ہنوز　　صحرا کی یاد، ذرۂ صحرا سے کم نہیں
احساسِ شرکتِ غمِ دنیا بجا، مگر　　ایک اپنا غم مجھے غمِ دنیا سے کم نہیں
ہر وقت اُن کے ساتھ ہوں ایک انتظام میں　　میرا خیال خوابِ زلیخا سے کم نہیں
جو ہر نفس سے چھیڑ دے اک نغمۂ طلب　　وہ خامشی بھی حسنِ تقاضا سے کم نہیں

سیماب دل حوادثِ دنیا سے بجھ گیا
اب آرزو بھی ترکِ تمنا سے کم نہیں

غمِ عشق سے سر گراں اور بھی ہیں　　جہاں ہم ہیں شاید وہاں اور بھی ہیں
کچھ آج اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا　　میں سمجھا مرے رازداں اور بھی ہیں
یہ دنیا اگر میرے قابل نہیں ہے　　ترے پاس یارب جہاں اور بھی ہیں
بہت رازِ دنیا سے میں کہہ چکا ہوں　　کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں
یہ نازش، یہ خود فہمیاں، یہ تفاخر　　تمہیں تو نہیں نوجواں اور بھی ہیں
مرے دشتِ وحشت میں آ تو دکھاؤں　　زمیں پر کئی آسماں اور بھی ہیں
بڑھاؤ نہ منزل کی شمعیں ابھی سے　　ابھی راہ میں کارواں اور بھی ہیں
میں اپنے نشیمن کی کیا خیر مانگوں　　مرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں

اثرِ سوزِ پروانہ سے لینے والے! یہاں چند آتش بجاں اور بھی ہیں
اگر میرے سجدوں سے ایسی ہی ضد ہے تو بندہ نواز آستاں اور بھی ہیں

نہیں میں نواسنج سیمابؔ تنہا
بھرا باغ ہے، نغمہ خواں اور بھی ہیں

آؤ پھر گرمیِ دیارِ عشق میں پیدا کریں طور کی مٹی سے تخلیقِ یدِ بیضا کریں
حسن کو پھر جلوہ آرائی پر آمادہ کریں پھر حدیثِ برق و ایمن کو فضا پیرا کریں
جن پہ صدیوں سے مسلط ہے غبارِ بیخودی ان نگاہوں کو حریفِ شربِ موجِ حسنی کریں
موج اندر موجِ بادہ - مختصر مینائے شوق ہر نفس سے، ہر نظر سے ایک دل پیدا کریں
دل کئی پہلو میں رکھیں، قابلِ سوز و گداز ایک ہی قطرے کو کیا پھیلائیں کیا دریا کریں!
دو حقیقی اور فطری نعمتیں ہیں حسن و عشق مادیت سے انہیں کیوں لعنت آلودہ کریں
مدتوں سے کر رہے ہیں سیرِ دنیائے مجاز اب حقیقت کے مناظر کا بھی اندازا کریں
عشق کی خودداریوں سے ہم اگر ہوں آشنا حدِ ممکن تک نگاہِ حسن سے پردا کریں
عشق اک شعلہ ہے- شعلہ ہے ہمیشہ سربلند کس کے آگے سر جھکائیں ہم کسے سجدا کریں!
عشق کا دل ہی بجائے خود محیطِ کائنات فصلِ گل میں کیوں طوافِ دامنِ صحرا کریں
حسن بھی ہے عشق ہی کی خوبصورت اک ادا عکسِ آئینہ سے، آئینے کو حیراں کیا کریں
آؤ یہ پردے الٹ ہی دیں نیاز و ناز کے ربطِ حسن و عشق سے عالم نیا پیدا کریں
حسن میں ہو عشق کی بو، عشق میں ہو رنگِ حسن پھر رتب رنگ و بوئے نو سے اک دنیا کریں

جتنے نغمے ہو چکے ہیں گم فضائے دہر میں　　اُن کو پھر آواز دیں، اک ساز میں یکجا کریں
مل چکے ہیں خاک میں جو ٹوٹ کر پھولوں کے جام　　اُن کو دستِ شاخ میں پھر ساغر و مینا کریں
لاؤ پھر ڈھالیں نئی شمعیں نئی کا نور سے　　خاکِ پروانہ سہی پروانے نئے پیدا کریں
لے گئی ہے موت جن جلووں کو ہم سے چھین کر　　اُن کو مدفن سے نکالیں، انجمن آرا کریں

زندگی دو دن کی اُس پر یہ جہاں ایجادیاں!
اہتمام اتنا کریں سیماب، اور پھر کیا کریں؟

نقاب، جلوۂ مستور کا حجاب نہیں،　　تلاش کردہ نگاہیں جو کامیاب نہیں
فریبِ جلوہ یقیناً ہے یہ، جو خواب نہیں　　کہ آج حدِّ نظر تک کوئی حجاب نہیں
کوئی ادا ہی محبت کی کامیاب نہیں　　ہنسی تو کیا مرا رونا بھی مستجاب نہیں
خرد فریب ہے نیرنگیِ جہانِ خراب　　کہ سب خراب ہیں اور پھر کوئی خراب نہیں
بقدرِ شوق ہے، رنگینیِ بہارِ جمال　　یہ ہے نظر کی جوانی، ترا شباب نہیں
حقیر ہوں، مگر اتنا حقیر بھی نہ سمجھ　　میں ذرہ بھی تو نہیں ہوں جو آفتاب نہیں
وہ دن گئے، یدِ بیضا ملا تھا انساں کو　　اب ایک داغِ شگفتہ بھی دستیاب نہیں
دہک رہا ہے شبستانِ عشق کا عالم　　یہاں نہیں کوئی تارا جو آفتاب نہیں
ہے ذرہ ذرہ سمندر جو ہو نظر سیراب　　یہ تشنگی کا تری عکس ہے سراب نہیں
ہر ایک جلوہ ہے اک جلوہ گاہِ حسن و جمال　　نگاہِ شوق کو یارائے انتخاب نہیں
نظر ہو پاک، تو ہو حسن ہمکنارِ نظر　　ہوس سے پردہ سہی عشق سے حجاب نہیں

نگاہِ عشق کی گرمی، ارے معاذ اللہ! — نگاہِ حسن کو بھی دیکھنے کی تاب نہیں
ہے انتظار میں فطرت کسی کے، میری طرح — اسے بھی نیند نہیں ہے مجھے بھی خواب نہیں
صلائے بادہ کشی دے نہ مجھ کو اے ساقی — ترے کرم سے ابھی زندگی خراب نہیں
الٰہی خلد میں رنگیں شبابِ رفتہ دے — یہ زہد کا سا بڑھاپا مرا شباب نہیں
سکھا تو دے مجھے آدابِ خواب اے شبِ قبر — ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں
لگائے بیٹھے ہیں اک شمعِ لاشریک سے لَو — ہماری بزم میں پروانہ باریاب نہیں
اگر ہے ذوقِ تماشا تو بند کر آنکھیں — جہاں نگاہ نہیں ہے وہاں حجاب نہیں

بغیرِ واسطہ مخمورِ عشق ہوں سیماب
خدا کا شکر کہ شرمندۂ شراب نہیں

پھر اپنے دل میں شورشِ شباب دیکھتا ہوں میں — الٰہی جاگتا ہوں میں کہ خواب دیکھتا ہوں میں!
پھر آج اپنی خلوتِ خموش و بے خروش میں — نشیدِ ساز و چنگ و رباب دیکھتا ہوں میں
جہاں اُداسیوں سے قبر کا سا اک سکوت تھا — وہاں سرود و بربط و رباب دیکھتا ہوں میں
حیات کی، نشاط کے، کھلے ہوئے ہیں میکدے — تمام ہستیوں کو بے نقاب دیکھتا ہوں میں
جسے ترس گئی تھی دیکھنے کو چشمِ آرزو — اُسے بقدرِ شوق بے حجاب دیکھتا ہوں میں
نوید، میرے نالہ ہائے سحر اعتبار کو! — کسی کے دل میں اپنا اضطراب دیکھتا ہوں میں
جو گر رہے ہیں میری آستیں پہ چشمِ حسن سے — اُن آنسوؤں میں موتیوں کی آب دیکھتا ہوں میں
مبارک انتظار کی شبِ کرشمہ کار کو! — زمین پر نجوم و ماہتاب دیکھتا ہوں میں

سجود میں جو سر تھا، اب وہ ہی کسی کی دوش پر　　جمود کی رگوں میں انقلاب دیکھتا ہوں میں
نظر فروز عقل سوز و روح تاب و جلوہ ساز　　پھر اپنی گود میں اک آفتاب دیکھتا ہوں میں
سمٹ کے رہ گیا ہے حسن تشنگی کنار میں　　نظر کو بے اٹھائے کامیاب دیکھتا ہوں میں
دماغ میں مہک رہا ہے اک جہانِ رنگ و بو　　نگاہ میں بھرے ہوئے گلاب دیکھتا ہوں میں
نفس میں بوئے پھر کسی حنائی دستِ ناز کی　　لبوں کے پاس شیشۂ شراب دیکھتا ہوں میں
جو لب فسردگی سے بے نیازِ کیف و رنگ تھے　　لب و عذار پر انھیں خراب دیکھتا ہوں میں

درِ دوست کی یہ سب جوانیاں ہیں وارثی
نہ یہ فریب نشہ ہے نہ خواب دیکھتا ہوں میں

کوئی کیف دل میں ہو نغمہ گر۔ تو سرودِ روح نواز ہو
وہی نغمہ کیوں نہ سنائے تو جو شکستِ عالمِ ساز ہو

جو نظر نہ واقفِ راز ہو، اُسے سوزِ عشق سے ساز ہو
نہ کھلی ہوں جس پہ حقیقتیں، وہ اسیرِ حسنِ مجاز ہو

تری چشمِ مست حسیں نہ ہو تو رہینِ حسنِ مجاز ہو
اُسے کیا ضرورتِ آئینہ جو نگاہ آئینہ ساز ہو

پھر اسی فضا کا ہوں منتظر جو ازل میں روح نواز تھی
وہی بزم ہو، وہ ہی کیف ہو، وہی نغمہ ہو، وہ ہی ساز ہو

مے و میکدہ ہو جس آنکھ میں وہ کسی کے سامنے کیوں جھکے

اُسے کیوں کسی سے نیاز ہو جو خدائے عالمِ ناز ہو

یہ مقدّراتِ عجیب ہیں یہ تباہیاں ازلی سی ہیں
کہ ترے شباب کے ساتھ ہی مری عمرِ عشق دراز ہو

اُنھیں خود نمائی سکھا تو دوں مگر اس خیال میں غرق ہوں
پڑے آئینہ پہ نظر وہ کیوں، جو شکستِ آئینہ ساز ہو!

یہی حسرتیں ہیں طور پر کئی بار کھینچ کے لے گئیں
کبھی ہم حریفِ کلیم ہوں، کبھی ہم سے راز و نیاز ہو

جو ہر ساعت نالہ ہو تو یہ یک نظر مجھے چھیڑ دو
میں وہ نوحہ زارِ خموش ہوں جو اسیرِ پردۂ ساز ہو

ہوں کلیم سیکڑوں رقص میں سرِ طور شعلۂ نازپر
اگر آج مستعدِ طلب، کششِ جہانِ نیاز ہو

یہ تمہاری نازنما خودی یہ مرا نیازیہ بندگی!
میں سمجھ چکا ہوں حقیقتاً کہ تمہیں خدائے مجاز ہو

ترے انتظار میں زندگی ہوئی ختم شام سے صبح تک
نہ فریب دے مجھے آرزو، نہ یہ رات اتنی دراز ہو

چل اُدھر مغنّیِ خوش بیاں، یہ تکلّفات نہ ہوں جہاں
ترا حسن صرف ہو نغمہ خواں، نہ یہ چنگ ہو نہ یہ ساز ہو

مرے دل کو حسن سے ہے سکوں، وہ رمیدہ خو نہ مجھے جنوں
میں کلیم ایمن ناز ہوں آسے کیوں نہ مجھ سے نیاز ہو!
جو ہوس ہی شربِ مدام کی تو بجھے گی مے سے نہ تشنگی
وہ نگاہ ڈھونڈیئے دارئی جو نگاہ میکدہ ساز ہو

برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو	ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو
ہوں آشنائے دوست، مجھے کیوں عطا نہ ہو؟	ایسی جبین جو دیر و حرم آشنا نہ ہو
ہوتا نہیں اثر دلِ آتش پرست پر	جبتک فضا میں گونجنے والی صدا نہ ہو
مر مر کے طے کیا ہے بمشکل یہ مرحلہ	پھر زندگی نتیجۂ ذوقِ فنا نہ ہو
حسن اختیار کرلے اگر وضعِ التفات	میرے لئے عذاب مذاقِ وفا نہ ہو
پھر چاہتا ہوں رابطۂ حسن و عشق سے	وہ ابتدا کہ جس کی کوئی انتہا نہ ہو
پھر مانگتا ہوں اُس نگہہِ دلنواز سے	وہ عالمِ سکون جو ابد تک فنا نہ ہو
اُلجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق	اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو
بھر دو مری نگاہ میں اتنی تجلیاں،	نظارے کو کبھی ہوسِ ماسوا نہ ہو
دو سر خوشی کا وقت ہے جب کائنات میں	دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو
رہنے دی امتیاز کے پردے پڑے ہوئے	اے حسن ہر نقاب سے جلوہ نما نہ ہو
مجھ خودی نہ ہو جو وہ کافر تو کیا کرے	جس کی نظر میں حدِ خودی تک خدا نہ ہو
آ، اور آخری نگہہِ یاس دیکھ جا!	شاید پھر اس کے بعد عبادت ادا نہ ہو

سیماب ترکِ عشق و عزمِ زندگی غلط،
وہ کام کیوں کریں جسے دل مانتا نہ ہو

ہماری خانہ ویرانی زمانے پر عیاں کیوں ہو؟ جلے جتنا نشیمن، سرخ اتنا آسماں کیوں ہو؟
رہ و رسم آشنا ہوں، سعیِ میری رائیگاں کیوں ہو جو منزل سے بھٹک جائے وہ میرِ کارواں کیوں ہو؟
یہ بے چینی، یہ بے کیفی یہاں کیوں ہو وہاں کیوں ہو؟ جو سرشارِ محبت ہو تو دنیا سر گراں کیوں ہو؟
قفس اور آشیاں پستی و بالا کے نمونے ہیں قفس میں کوئی رہ کر بے نیازِ آشیاں کیوں ہو؟
اٹھو تو ہر جگہ یعنی تعین کی حدیں توڑ دو، نہیں ہے جب مکاں کی قید، قیدِ لامکاں کیوں ہو؟
جبیں ہم جس جگہ رکھ دیں گے اک کعبہ بنا لیں گے سلامت ذوقِ سجدہ، آپ ہی کا آستاں کیوں ہو؟
محبت اور ایسی کس مپرسی، ہائے مجبوری! کوئی رسوا ہی مجھ سے پوچھ لے ناشادماں کیوں ہو؟
جہاں میں تھک کے جا بیٹھوں زمینِ کوئے جاناں پہ وہیں سے ابتدائے انقلابِ آسماں کیوں ہو؟
وہ اکثر خلوت و جلوت میں میرے پاس رہتے ہیں حجاب ان کا تصور کی نزاکت پر گراں کیوں ہو؟
سمیٹا دفترِ غم میں نے اک لفظِ تمنا تک مجھی محفل میں حکمِ اختصارِ داستاں کیوں ہو؟
جوانی اور مرگِ عشق! یہ ہے رقص کا موقع! غزلخواں ہو مرے ماتم میں کوئی نوحہ خواں کیوں ہو؟
کسی نے یہ نہ سوچا جب ہی تقدیرِ انساں کی کہ یہ جنسِ گرانمایہ خرابِ خاکداں کیوں ہو؟
اعادہ کر اسی تکبیرِ وقتِ قتل کا آ کر مری میت پہ اے قاتل نمازِ بے اذاں کیوں ہو!
نہ پہونچا میں مگر منزل پہ میری نعش تو پہونچی، نہ ہو جان اتنی جسم و شریکِ کارواں کیوں ہو؟
مجھے ہے اعتبار اے ہم نفس اپنی رہائی کا، بنے جس سے قفس وہ میری شاخِ آشیاں کیوں ہو!

جھکا دے سر اسی پر سامنے آجائے جو ذرہ ۔۔۔ کہ جب سجدہ ہی کرنا ہے تو قیدِ آستاں کیوں ہو؟

شہیدانِ بہار اپنا تصرّف گر نہ فرمائیں
تو پھر رنگین اے سیماب صبحِ گلستاں کیوں ہو؟

رسماً ہی اُن کو نالۂ دل کی خبر تو ہو ۔۔۔ یعنی اثر نہ ہو تو فریبِ اثر تو ہو

افسانۂ فراق کہیں مختصر تو ہو ۔۔۔ شامِ چمن نہ ہو جو میسر سحر تو ہو

کثرت میں جس کو حسن کے جلوے نصیب ہوں ۔۔۔ خلوت میں کم سے کم وہ نظر عرش پر تو ہو

ہم بھی تمہاری بزم میں ہیں درخورِ کرم ۔۔۔ اچھا وہ مستقل نہ سہی اک نظر تو ہو

ہے ہر حجابِ حسن فقط نام کا حجاب ۔۔۔ پردے میں دم کہاں ہے کوئی پردہ در تو ہو

سب کچھ اسی نظر میں ہے، بادہ بھی کیف بھی ۔۔۔ کوئی ہماری طرح خرابِ نظر تو ہو

کیا فرض ہے کہ ہم نہ ہوں تقدیر آزما ۔۔۔ دنیا پڑی ہوئی ہے درِ یار پر تو ہو

دیر و حرم میں سجدے کریں کون رائیگاں ۔۔۔ گر ہو نہ تیرا پاؤں تری رہگذر تو ہو

سب کہہ رہے ہیں ہم پہ گراں ہے شبِ فراق ۔۔۔ اسکا بھی کچھ علاج کریں گے، سحر تو ہو

یہ بارِ دوش، بار نہ ہو پائے ناز پر ۔۔۔ سجدہ کریں، مگر ترے سجدے کو سر تو ہو

ہر پھول منتظر ہے گریباں لیے ہوئے ۔۔۔ دیوانے سیکڑوں، کوئی دیوانہ گر تو ہو

شب ہائے زندگی میں یہی تھا مرا انیس ۔۔۔ مدفن میں کوئی ہو کہ نہ ہو، چارہ گر تو ہو

جامِ شراب اور شباب و جمالِ دوست ۔۔۔ یہ دور تا ابد نہ سہی، عمر بھر تو ہو

آوارگی نصیب ہوں شکوہ یہی تو ہے ۔۔۔ صحرا ہو یا چمن، کہیں رہنے کو گھر تو ہو

ہاں عرش کا بھی ہے اسی منزل سے راستہ　　　لیکن کسی کا تنزلِ دل تک گذر تو ہو
پروانے سے بھی ہیچ ہے کیا شمعِ زندگی؟　　　یارب اسے فروغ بقدرِ شرر تو ہو

سیماب آدمی رات کو آئیں وہ بے قرار
تیری دعائے نیم شبی میں اثر تو ہو

صبوحی لا کہ وقتِ صبح ہے اے پیرِ میخانہ　　　تھکا ہارا ہے ساری رات کا رہگیرِ میخانہ
وداعِ ہوش ہی ہر نقشِ پرتا ثیرِ میخانہ　　　وفورِ شوق سے گویا ہوں میں تصویرِ میخانہ
مجھے پھر کھینچ لایا شوقِ دامنگیرِ میخانہ　　　کدھر ہے ساقیٔ کمسن، کہاں ہے پیرِ میخانہ؟
نگاہیں مست ہو کر باریابِ محفلِ ہُو ہوں　　　درِ کعبہ پہ کوئی کھینچ دے تصویرِ میخانہ
الٰہی عمر بھر مجھ کو ملے افتادگی ایسی　　　ہر صہبا زدہ ہو اور ہاتھ ہو پیرِ میخانہ
شبابِ شامِ عشرت ہی، اک ایسا جام بھر کر دے　　　جوانی صبح تک جھوما کرے اے پیرِ میخانہ
مرا رنگِ جوانی غازۂ پیمانۂ و مینا　　　مرے اشکِ مسرت روغنِ تصویرِ میخانہ
یہ آنکھیں ساغرِ مے یہ جوانی نشۂ صہبا　　　خدا رکھے تمہیں، تم بھی تو ہو تصویرِ میخانہ

خودی کا شور اے سیماب ہے توہینِ سرمستی
حدیثِ بیخودی ہے آیۂ تطہیرِ میخانہ

نفَس نفَس ہے مرا پردۂ بہار، نہ پوچھ　　　مرے تصورِ رنگیں کا اعتبار نہ پوچھ
بہ جبر دل میں جسے جمع کر کے رکھا تھا　　　کہاں گئی وہ مری دولتِ قرار نہ پوچھ
ہوئے زمانے، کہ آوارۂ بیاباں ہوں　　　مرے چمن کو کہاں لے گئی بہار نہ پوچھ

خود اختیار میں اپنے نہیں وہ غارتِ دل ملا ہے کس کو مرے دل پر اختیار نہ پوچھ
فضا پہ چھائی ہوئی موت کی اُداسی تھی ، یہ ابتدا تھی ، اب انجامِ انتظار نہ پوچھ
بہ ہر نفس مری بیتابیوں کی شدت دیکھ بہ ہر نظر مجھے کس کا ہے انتظار نہ پوچھ
میں بعدِ مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ
تمام رات تصور، تمام دن تصویر ہماری عمرِ محبت کے کاروبار نہ پوچھ

نہیں نشان مسرت کا روح تک سیماب
دراز دستیٔ غمہائے روزگار نہ پوچھ

غرض کی دنیا ہے ساری دنیا یہاں وفا کا چلن نہیں ہے
مجھے کہیں اور لے چل اے دل کہ یہ مری انجمن نہیں ہے
نکل بنائی ہوئی حدوں سے نگاہ کو وسعتیں عطا کر
تمام عالم وطن ہے تیرا اگرچہ تیرا وطن نہیں ہے
میں عرش سے بھی کچھ اور بڑھ کر ہوں طالبِ مرکزِ تماشا
مری نگاہِ بلند کی حد بساطِ چرخِ کہن نہیں ہے
یہی اگر شرطِ گفتگو ہے تو ہم سے بھی روز گفتگو ہو
ہمیں بھی مثلِ کلیم تم سے مجالِ عرضِ سخن نہیں ہے
دوئی کے پردے اُٹھا رہے ہیں صدا انا کی لگا رہے ہیں
ہماری دنیائے بیخودی میں وجودِ دار و رسن نہیں ہے

تھی روح کا قید خانہ دنیا، ہے قبر زندانِ جسمِ خاکی
اگر وہ میرا وطن نہیں تھا تو یہ بھی میرا وطن نہیں ہے

شگفتہ چہرے ہیں جنکے سیماب، دل نہیں شاید انکے رنگیں
چمن کا ظاہر چمن ہے لیکن چمن کا باطن چمن نہیں ہے

تو بے حجاب ہے آئینہ تجھ کو تکتا ہے — سنبھل! سنبھل!! یہ ستم کون دیکھ سکتا ہے
وہ اُس کی سُنتے ہیں جو بات کر نہیں سکتا — وہ ہے کلیم جو ہر لفظ پر اٹکتا ہے
مرا یہ حال، کہ سب کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں — ترا جمال، کہ سب میں ہے اور یکتا ہے
ہجومِ غم سے ٹپکتی تھی چشمِ تر کل تک — وفورِ اشک سے آج آشیاں ٹپکتا ہے
سکوتِ مرگ ہے اک انتہا تحیر کی — طریقِ عشق میں مرنے کا نام "سکتا" ہے
بتائیں تو مری ہستی بگاڑنے والے! — بگاڑ کر کوئی مجھ کو بنا بھی سکتا ہے
اسیرِ کنجِ قفس کا یہ حال ہے اب تو — خود اپنے زمزمے سُنتا ہے خود پھڑکتا ہے
تصورات کی خلوت میں کر تلاش اسکو — تحیرات کی دُنیا میں کیوں بھٹکتا ہے!
تجھے نہ دیکھ سکوں میں تو کچھ ملال نہیں، — یہی بہت ہے کہ تو مجھ کو دیکھ سکتا ہے

گیا شباب بھی، پیری بھی آگئی سیماب
مگر یہ تکیۂ پہلو کہیں سرکتا ہے!

اب اسے بیدرد کیا اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے؟
پھر اپنی خاک سے پیدا دلِ برباد ہوتا ہے!

تصوّر جب انیسِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے
جہانِ دل تری تصویر سے آباد ہوتا ہے
اسیرانِ وفا گھبرائیں کیوں تجویزِ زنداں سے
یہیں تو امتحانِ فطرتِ آزاد ہوتا ہے
نشاطِ زندگی دنیا میں ساماں اور ہیں لاکھوں
مگر میں کیا کروں جب دل تمہیں سے شاد ہوتا ہے
جہانِ حسن کے آداب وآئیں کی شکایت کیا
یہاں مظلوم ہی شائستۂ بیداد ہوتا ہے
نہ جا علمِ حقیقت پر، حقیقت اور ہی کچھ ہے
کبھی اک نقشِ باطل حاصلِ ایجاد ہوتا ہے
مراسم کی کڑی، قیدِ علائق، محبسِ ہستی
بڑی دشواریوں سے آدمی آزاد ہوتا ہے
جگہ ملتی نہیں جس کو شبِ غم محشرِ دل میں
وہ ہنگامہ لبِ خاموش میں آباد ہوتا ہے
بدل دی کثرتِ اندوہ نے فطرت مرے دل کی
یہ اب ناشاد ہونے سے، زیادہ شاد ہوتا ہے
ٹھہر جاتا ہے جب دل بے قرارانِ محبت کا

وہ اک لمحہ سکونِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے

مٹا دو، خاک کر دو، پھونک دو، کر دو فنا، لیکن
ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے!

بہار آئی ہے استقبال کرنے بابِ زنداں تک
نہیں معلوم سیماب آج کون آزاد ہوتا ہے

ہستیٔ انساں، بڑی صنعت کی اک تعمیر تھی ۔۔۔ اور اس تصویر کے پردے میں اک تصویر تھی
کچھ اثر تھا آہ میں، نالے میں کچھ تاثیر تھی ۔۔۔ کچھ کرم تھا حسن کا، یائی مری تقدیر تھی
بزمِ فطرت میں عجب ترکیبِ دار و گیر تھی ۔۔۔ مست تھا پروانہ، پائے شمع میں زنجیر تھی
شامِ غم تا صبح، وہ آئے نہ چین آیا نہ موت، ۔۔۔ قسمتِ بیچارگی، تاخیر ہی تاخیر تھی
پا بگل ای مرنے والے کیوں پڑا ہے زیرِ خاک ۔۔۔ اس خرابے میں تجھے تو حسرتِ تعمیر تھی!
حسنِ رنگا رنگ کی ندرت ادائی نہ پوچھ ۔۔۔ ہر مصور کے تخیل میں نئی تصویر تھی
مجھ کو اس دنیا سے کوئی کھو ڈالا تھا ضرور ۔۔۔ یہ نہیں معلوم تم تھے یا مری تقدیر تھی
اس کو اکثر شورشِ عالم نے برہم کر دیا ۔۔۔ جس تصور میں مرے معیار کی تصویر تھی
میں کبھی بھی نہ محفل سے کسی کی اٹھ سکا ۔۔۔ ایک نامعلوم قوت تھی کہ دامنگیر تھی
اڑ رہے ہیں گردِ بربادی میں کچھ اوراقِ دل ۔۔۔ ان میں وہ صفحہ نہ ہو جس پر تری تصویر تھی!
لے لیا کیوں آپ نے الزام میری موت کا ۔۔۔ اس تباہی میں ابھی گنجائشِ تقدیر تھی
اپنے منشا پر گناہوں کو مرے محمول کر ۔۔۔ یا مقر ہو جا کہ مجھ میں قوتِ تقصیر تھی

تھا وطن میرا کبھی سیماب عنوانِ ادب
سرزمینِ تاج "مہدِ میر زادِ میر تقی"

جلوہ ترا امکان سے باہر تو نہیں ہے　　لیکن مری آنکھوں کو میسر تو نہیں ہے
آنکھیں ہیں مری بند رہِ عشق میں یارب　　آگے کوئی اس راہ میں ٹھوکر تو نہیں ہے؟
تھک تھک کے پلٹتی ہیں شبِ وعدہ نگاہیں　　تا حدِ نظر فاصلۂ در تو نہیں ہے
محویتِ خاموشِ تصور سے نہ گھبرا　　دل میں ہی ترا نام زباں پر تو نہیں ہے!
دیکھو مری جانب، مرا دل چاک نہ ہوگا　　آخر ہے نظر، دشنہ و خنجر تو نہیں ہے
اب دل کی صداؤں میں وہ پہلا سا نہیں کیف　　نغمہ کوئی اس ساز سے باہر تو نہیں ہے؟

سیماب نہ میری تھی نہ اُن کی ہی جوانی
کیا کیجئے لیکن انہیں باور تو نہیں ہے

مری فطرت وفا ہے، دے رہا ہوں امتحاں پھر بھی　　وہ فطرت آشنا ہے، اور مجھ سے بدگماں پھر بھی
چھپاتا ہوں مگر چھپتا نہیں دردِ نہاں پھر بھی　　نگاہِ یاس ہو جاتی ہے دل کی ترجماں پھر بھی
غمِ واماندگی سے بے نیازِ ہوش بیٹھا ہوں　　چلی آتی ہے آوازِ درائے کارواں پھر بھی
وہ میرے سر کو ٹھکراتے ہیں سجدوں سے خفا ہو کر　　جبیں سے میری پیوستہ ہے انکا آستاں پھر بھی
کلیسا اور کعبہ نام کو دو جلوہ گاہیں ہیں　　مگر یک رنگ ہے ذوقِ جبینِ آستاں پھر بھی
وفا اک لذتِ پرکیف ہے اک آیتِ تسکیں　　وفا کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں پھر بھی
حجاب اندر حجاب امواجِ طوفانِ تجلی ہیں　　فروغِ شمع سے پروانہ ہے آتش بجاں پھر بھی

اشاروں سے نگاہوں سے بہت کچھ منع کرتا ہوں　قفس ہی پر مگر پڑتی ہے شاخ آشیاں پھر بھی!

بہت دلچسپ ہے سیماب شام وادیٔ غربت
وطن کی صبح میں کچھ اور تھیں رنگینیاں پھر بھی

وہ تنہائی ہو یا محفل ہو، تسکیں دل کی مشکل ہے
بنا لیتا ہے خود اپنے لئے جلوے، یہ وہ دل ہے

ہے باطل محفلِ عالم تو پھر مشکل ہی مشکل ہے
مری نظریں بھی باطل ہیں، ترا جلوہ بھی باطل ہے

وہاں ہوں میں، جہاں تمیزِ حسن و عشق مشکل ہے
ہر اک جلوہ اب آغوشِ نظر میں جلوۂ دل ہے

کمالِ علم و تحقیقِ مکمل کا یہ حاصل ہے
ترا ادراک مشکل تھا، ترا ادراک مشکل ہے

یہ ویرانی تصور کی، وہ رنگینی خیالوں کی،
کبھی محفل میں خلوت ہے، کبھی خلوت میں محفل ہے

غلط سمجھا جو تو محدود سمجھا راہِ ہستی کو،
جہاں ہوتی ہے منزل ختم، وہ آغازِ منزل ہے

جنوں کا ہاتھ دامن سے نہ پہونچا پردۂ دل تک
ابھی باقی وہی پابندیٔ آدابِ محفل ہے

(محمل)

بقدرِ ظرف و ہمت، سہل و مشکل ہے رہِ الفت
یہاں ساحل بھی دریا ہے، یہاں دریا بھی ساحل ہے

اُڑا کر دھجیاں پیراہنِ ہستی کی خوش تھا میں
ندا آئی، یہ دیوانے جنوں کی پہلی منزل ہے!

ہوئی معلوم وجہِ اضطراب و شورشِ عالم
یہاں دل ہے ہر اک ذرہ، ہر اک ذرے میں اک دل ہے

میں غافل ہو کے دانستہ خرابِ بزمِ ہستی ہوں
سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے، خوابِ محفل ہے

وہ آئینہ ہو، یا ہو پھول، تارہ ہو کہ پیمانہ،
کہیں جو کچھ بھی ٹوٹا، میں یہی سمجھا مرا دل ہے

نہ چھیڑ اے نغمہ گر تسکینِ بے ہنگام کے نغمے
فضاؤں میں ابھی گنجائشِ شورِ سلاسل ہے

اُجالا ہو تو ڈھونڈوں دل بھی پروانوں کی لاشوں میں
مری بربادیوں کو انتظارِ صبحِ محفل ہے

الٰہی غفلتِ عالم کو رنگِ ہوشیاری دے
کہ تو غافل نہیں دنیا سے، دنیا تجھ سے غافل ہے

وہ دل لے کر ہمیں بے دل نہ سمجھیں، اُن سے کہدینا،

جو ہیں مارے ہوئے قطروں کے اُن کی ہر قطر دل ہے
وہ اے سیماب کیوں سرگشتۂ تسنیم و جنت ہو
میسر جس کو سیرِ "تاج" اور جمنا کا ساحل ہے

جگا نہ روح کو، نغمہ نواز ہی دے — خراب لذتِ سوز و گداز رہنے دے
یہ سر وہ ہے جو کسی کے قدم پہ جھک نہ سکا — نیاز کی مرے کر قدر ناز رہنے دے
کبھی کھلے گی حقیقت مری محبت کی — یہ راز ہے اسے فی الحال راز رہنے دے
ہوس کو بھول کے بھی غور کر محبت پر — حقیقتوں کو شریکِ مجاز رہنے دے
بطورِ خاص وہ کیوں دعوتِ تماشا دیں — مچل نہ اے نگہِ امتیاز رہنے دے
مرا مجاز بدل جائیگا حقیقت سے — نظر کو اپنی یونہی دل نواز رہنے دے
خودی کہاں، کہ ابھی بیخودی بھی ناقص ہے — سرود ریزِ محبت کا ساز رہنے دے
میں چاہتا ہوں وہ بادل، وہ برق، اور وہ ہوا — جو سیرِ عالمِ رنگیں سے باز رہنے دے
یہی نیاز تو ہے نازِ عشق اے سیماب
یونہی فتادہ جبینِ نیاز رہنے دے

پائے فضا میں لغزشِ مستانہ چاہیے — ہر ذرۂ خراب میں میخانہ چاہیے
سب سے الگ پرستشِ جانانہ چاہیے — اے برہمن خیال میں بتخانہ چاہیے
ہنگامۂ بہار سے گھبرا گیا ہے دل — مجھ کو سکونِ خامشِ ویرانہ چاہیے
ہر انجمن میں موقعِ وجدان و رقص ہے — آزادیٔ طبیعتِ پروانہ چاہیے

اے جانے والے نجد کے، لازم ہے ترکِ ہوش
کچھ احترامِ تربتِ دیوانہ چاہیئے!

بت ہوں نہ ہوں، بتوں سے تعلق ضرور ہو
کعبے میں بھی نشاطِ صنم خانہ چاہیئے

رنگِ بساطِ دیر و حرم ہے بہت خراب
اِن خشکیوں میں بارشِ پیمانہ چاہیئے

بے بادہ سادہ ہیں تری آنکھوں کی گردشیں
ان گردشوں کے ہاتھ میں پیمانہ چاہیئے

وہ شاخِ نے ہو، یا ہو گلوئے مغنیہ
مجھ کو تو ایک نغمۂ مستانہ چاہیئے

نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی
صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیئے

اے شوقِ بزمِ دوست، اگر ابارِ غم نہ کر
دل میں تراکتِ پرِ پروانہ چاہیئے

اے دل یہ پچھلی رات، یہ تسکینِ کائنات
اس وقت ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے

سیماب راہِ عشق میں قسمت کے کھیل ہیں
کہنے کو صرف ہمتِ مردانہ چاہیئے

وہ جب رنگِ پریشانی کو خلوت گیر دیکھیں گے
تو اپنے ہر تصور میں مری تصویر دیکھیں گے

نظر جن کی اسیرِ حلقۂ تدبیر رہتی ہے
وہ کیا انجامِ کارِ دعوتِ تقدیر دیکھیں گے

سنا ہے حسن کو وہ چند کر دیتا ہے یہ شیشہ
لگا کر اپنے دل میں آپ کی تصویر دیکھیں گے

جنھیں ہے عذر اک لفظِ تمنا کی سماعت سے
وہ اک دن جابجا اس لفظ کی تفسیر دیکھیں گے

مآلِ اہلِ غفلت ہو چکا بیدار دنیا میں،
جو خوابیدہ ہیں خود کیا خواب کی تعبیر دیکھیں گے

وفا کا تذکرہ کیا، اب تو یہ ارشاد ہے ان کا،
کہ تم نالہ کرو ہم گرمیٔ تاثیر دیکھیں گے

گدازِ غم سے ہیں تحلیل کی نوعیتیں لاکھوں
وہ ہر آنسو میں دل کی اک نئی تصویر دیکھیں گے

حسابِ جُرم و نقدِ عمر سب کہنے کی باتیں ہیں　　کہاں تک وہ کسی کا دفترِ تقصیر دیکھیں گے!
شکستہ ہر کڑی ہے ہر کڑی میں دل کی کڑی ہیں　　بڑی عبرت سے دیوانے مری زنجیر دیکھیں گے

خیالِ حشر و فکرِ نشر اے سیماب لاحاصل
کہ ہے تقدیر میں جو کچھ بہر تقدیر دیکھیں گے

نہ وہ شورِ طور و کلیم ہے، نہ وہ زورِ برق و شرار ہے
دلِ ناشکیب کو کیا کروں کہ ہلاکِ جلوۂ یار ہے

وہی پرورشِ شبِ تار ہے، وہی بارشِ غمِ یار ہے
کوئی فرق ہو تو بتاؤں میں! نہ قرار تھا۔ نہ قرار ہے

مجھے اُس نگاہ پہ ناز ہے، جسے بزمِ ناز میں بار ہے
مجھے اُس حجاب پہ رشک ہے جو شریکِ جلوۂ یار ہے

وہی صبر پاشِ تعلّیاں، وہی ضبط سوزِ تجلّیاں
نہ عنایتیں نہ تسلّیاں، یہ مذاقِ جلوۂ یار ہے

شبِ عیش ختم ہے بلبلو، چلو چھپ کے پھولوں میں سو رہو
کہیں رازِ دوش نہ فاش ہو کہ قریبِ صبحِ بہار ہے

اُٹھے ابر جھوم کے چار سو، ہوا صاف مشرقِ رنگ و بو
مگر ایک مطلعِ آرزو، کہ اسیرِ گرد و غبار ہے!

کہیں جوشِ گل ہے سُبو سُبو، کہیں نکہتیں ہیں تُو بہ تُو،

یہ ہے اک قیامتِ رنگ و بو کہ طلوعِ صبحِ بہار ہے

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول سے تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

ہم اسیرِ باغ میں ہو گئے، نہ کہا کسی نے زباں سے یہ،
نہ کرو جدا اسے باغ سے، یہ ادا شناسِ بہار ہے

جو کلی کھِلے گی نہ صبح تک وہ بنے گی شمعِ شبِ چمن،
سرِ شاخ پھول جو کھِل گیا وہ چراغِ شامِ بہار ہے

انھیں تربتوں کی تھیں قسم، یونہی تھوڑی دور قدم قدم
کہ صد آرزو زدہ کرم ابھی اور ایک مزار ہے

نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے
ہمیں کام ہے درِ یار سے، درِ یار پھر درِ یار ہے!

یہ تمام شعبدے وارثیؔ، ہیں فقط نشاطِ نظر مِری
نہ خزاں پہ ہے مِری دسترس نہ بہار میری بہار ہے

کسی حد تک تو تقلیدِ خرامِ یار ہو جائے　　الٰہی خاک میری مائلِ رفتار ہو جائے

جو انساں بادیاب پردۂ اسرار ہو جائے　　تو اس باطل کدہ میں زندگی دشوار ہو جائے

یہ دنیائے وفا دنیائے بے آزار ہو جائے　　مجھی پر کیوں نہ تکمیلِ جفائے یار ہو جائے

وہ کیا جانے فریبِ عہد و پیماں کی تہ کاری　　جو بیچارہ ہلاکِ شوخیٔ اقرار ہو جائے

ہے اک احسان حیرت بھی، مگر احسانِ بے معنیٰ
یہ حیرت بھی شریکِ جلوہ گاہِ یار ہو جائے

جو ظلمت میں بھی تنویرِ حقیقت دیکھنا چاہے
وہ میری طرح پچھلی رات سے بیدار ہو جائے

غرورِ حسن بھی میرے لئے جزوِ ادا ٹھہرے
مرا احساس بھی تیرے لئے پندار ہو جائے

میں ہوں بے کیف، کوئی چھیڑ ایسی ہی رہے مطرب
کہ اک نغمے سے سازِ زندگی بیکار ہو جائے

کہاں ظاہر پرست آنکھیں، کہاں باطن نشیں جلوے
جو نامحرم ہو وہ کیوں محرمِ اسرار ہو جائے

تمہارے ان حسیں ہونٹوں میں مرکز ہے تجلی کا
جہاں ہنس دو، وہیں ہنگامۂ انوار ہو جائے

ارادہ ہے کہ پہونچیں چھاؤں میں تاروں کی منزل پر
سحر سے پہلے پہلے قافلہ تیار ہو جائے

لطافت کی کمی کیا ہے ترے اندازِ تسکیں میں
وہی غم کیوں ملے مجھ کو جو دل پر بار ہو جائے

نکمی ہو کے رہ جائے مری دانست میں دنیا
اگر آغاز آگاہِ مآلِ کار ہو جائے

بگولہ ہی بنا دے اے ہوائے کوچۂ جاناں
اسی صورت طوافِ آستانِ یار ہو جائے

تو کیا اس ابر و باد و برق و باراں کے تلاطم سے
یہ مطلب ہے کہ تنظیمِ چمن دشوار ہو جائے؟

رہا جبتک قفس والے ہوں پاداشِ نشیمن سے
چمن والوں سے کہہ دو آشیاں تیار ہو جائے!

امیرِ کارواں، کچھ آنسوؤں سے کام لے اپنے
وہ چھینٹا دے کہ روحِ کارواں بیدار ہو جائے!

غمِ پنہاں سے دم گھٹتا ہے اے سیماب کیا کیجئے!
خدا ایسا کرے یہ قابلِ اظہار ہو جائے

بیٹھا تو عجزِ نقشِ کفِ پا لئے ہوئے
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لئے ہوئے

خواب و خیالِ عشرتِ دنیا غلط ہوا
جانا پڑا مجھے غمِ دنیا لئے ہوئے

دیتا ہے مجھے فریبِ نویدِ حیات تم — جب لوگ جا رہے ہوں جنازا لئے ہوئے

محشر میں ہے ضرورتِ وسعت بقدرِ شوق — میں آرہا ہوں اک نئی دنیا لئے ہوئے

تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ! — آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے

اس خاکدانِ عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ — ذرّے پڑے ہیں وسعتِ صحرا لئے ہوئے

نکلا ہوں بھیک مانگنے امن و سکوں کی میں — شاید ہو کوئی قلبِ شکیبا لئے ہوئے

تھی کثرتِ جمال سے تاریک بزمِ دہر — آنا پڑا چراغِ تمنا لئے ہوئے

اب طور کی حدود میں قدغن ہے حسن کا — آئے نہ کوئی چشمِ تماشا لئے ہوئے

سیمابؔ اُف! یہ تابشِ خونِ جنونِ عشق
ہر آبلہ ہے مشعلِ صحرا لئے ہوئے

معصوم ہے وہ جلوہ لیکن یہ واقعہ ہے — جب سامنا ہوا ہے برباد کر دیا ہے

بیگانگی بقدرِ اصرار و التجا ہے — شاید ترے ستم کو اندازۂ وفا ہے!

میری نیاز مندی ہے یادگارِ عالم — ہر ذرّے پر نشانِ سجدہ بنا ہوا ہے

فطرت سے بندگی کو گنجائشیں ملی ہیں، — ہر در پہ ایک بت ہے، ہر گھر میں اک خدا ہے

اتنی خبر نہیں ہے وارفتۂ طلب کو — سجدہ کہاں کیا ہے؟ سجدہ کسے کیا ہے؟

صانع کی صنعتوں پہ سو حسن کیوں نہ برسیں — اپنی کسی ادا کو انساں بنا دیا ہے!

سیمابؔ معرفت کی گہری نظر سے دیکھو
ذرّوں میں ہے تجلّی، مٹّی میں کیمیا ہے

خالی نہیں جہاں میں کوئی لطف اثر سے
دنیا محیط نکلی ہنگامۂ نظر سے

واقف وہ کیا ہو لطفِ آزادیٔ نظر سے
جو عمر بھر نہ نکلا زندانِ بام و در سے

گردش ہی کچھ زیادہ تدبیرِ چارہ گر سے
تھا دردِ سر ہی بہتر درمانِ دردِ سر سے

ہر ہر قدم پہ حائل ہے راہ و رسمِ منزل
میں اور کھو گیا ہوں تقلیدِ راہبر سے

اے شوقِ دید چل بھی منزل کہیں تو ہوگی
اب گھر کا لوٹنا کیا دور آگئے ہیں گھر سے !

گو راہِ دوست میں ہوں آوارۂ منازل
آگے ہوں پھر بھی کوسوں پابندِ رہگذر سے

وسعت نظر کو دے کر خود پردہ در بنایا
خود ہی شکایتیں ہیں گنجائشِ نظر سے

کھوئے گئے ہیں جتنے انکا پتہ ملے گا
تیرے ہی نقشِ پا سے تیری ہی رہگذر سے

محویتِ تصور صورت بدل رہی ہے
تصویر بن گیا ہوں تخئیل کے اثر سے

شاید ہوا مکمل میرا مذاقِ وحشت
ویرانیوں کے منظر پیدا ہیں آج گھر سے

درمانِ عاشقی کی ترکیب ہی نئی ہے
کرنا پڑا ہے مجھ کو پرہیز چارہ گر سے

کیا جانیں ہوش والے عرفاں کی رسمِ باطن
تیری خبر ملے گی تیرے ہی بے خبر سے

اندازۂ نظر میں تھی حدِ ہر دو عالم
تم پھر بھی دور نکلے اندازۂ نظر سے !

جب منفعت ہوئی ہے انکی سکوں نگاہی
چن چن کے لگ گئی ہے کانٹے دل و جگر سے

خوگردۂ خلش ہوں، مجھ سے چرا نہ آنکھیں
اک درد مانگتا ہوں وہ بھی تری نظر سے !

طولانیٔ مرض سے اسکا تو فائدہ ہے
سیماب جی رہا ہوں تقدیرِ چارہ گر سے

اک جہاں میرا شریکِ آرزو محفل میں ہے
کاش وہ تیری تمنا ہو جو میرے دل میں ہے

آبرو سوزِ نگہ سے ویرانیٔ محفل میں ہے
آپ ہیں اُجڑے ہوئے دل میں تو سب کچھ دل میں ہے

اپنے دل میں دے جگہ اس خانہ خرابِ عشق کو
آخر اے بیدرد تو بھی تو کسی کے دل میں ہے

سب تجھی کو پوچھتے آتے ہیں بزمِ ناز میں،
کوئی میرا پوچھنے والا بھی اس محفل میں ہے؟!

جوشِ غم، ہنگامۂ حسرت، ہجومِ آرزو،
آپ کیا دل میں ہیں اک دنیا کی دنیا دل میں ہے

تنگنائے دل میں گھٹتی ہے نکل سکتی نہیں
آرزو کے ساتھ تیری یاد بھی مشکل میں ہے

وحدت و کثرت کا ہی سیماب یہ بھی اک طلسم
اُس کو ہر دل ڈھونڈتا ہے اور وہ ہر دل میں ہے

نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے، مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے
بدن سے روح رخصت ہو رہی ہے مکمل قیدِ غربت ہو رہی ہے
میں خود ترکِ تعلق پہ ہوں مجبور کچھ ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے!

جفا اُن کی دلِ زود آشنا پر، — بہ مقدارِ محبت ہو رہی ہے
سرِ محفل نہ کیوں کُھل کر پیوں میں، — اُن آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے
خدا سے مل گیا ہے حُسنِ کافر — خدائی پر حکومت ہو رہی ہے
سکونِ نظمِ وحدت پھر عطا کر — کہ برہم بزمِ کثرت ہو رہی ہے
تجلّی کا مذاقِ جبر معلوم — نظر مجبورِ حیرت ہو رہی ہے
یہ بے ربطی، یہ نقصِ وعظ واعظ! — جوانی میں نصیحت ہو رہی ہے!
نہیں تنہائیِ زنداں تحمّل، — مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے
یہ تم ہنس ہنس کے باتیں کر رہے ہو — کہ تقسیمِ جراحت ہو رہی ہے
ابھی تک محشرِ انسانیت میں، — تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے
لبِ لعلیں پہ نظریں جم گئی ہیں — بڑی رنگیں عبادت ہو رہی ہے
بلا جب دل تو انساں یہ نہ سمجھا — کہ تفویضِ امانت ہو رہی ہے

اگر مشرب نہیں بدلا ہے سیماب

تو کیوں تجدیدِ بیعت ہو رہی ہے؟

تصویر ذہن میں نہیں تیرے جمال کی — آباد ہو کے لُٹ گئی دنیا خیال کی
دامن کشِ حواس ہے وحشت خیال کی — کتنی جنوں اثر ہے بہار اب کے سال کی!
میں مثلِ شمعِ صبح جلا اور بجھ گیا — لایا تھا عمر مانگ کے شامِ وصال کی
یوں طور کو جلا دیا برقِ جمال نے — پتھر میں رہ نہ جائے تجلّی جمال کی

پہلے خیال، خواب سے تھا طالب سکوں — اب خواب ڈھونڈتا ہے پناہیں خیال کی
موسیٰ کو لاؤ، طور پہ آجاؤ دیکھ لو — اب بھی ہیں کیسی ہی تجلی جمال کی
جلوت میں ہوں تو شانہ کی ہنگامہ ہجوم — خلوت میں ہوں تو ساتھ ہے دنیا خیال کی
طاری ہوئی جو تیرگیٔ حسرتِ کلیمؔ — بجلی نے آکے شمع جلا دی جمال کی
چھوڑ آئی لامکاں کو بھی پیچھے تری تلاش — اپنی حدود سے بڑھ گئی وسعت خیال کی

سیماب، یہ شباب، یہ ابر، اور یہ بہار
انگڑائیاں ہیں صرف نشاطِ خیال کی

ہم اُن کا جلوۂ برق انتساب دیکھیں گے — نظر کو مشرقِ صد آفتاب دیکھیں گے
وہ جب مری نظرِ انتخاب دیکھیں گے — تو ہر نظر میں شکستِ حجاب دیکھیں گے
بجا کہ آئیں گے دینے تسلیاں مجھ کو — غلط، کہ حوصلۂ اضطراب دیکھیں گے
تو آئینے نہ دکھا اپنی بزمِ عشرت کے — کہ ہم تو جلوۂ آئینہ تاب دیکھیں گے
کیا خراب تماشا ہماری نظروں نے — تری نگاہ سے تیرا شباب دیکھیں گے
مذاقِ عشق سے ہیں غم نصیب دل جن کے — وہ کس کے دل سے نشاطِ شباب دیکھیں گے
ہم آپ سیر ہی کر آئیں بزمِ محشر کی! — ابھی تو دیکھنے والے حساب دیکھیں گے
فلک کا دورِ مسلسل جواب دے اس کا — ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟
ہمیں مقاصدِ محشر سے کیا غرض ہم تو — مآلِ نشۂ حسن و شباب دیکھیں گے
طلسمِ جذبِ نظر ہیں معاقباتِ خیال — میں جب خیال کروں گا وہ خواب دیکھیں گے

خراب فردِ عمل ہو نہ جائے اے سیمابؔ
اے جنابِ رسالت مآب دیکھیں گے

اب وہاں دامن کشی کی فکر دامن گیر ہے — یہ مرے خوابِ محبت کی نئی تعبیر ہے
حشر میں نازو نیازِ رحمت و تقصیر ہے — میں ہوں دامن کش نگاہِ لطف دامنگیر ہے
شمع بھی پُرسوز ہے پروانہ بھی دلگیر ہے — تیری محفل کیا ہے، غم خانے کی اک تصویر ہے
زیست کی بے چارگی ممنونِ درماں ہو چکی — چارہ گر کے پاس مرنے کی بھی کچھ تدبیر ہے ؟
آشنائی اک ادا ہے جو کسی میں بھی نہیں — بے وفائی اک بلا ہے، اور عالمگیر ہے
دل میں رکھ کر بھی دعا اک حسرتِ وہم و خیال — دل سے نکلی کیوں، کہ اب شرمندۂ تاثیر ہے
کچھ تجھے معلوم ہے اے خوش نصیبِ حسن و عشق! — عہد میں تیرے کوئی آزردۂ تقدیر ہے
یہ فضا، یہ ابر، یہ ٹھنڈی ہوا، یہ سبزہ زار — آج تو جنگل کا جنگل قابلِ تصویر ہے
دفن ہو زنجیر بھی مدفن میں ہمراہِ اسیر — یہ ستم کیا ہے کہ زندانی نہیں زنجیر ہے
عمر بھر مجھ سے خطا ہو گی کہ میں انسان ہوں — فطرتِ عاصی مری پروردۂ تقصیر ہے
میں کوئی اپنے لئے تدبیر کر سکتا نہیں — کس قدر اندیشۂ رسوائیِ تقدیر ہے

یہ شرابِ عشق اے سیمابؔ ہے پینے کی چیز
تند بھی ہے بدمزہ بھی ہے، مگر اکسیر ہے!

مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی، — چھپ گئی تو عقبیٰ تھی، مل گئی تو دنیا تھی
کچھ عجب محبت میں کیفیتِ تماشا تھی، — اک نظر میں جلوہ تھا اک نظر میں دنیا تھی

دیدہ زیب تھی دنیا قابلِ تماشا تھی
دل اگر نہ مر جاتا، زندگی بُری کیا تھی!

شب بستانِ عالم میں شمع بن کے آیا تھا
مجھ کو صرف اتنی ہی فرصتِ تماشا تھی

سو طرحِ تخیّل کی کروٹیں بدلنی تھیں،
تھے فریب فطرت کے، دین تھا نہ دنیا تھی

اوّل اوّل اک موسیٰ مائلِ تماشا تھے
رفتہ رفتہ ہستی کی ہر اٹھان موسیٰ تھی

ہر شفق کی موجوں میں تھے غروبِ عالم
ہر سحر کے پردے میں اک جدید دنیا تھی

فطرتِ طلب معلوم، ہاں مگر یہ دیکھا ہے
جس نے چھوڑ دی دنیا، اُس کے ساتھ دنیا تھی

جادۂ توکل بھی اک عجیب جادہ تھا
میں جدھر بھی جاتا تھا ٹھوکروں میں دنیا تھی

تو ہوس میں دنیا کی زندگی مٹا بیٹھا
بھول ہو گئی غافل! زندگی ہی دنیا تھی

میں جیا بھی دنیا میں اور جان بھی دیدی
یہ نہ کھل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی؟

بھیک چھپ چھپا کر دی کیوں نہ اپنے جلووں کی؟
مانگنے کو موسیٰ تھے، دیکھنے کو دنیا تھی!

میں فریبِ صورت میں بے نیازِ معنیٰ تھا،
میری زندگی **سیماب** اک حسین دھوکا تھی

پرتو سے ہر نگاہ کو اک اضطراب ہے
بدلی کی دھوپ، جلوۂ زیرِ نقاب ہے

جس کو غرورِ ضبط ہے وہ بھی خراب ہے
کتنی تری ادائے ستم کامیاب ہے!

یہ پردہ داریاں یہ، ہجومِ تجلّیات!
با ایں ہمہ نگاہ مری کامیاب ہے

اپنے کفن کے رنگ کا منت گذار ہوں
شامِ لحد نہیں ہے، شبِ ماہتاب ہے

اِس حسن سے میں حشر میں فریاد کش ہوا
سمجھا ہر اک حسیں، کہ مجھی سے خطاب ہے!

کنعاں کی برقِ حسن تڑپتی ہے مصر میں، کتنا وسیع سلسلۂ اضطراب ہے
کرتے ہیں لوگ یاد جسے نامِ عیش سے بھولا ہوا سا میری جوانی کا خواب ہے
دیکھے تو حسن و عشق کی خوش ربطیاں کوئی یوسف کا ہر خیال زلیخا کا خواب ہے
کیا چیز ہے ہماری نگاہِ جواں پرست کلیاں سمجھ گئیں کہ یہیں پر شباب ہے

سیماب لفظ لفظ اُترتا ہے عرش سے
میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

بہار تیرے لئے وقفِ آرزو ہو جائے وہ پھول بن کہ گلستاں میں تو ہی تو ہو جائے
جسے ہو اصلِ حقیقت بہار کی معلوم وہ کیوں چمن میں پریشانِ رنگ و بو ہو جائے
مجھے تو ناز ہے اپنی گناہگاری پر تری نگاہِ کرم کیوں بہانہ جو ہو جائے
اسیرِ ضبط رہے کیا وہ مدعا میرا جو دل میں چھپ کے بھی رسوائے آرزو ہو جائے
نہیں ہے جس کا پتہ ماورائے امکاں تک خدا کرے وہ ہم آغوشِ جستجو ہو جائے
نشاطِ حسن ہو، جوشِ وفا ہو، یا غمِ عشق ہمارے دل میں جو آئے وہ آرزو ہو جائے
یہ ہے کرشمۂ الفت، یہ ہے تصرفِ جذب کہ میں فغاں نہ کروں بے قرار تو ہو جائے
عبادت اُس کی، نماز اُس کی ہے، نیاز اُس کا، جو اپنے خون سے آمادۂ وضو ہو جائے
نویدِ وصل اُسے کیا جو اُن سے ملتے ہی ہلاکِ شوخئ اندازِ گفتگو ہو جائے
پھر اُس کے دفترِ جذبات کا خدا حافظ! جو لب ہلائے گنہگار گفتگو ہو جائے
نظامِ حشر کی فہرست ہی بدل جائے مزہ تو آئے جو محشر فریب تو ہو جائے

ہے اک فسانۂ حسرت، مآل اُس دل کا، | جو پہلے پھول بنے اور پھر لہو ہو جائے

چھپائیں اُس نے جو اپنی حقیقتیں سیماب
یہ مدعا تھا کہ محو مجاز تو ہو جائے

اللہ اللہ پردہ داری کا بھی کیا دستور ہے | بے تعلقی بھی حجاب جلوۂ مستور ہے
جلوہ گر ہو، میری ہستی میں مذاقِ طور ہے | آ، پھر اپنا خاک ہو جانا مجھے منظور ہے
زندگی کی آرزو کیا، شوق سے معمور ہے | پائوں کی آہٹ بھی مدفن میں صدائے صور ہے
سب میں ہے تیری تجلی شمع کیا پروانہ کیا | تو نہ ہو تو انجمن کی انجمن بے نور ہے
دل ہے پہلو میں مگر آساں نہیں عرفانِ دل | دور ہے بیشک تجلی گاہ تیری دور ہے!
ان کے جلووں کے لئے نظروں میں وسعت چاہیئے | آنکھ ہو تو صبح کا تارا چراغِ طور ہے
سُننے والے سیکڑوں ہیں، ہمنوا کوئی نہیں | نغمۂ زنجیر پیغامِ لبِ منصور ہے
تیرا جلوہ میرا جلوہ، جو ہے تو میں ہوں وہی | پردہ اتنا ہے کہ میں ظاہر ہوں تو مستور ہے

اور اے سیماب اُس سے شکوۂ غم کیجئے
کہہ دیا اُس نے، محبت کا یہی دستور ہے

نہیں بنتی دلِ تنہا نشیں سے | کسی کو بھیج دے یارب کہیں سے
کوئی دیکھے مری وحشت سوالی | انہیں کو مانگتا ہوں میں انہیں سے
حسینوں میں وفا کیوں کی نہ پیدا | شکایت ہے مجھے حسن آفریں سے
کسی نے حال کچھ اس طرح پوچھا | دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے

یہ مایوسی کا تیرِ آخری ہے بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے
عنایت ہو جو سی دے بخیہ گر تو مرا دامن کسی کی آستیں سے

وفورِ اشک ہوا اتنا تو سیماب
کہ بہہ نکلیں ٹپک کر آستیں سے

وسعتیں محدود ہیں ادراکِ انساں کے لئے ورنہ ہر ذرہ ہے دنیا چشمِ عرفاں کے لئے
اے خزاں تو شوق سے سارا چمن برباد کر چند پھانسیں چھوڑ جا میری رگِ جاں کے لئے
دور پہونچیں شہرتیں رفتارِ سحر آثار کی کھل گئے رستے ترے حسنِ خراماں کے لئے
خوابِ ہستی میں نظر آئی نہ تعبیرِ نشاط رو دئے ساری رات اک صبحِ درخشاں کے لئے
پھول گلشن کے نہیں تو خاکِ صحرا ہی سہی کچھ نہ کچھ تو چاہئے تزئینِ داماں کے لئے
دشمنِ کیفیتِ آغاز ہے کیفِ مآل ہر خوشی پیمانۂ عبرت ہے انساں کے لئے
اس لئے دیتا ہوں تم کو دل کہ لو اور بھول جاؤ میں نے اک تصویر دی ہے طاقِ نسیاں کے لئے
چارہ فرما، اُن کی شرمیلی نظر سے مانگ کر زندگی لا دے مرے حالِ پریشاں کے لئے
آنکھ کھلتے ہی نظر آیا جہاں ہنگامہ زار نیند اچھی تھی اسی خوابِ پریشاں کے لئے
نعمتِ بے عشق تو اک جادۂ بے شمع ہے عشق رکنِ خاص ہے تکمیلِ ایماں کے لئے
میرے اجزائے پریشاں میرے آثارِ لطیف کچھ گلستاں کے لئے ہیں کچھ بیاباں کے لئے
تو نے سب رشتے وفا کے کر دئے تقسیمِ بزم کیوں نگاہِ ناز اور میرے گریباں کے لئے!
زندگی دریائے بے ساحل ہے اور کشتی خراب میں تو گھبرا کر دعا کرتا ہوں طوفاں کے لئے!

دھجیاں اُڑنے کو اے سیماب وسعت چاہئے
ہے کوئی میدان، آشوبِ گریباں کے لئے؟!

سنہرا دُپہ فطرت کا، پھر آئینہ خانہ ہے — تقدیر کے گیسو ہیں، تدبیر کا شانہ ہے
یہ دَورِ ترقی ہے، رفعت کا زمانہ ہے — ذروں کو اُٹھانا ہے، تاروں سے ملانا ہے
ایواں یہ بنانا ہے، وہ قصر سجانا ہے — جیسے ہیں دنیا میں پھر لوٹ کر آنا ہے
آغوشِ تصوّر ہے اور نقشِ جمیل اُن کا — دوری ہے نہ مجبوری، آنا ہے نہ جانا ہے
تقدیر کا ماتم بھی ہے سدِّ رہِ منزل — جیلے ہیں جہاں لاکھوں اک یہ بھی بہانا ہے
آوازِ درا باطل، فریادِ جرس ناقص، — اب محملِ خفتہ کو ٹھوکر سے جگانا ہے
فانوسِ خیالی ہے اصورت کدہ ہستی — کیا کیا نظر آیا ہے، کیا کیا نظر آنا ہے
نیرنگِ محبت ہے، ہر راز مرے دل کا — چُپ ہوں تو حقیقت ہے کہدوں تو فسانا ہے
پایانِ طلب کچھ ہو، لیکن مری ہمت نے — ہر قطرہ نچوڑا ہے ہر ذرّے کو چھانا ہے
ارمانِ تجلّی کا، کوتاہ بھی کر قصّہ، — اے دوست تجھے آخر اک دن نظر آنا ہے
ٹوٹا ہوا دل میرا، دیکھے تو کوئی آ کر، — صد پارۂ و صد جلوہ، کیا آئینہ خانا ہے
ہستی کے اندھیروں میں کھو آئے جو کھونا تھا — پھر چاندنی راتیں ہیں کچھ ڈھونڈ کے لانا ہے

کیا شعبدہ ساماں ہے سیماب زمانہ بھی
ہر شخص سمجھتا ہے میرا ہی زمانہ ہے

کارگر ہم اپنے اجزائے فغاں دیکھا کئے — منتشر شیرازۂ ہفت آسماں دیکھا کئے

ہم انہیں دیکھا کئے اور بے تکان دیکھا کئے
وہ تماشائے نگاہِ ناتواں دیکھا کئے

کوئی کیفیت پنہاں کا نہ تھا نظارگی
سب جنونِ عشق کی عریانیاں دیکھا کئے

میرے دامن دار زخموں کی تراوش دیکھئے
آپ اپنی آستینِ خونچکاں دیکھا کئے

دیکھنے کی چیز تھا سرمایۂ عمرِ فراق
ایک ناکامی مآلِ صد فغاں دیکھا کئے

طور کو جس کی تڑپ نے شعلہ پیکر کر دیا
ہم وہی بجلی قریبِ آشیاں دیکھا کئے

مٹنے والوں کا ہیولہ پھر نہ قائم ہو سکا
ایک اک ذرہ کو صد نو آسماں دیکھا کئے

ننگ بن کر راز دل کھلتا رہا اڑتا رہا
میری صورت انجمن میں رازداں دیکھا کئے

کب بصیرت نے ہمیں گلگشت کی تکلیف دی
چند کلیوں میں مکمل گلستاں دیکھا کئے

اپنی محفل کا نظامِ جبر اُن کے دل سے پوچھ،
جو تجھے با صد نگاہِ بدگماں دیکھا کئے

تھا کبھی ویراں کبھی دنیائے عشرت در کنار
ایک دل کو صد بہار و صد خزاں دیکھا کئے

عالمِ تصویر میں سو سو کے تو اٹھتا رہا
ہم تصور میں تری انگڑائیاں دیکھا کئے

میری ساری عمر میں کچھ واقعات ایسے بھی تھے
جن کو دل والے بنا کر داستاں دیکھا کئے

کون جانے آسماں سے اُن کو کیا امید تھی،
مرتے مرتے بھی جو سوئے آسماں دیکھا کئے!

جنتِ کشمیر میں سیماب آنکھیں کھل گئیں
دیر تک مستی میں بھیگی وادیاں دیکھا کئے

جو وقتِ نزع کو، وقتِ ورائے کارواں سمجھے
بتا اے نامرادی، اپنی منزل وہ کہاں سمجھے؟

نہ وہ فریاد کا مطلب، نہ منشائے فغاں سمجھے
ہم آج اپنی شبِ غم کی غلط سامانیاں سمجھے

بڑی مشکل سے اُن کا رازِ اُلفت ہو سکا پنہاں
بڑی مدت میں جا کر ہم مزاجِ رازداں سمجھے

گراں آغوش کیوں ہو موت انبارِ تمنا سے
یہیں پر پھینک دے مجھ کو اگر بارِ گراں سمجھے

حکایت قصّہ خواں نے کل کچھ اس انداز سے کہہ دی
میں اُن کی داستاں سمجھا، وہ میری داستاں سمجھے

وہ مجبورِ قفس، قانع نہ ہو کیوں حال پر اپنے
جو اپنی سی تباہی آشیاں در آشیاں سمجھے

اب آیا ہے تو بیٹھے چارہ گر خاموش بالیں پر،
مری بے چینیاں دیکھے مری بے تابیاں سمجھے

نہ پوچھ اُس پاکبازِ آرزو کا مطمحِ اُلفت
جو پیمانِ وفا میں بھی خدا کو درمیاں سمجھے

پیامِ شادمانی کیا سمجھ کر دے کوئی اُس کو
جو تیرے غم کو تکمیلِ نشاطِ دو جہاں سمجھے

نہیں ملتا اگر اب آشیاں اے خانہ ویرانی

تو ایسا ذہن لا دے جو قفس کو آشیاں سمجھے

سمجھے اُس وفا آموزِ حسن و عشق کا حاصل
کٹے جائے جو نالے اور اُن کو رائیگاں سمجھے

کمالِ حسن نے نظّارے کو بہکا دیا آخر
وہ ہی جلوے تھے اُن کے ہم جنھیں حیرانیاں سمجھے

تو کیا اے موت، رازِ آخری ہے زیست کا یہ بھی؟
کہ میں افتادِ اپنی خود نہ سمجھوں، نوحہ خواں سمجھے

میں اس دنیا میں اے سیمابؔ اک رازِ حقیقت تھا
سمجھنے کی طرح اہلِ جہاں مجھ کو کہاں سمجھے

ہم اک دن جلتے جلتے خاکستر ہو جائینگے
دیکھیں وہ خاکستر میں کیونکر آگ لگائینگے؟

غم کے ناکام افسانے بس اتنی کام آئینگے
میں کہہ کر پچھتاؤنگا وہ سُن کر شرمائینگے

جو تِس طلب ہے۔ غیرت کیا۔ ہم تو مانگے جائینگے
کچھ تو اُنھیں شرم آئیگی جب دامن پھیلائینگے

ہم کو یارانِ محفل، شمعِ سرِ محفل سمجھیں
شب بھر جل کر کاٹیں گے صبح ہوئی بجھ جائینگے

بادل تھے، گلشن تھے، جھولے تھے، پیمانے تھے،
پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئینگے؟

آپ نے حکمِ عام دیا کوئی ہمارا نام نہ لے
اب ہم دیوانے دل کو کیا کہہ کر بہلائینگے؟

دیدے اُن کی مطلب ہے، گھر دہ سہی محشر ہی سہی
ہم دانستہ دیکھیں گے وہ مجبوراً آئینگے

خیر وہ ہم موسیٰ نہ سہی آپ بھی برقِ طور نہیں!
جس دن آنکھیں چار ہوئیں دیکھ خود اُٹھ جائینگے

تجھ سے ہم سے رشتہ ہے دونوں عالم جان گئے　　دنیا ہو یا عقبیٰ ہو تیرے ہی کہلائینگے

قدر گذاری کا سیماب وہ محفل میں اذن تو دیں
ہم بھی اپنی آنکھوں میں کچھ آنسو بھر لائینگے

اگر بیزارِ پردہ طلعتِ جاناں نہ ہو جائے　　خرابِ جلوہ ہو کر آدمی دیوانہ ہو جائے

بہت آسان ہے دنیا کو بیگانہ بنا لینا　　ہم اپنا دل جسے دیدیں وہی بیگانہ ہو جائے

ہجومِ یاس و غم، اور یہ اندھیری رات، یہ بادل!　　کوئی بجلی کا شعلہ ہی چراغِ خانہ ہو جائے

مری دیوانگی پر طعنۂ احباب مہمل ہے　　ہو جس کو ہوشِ رسوائی وہ کیوں دیوانہ ہو جائے!

ادب سے اے حریفِ طورِ موسیٰ عرضِ حسرت کر　　کہیں ایسا نہ ہو انداز گستاخانہ ہو جائے

"نمودِ صبح" "ہو یا" "شامِ صحرا" مصلحت یہ ہے　　جو آئے میرے ویرانے میں وہ دیوانہ ہو جائے

ابھی سجدہ فروشانِ حرم کا رخ بدلتا ہے　　کسی پہلو سے کعبے کی طرف بتخانہ ہو جائے

زمیں کیونکر اٹھا لے بارِ تنہا شمعِ سوزاں کا　　اگر محفل میں کم خاکسترِ پروانہ ہو جائے

وہ نظریں منفعل ہوں سنتے سنتے داستاں دل کی　　اسی حیلے سے شاید مختصر افسانہ ہو جائے

حسیں خود بیں سہی کیا عشق خودداری سے خالی ہے　　ذرا سی چھیڑ میں کیوں آدمی دیوانہ ہو جائے

میں پروانہ ہوں اس تخئیل کی روشن سوادی کا　　کہ جو تاریک رہ کر بھی چراغِ خانہ ہو جائے

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی　　کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

چلو ہم دے کے اپنی جان تکمیلِ جفا کر لیں
مکمل آج تو سیماب یہ افسانہ ہو جائے

[illegible]

چمک جگنو کی، برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سحر تک سعیِ نالہ رائیگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بقدرِ یک فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کے دل میں گنجائش نہیں وہ بارِ ہستی ہوں
لحد کو بھی مری مٹی گراں معلوم ہوتی ہے

خزاں کے وقت بھی خاموش رہتی ہے فضا ساری
چمن کی پتی پتی رازداں معلوم ہوتی ہے

وہ کثرت ہے تلاطم کی کہ اب جو کچھ ہے دریا ہے
مری کشتی بھی اک موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سامنے کو مدتیں گذریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

یہ گردش ہے کہ جب منزل پہ پہنچ کر گم ہوئی منزل
مری قسمت شریکِ کارواں معلوم ہوتی ہے

شکستہ، سرخمیدہ، سوختہ، خاکستر آلودہ،
یہی تو میری شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے؟

ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے؟
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں **سیماب** مجھ کو قدر ہو ویرانیِ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

ناحق شکایتِ غمِ دنیا کرے کوئی،
غم ہے بڑی خوشی جو گوارا کرے کوئی

مشکل، کہ شرحِ اشکِ تمنا کرے کوئی
ممکن، کہ ایک قطرہ کو دریا کرے کوئی

ہر لمحے کی فنا میں ہے اک زندگی نہاں
کیوں آج ہی سے ماتمِ فردا کرے کوئی؟

رگ رگ میں دل کی جذب ہے اک محشرِ امید
اندازۂ ہجوم، تمنا کرے کوئی

جب ہے خیالِ عشرتِ دنیا فقط فریب
پھر کیوں خیالِ عشرتِ دنیا کرے کوئی؟

ایمن کا ذرّہ ذرّہ حریفِ کلیم ہے
مقصد یہ ہے کہ قصدِ تماشا کرے کوئی

ہے اُن کے آستاں پہ ہجومِ غرور و ناز
گنجائشِ جبیں ہو تو سجدا کرے کوئی

یوسفؑ غیور، فطرتِ یوسفؑ غیور تر!
کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی

جلووں کی اشتیاق نے عادت بگاڑ دی
ورنہ خود انتظارِ تماشا کرے کوئی

ہر شخص ہے خرابِ تمنا بقدرِ ذوق
سیماب کس سے عرضِ تمنا کرے کوئی؟

وہ حصّہ ہے مرا جو تیری آنکھوں سے برستی ہے
میں خود اک میکدہ ہوں، میری مستی میری مستی ہے

خودی کی حِس نہ ہو یہ عشرتِ بادہ پرستی ہے
ترا احساس تو سب سے بڑی توہینِ مستی ہے

جہانِ رنگ و بُو میں مستقل تخلیقِ مستی ہے
چمن میں رات بھر پیتی ہے۔ اور دن بھر برستی ہے

سکوتِ پُر بیاں ہے خامشی پہنائے فطرت کی
یہاں کا ذرّہ ذرّہ ترجمانِ رازِ ہستی ہے

نگاہِ عشق و چشمِ حسن، دو ساون کے بادل ہیں،

یہ جب ملتے ہیں، دل پر اک تجلی سی برستی ہے
یہ ہے کثرت پسندی اک جہاں کو دیکھتا ہوں میں
پرستار آپ کا ہوں، یہ مری وحدت پرستی ہے
اگر ہے زندگی منظور، بے سوچے فنا ہو جا
مذاقِ عاشقی میں نیستی کا نام ہستی ہے
تعیّن برطرف قبروں پہ یکساں فاتحہ پڑھیے
جواب بے نام زندہ ہیں یہ اُن لوگوں کی بستی ہے
نہ ہونا ہی مرا اک فلسفہ ہے تیرے ہونے کا
تری ہستی کہاں گر میری ہستی، میری ہستی ہے!
سُنا اک نغمہ ایسا گونج ہو جس کی قیامت تک
نہ جانے کل یہ کیا ہو جائے۔ ابتک سازِ ہستی ہے
حقیقت ہر قطرہ پہ چوم لیتی ہے مری آنکھیں
تعالی اللہ، کیا نعمت مری صورت پرستی ہے!
یکایک پھر چراغ امید کے ہونے لگے روشن
یہ صبحِ روزِ محشر ہے کہ شامِ صبحِ ہستی ہے؟
تعاں کی بجلیاں چمکا نہ یوں تاریک راتوں میں
بصیرت ہو تو آنکھوں پر تجلّی خود برستی ہے

خودی کو ترک کر کے مست ہو پھر با خدا ہو جا
حدیثِ بیخودی کا سب سے پہلا درس مستی ہے

بگ رو یوں ہوں مٹ کر جادۂ حسن و محبت میں
کہ میں آگے ہوں، کوسوں مجھ سے پیچھے میری ہستی ہے

وصالِ دوست ہے، تکمیلِ نقشِ بے خودی کر لے
سنبھل اے بے خبر اب اس سے آگے حدِ ہستی ہے!

خدا سے حکمِ تنسیخِ اجل مانگیں گے محشر میں،
مگر سیماب یہ تو قصۂ مابعدِ ہستی ہے!

دنیا کہ ایک شعبدۂ اعتبار ہے — خوابِ تعینات، سرابِ بہار ہے
اب اس سے بڑھ کے اور ہو کیا عشرتِ سکوں — جس نے دیا ہے غم۔ وہ مرا غمگسار ہے
دل ہے کہ اور کچھ مرے پہلو میں، کیا خبر — اتنا سمجھ رہا ہوں کوئی بے قرار ہے
لائے ادھر نسیم نویدِ بہار کیوں؟ — کس کو یہاں دماغِ نشاطِ بہار ہے
چمکا سوادِ گور پہ تارا جو بعدِ شام — میں نے سمجھ لیا کہ چراغِ مزار ہے
آزردۂ خزاں سے یہ کہدو کہ شامِ غم — دیباچۂ فسانۂ صبحِ بہار ہے
منزل نظر نہ آئے تو منزل کا کیا تصور — ہر کارواں کے منھ پہ نقابِ غبار ہے
اُف رعبِ بیکسی کہ قفس تک نہ سہہ سکا دل اٹھا — اس کو نہ چھیڑنا یہ اسیرِ بہار ہے
تڑپینگے اب نہ غم کی گوارائی کے لئے — اچھا یوں ہی سہی تمھیں ناگوار ہے

میں دیکھتا ہوں آپ کو حدِ نگاہ تک، لیکن مری نگاہ کا کیا اعتبار ہے!

سیمابؔ صوتِ نغمہ ہو، یا ہو نوائے غم
مقصود ایک نالۂ بے اختیار ہے

سُننے والا ہو تو دنیا مطلقاً الہام ہے
جسقدر ذرے ہیں سب کے لب پر اک پیغام ہے

شامِ فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے
جتنی صبحیں ہو چکی ہیں، آج سب کی شام ہے!

آپ کا جانا، فقط اک آپ کا جانا نہیں،
ختمِ مستی، رخصتِ بادہ، وداعِ جام ہے

شرحِ شرب کی کروں اپنے، مگر کس نام سے؟
میرا کیفِ بیخودی اک لذتِ بے نام ہے

کوئے جاناں دیکھ کر جنت سے یوں مایوس ہوں
پوچھتا پھرتا ہوں، کیا جنت اسی کا نام ہے

دیکھئے کیا ہو قفس میں صورتِ لیل و نہار
اب تو آزادی ہے، اپنی صبح، اپنی شام ہے

اس طرح دنیا ہے اک معمورۂ نازو نیاز
ذرے ذرے پر مرا سجدہ تمہارا نام ہے

اللہ اللہ یہ تغافل اور اس پر یہ غرور!
کیا مجھے ناکام کر دینا بھی کوئی کام ہے؟

وہ کوئی حیلہ نہ کر دیں، نیتِ وعدہ بخیر!
آج کچھ افسردہ افسردہ چراغِ شام ہے

ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا ماضی و حال
میری تجویزِ وفا ناکام تھی، ناکام ہے

دار کی توہین ہے خاموش ہونا بعدِ دار
وہ زباں کیوں بند ہو جس پر تمہارا نام ہے

سجدہ ناقص ہے جو باقی ہوش سجدہ کار ہے
ہو نہ محویت تو سودائے پرستش خام ہے

سانس رکتے ہی بھرے گھر میں قیامت آگئی
میں انہیں کس طرح سمجھاؤں مجھے آرام ہے

ہاں نہیں سیمابؔ مجھ کو اپنی ہستی پر غرور
جانتا ہوں میں، مری دنیا فنا انجام ہے

آپ نے بھی کہدیا سودائیِ محفل ہے مجھے
اب کہاں ہے ہمتِ عرضِ متاعِ دل مجھے

جب ازل میں دل ملا کونین کا حاصل ہے مجھے
شور برپا ہو گیا، اک دل مجھے اک دل مجھے!

پھر سجانی ہے دلِ برباد کی محفل ہے مجھے
اک تصور چاہیے تصویر کے قابل مجھے

دے نہ دھوکے اب طلسمِ جلوہ باطل ہے مجھے
دور پہونچا، دور لے پہونچا مذاقِ دل مجھے

ہے پہونچنا جلوہ گاہِ ناز تک مشکل ہے مجھے
ہر نظر ہے ایک جادہ ہر قدم منزل مجھے

تھی مشیت ہی خلافِ عشق، ورنہ خلقتاً
آسماں کو داغِ دل ملتا، مہِ کامل مجھے

نقشِ پروانہ جسے کہتے ہیں میرا دل نہ ہو
دیکھ لینے دو ذرا خاکسترِ محفل مجھے

رقص فرما ہیں، ہزاروں طور لاکھوں بجلیاں
کون لے آیا قریبِ جلوہ گاہِ دل مجھے؟

تو خدا پر چھوڑ دے کشتی تو خود اے ناخدا
آئے لینے کے لئے طوفان تک ساحل مجھے

ہوش کی دنیا جہانِ خواب بن کر رہ گئی
اک نظر مستی ہوئی سی کر گئی غافل مجھے

بے خودی کچھ دے گئی ہے اُن کی جلووں کا پتہ
آج خلوت میں اٹھانا ہے نقابِ دل مجھے

پہلے وحشت دی مجھے، پھر اسکی رحمت دیکھئے
عمر بھر کو دیدیا زندانِ آب و گل مجھے

پھر تری محفل میں دورِ جام مجھ تک آئے گا
ہے ابھی تو اعتبارِ گردشِ محفل مجھے

اضطرابِ دل سے اے سیماب کیوں گھبراؤں میں؟
کچھ سمجھ کر ہی دیا ہے اضطرابِ دل مجھے

دل ہے، تو کسی کا اسے کاشانہ بنادے
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنادے

ہستی کو مری مستیِ پیمانہ بنادے
اے بے خبری حاصلِ میخانہ بنادے

طالب ہوں میں اُس ایک نگاہِ دوا اثر کا — جو ہوش میں لا کر مجھے دیوانہ بنادے
اے برہمن اکدن بتِ پندار کو اپنے — توڑ، اور چراغِ درِ بُت خانہ بنادے
رسوا ہو دمِ صبح نہ رازِ شبِ محفل — اے کاش کوئی تربتِ پروانہ بنادے
کہہ دو کہ بہار آئے تو بیکار نہ بیٹھے — دیوانہ بنے یا مجھے دیوانہ بنادے
خاکسترِ پروانہ میں جو سوز نہاں ہے — جب چاہے پھر اس خاک سے پروانہ بنادے
ٹکڑے جو بچیں بت کے تو اے نفس پھینک نہ بُت گر — دو چار چراغِ درِ بت خانہ بنادے
"کُن" مختصر کوئین ہے، "دل" دفترِ دارین — وہ چاہے تو دو حرف سے افسانہ بنادے
وہ مستیٔ پندار شکن مانگ رہا ہوں — جو قابلِ یک سجدہ میخانہ بنادے
اے شمع یہ پروانے کو ہنس ہنس کے جلانا! — کیا ہو جو تجھے بھی کوئی پروانہ بنادے؟
دل ظرف طلب، خونِ جگر مائلِ مستی، — میں بادہ بناتا ہوں تو پیمانہ بنادے

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے **سیماب**
یہ اُس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنادے

مدتیں گذری ہیں ساقی دعوتِ سینا کئے — جنمیں تجلی بھر کے رکھدی تھی وہ شیشے کیا کئے؟
حسن نے توہینِ مفہومِ وفا کیا کیا نہ کی — سیکڑوں معنی غلط، اک نقطے کے پیدا کئے
زندگی شاید اسی بیچارگی کا نام ہے! — سرنگوں بیٹھے ہیں اپنے دل کو بیگانہ کئے
سر بسجدہ عشق، صد نالہ بہ لب پھرتا رہا — حسن کافر مطمئن بیٹھا رہا پردا کئے
طور، اے خاکسترِ سوزِ دلِ موسیٰ بتا! — جو دیے تھے برقِ ایمن نے وہ جلوے کیا کئے؟

کرگئی سرخوشِ شرابِ یک نگاہِ مستِ حسن، تھا ذرا سا نشّہ، لیکن عمر بھر جھوما کیے

آستانِ حسن اے سیماب آخر تھا نہ عرش!
عشق نے توہین کی فطرت کی، سجدے کیا کیے!

جرس ہے کاروانِ اہلِ عالم میں فغاں میری جگا دیتی ہے دنیا کو صدائے "الاماں" میری

مکاں ہے لامکاں میرا، بساطِ دو جہاں میری ہیولیٰ ہے یہاں میرا، حقیقت ہے وہاں میری

تو جس پہلو سے چاہے مجھ سے سن لے داستاں میری تری آواز کی محکوم ہے، آخر زباں میری

جہاں میں قابلِ تقلید تھی طرزِ فغاں میری پپیہے نے بالآخر یاد کر لی "پی کہاں" میری

نہ فرماؤ، نہیں ہے آدمی میں تابِ نظارہ سنبھل جاؤ، اب اٹھتی ہے نگاہِ ناتواں میری

مری ترکیب میں اجزائے رزم و بزم شامل ہیں کہیں کچھ ہوں کہیں کچھ ہوں یہ ہیں نیرنگیاں میری

تصوّر میں وہ کچھ برہم سے ہیں کچھ مہرباں سے ہیں انھیں شاید سنائی جا رہی ہے داستاں میری

چلا ہوں، ہیئتِ ہستی بدل کر بہرِ نظارہ تماشا ہو، جو یہ کوشش بھی جائے رائگاں میری!

گل و لالہ کی اجزا سے میرے تخلیق ہوتی ہے میں ایسا ہوں، کہ مٹی بھی نہیں ہے رائگاں میری

ہر اک پتھر یہاں ہے برہمن، اک دل ہے عارف کا بہت تیرے صنم خانے میں گونجی ہے اذاں میری

ہر اک ذرّہ ہے صحرا، اور ہر صحرا ہے اک دنیا مگر اس وسعتِ عالم میں گنجائش کہاں میری!

مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں جنھیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری

مسلسل تھا، فریبِ خوابگاہِ عالمِ فانی کہ میں سوتا رہا چلتی رہی عمرِ رواں میری

وہی لمحہ ورودِ ناگہاں کا ان کے ہو شاید جتا کر آئے جب بھی آئے مرگِ ناگہاں میری

پھر اسکے بعد میرے منہ سے جانے کیا نکل جائے؟ جب اُن کا نام لوں میں قطع کر لینا زباں میری

مذاقِ ہمزبانی کو نہ ترسوں باغِ جنت میں،
کوئی سیمابؔ حوروں کو سکھا دیتا زباں میری

شوق کے نغمے نہ تھے آوازِ سازِ دل نہ تھی جب نہ تھے محفل میں ہم، محفل تری محفل نہ تھی
کوئی دنیا کی کشش نیت فریبِ دل نہ تھی فطرتِ عالی مری پروردۂ باطل نہ تھی
تھی خدا پر اک نظر، اور ناخدا پر اک نظر وہ بھی تھا کیا وقت جب کشتی سرِ ساحل نہ تھی
طعنِ ناکامی نہ دے، ناکامِ سعیٔ وصل کو یہ ہوس کی جنگ تھی، جنگِ حق و باطل نہ تھی
تا بہ منزل راستے میں منزلیں تھیں سیکڑوں ہر قدم پر ایک منزل تھی مگر منزل نہ تھی
مرحبا حسنِ نگارستانِ عالم، مرحبا! کون سی صورت تھی جو تصویر کے قابل نہ تھی
تھی بنائے گلستاں میرے نشیمن کے لئے جل گئی وہ شاخ آخر جو مرے قابل نہ تھی
پہلوئے انساں میں دل رکھا کہ محشر رکھ دیا اور کوئی چیز کیا موزوں بجائے دل نہ تھی؟
خلقتاً وہ غیر تھے، اور نسبتاً جزوِ حیات ایک حدِ فاصل تھی لیکن ایک حدِ فاصل نہ تھی
پھر میں آیا ہوں ترے پاس اے امیرِ کارواں چھوڑ آیا تھا جہاں تو وہ مری منزل نہ تھی
میں ہی چوکا، میں ہی بھولا، میں ہی بھٹکا ہمنشیں سچ کہا تو نے کہ شرحِ آرزو مشکل نہ تھی

یا نہ تھی سیمابؔ دنیا فطرتاً ہستی شناس
یا مری ہستی ہی دنیا میں کسی قابل نہ تھی

کوئی کیا منصبِ موسیٰ کا ہے امیدوار اب بھی سوادِ طور پر ہے جلوۂ برق و شرار اب بھی

فسردہ دل سہی، دل پر نہیں ہے اختیار اب بھی　　بنا کرتا ہوں وحشی حسبِ منشائے بہار اب بھی

ازل میں تھا میں تیرا منتظر، ہے انتظار اب بھی　　مذاقِ عشق ہے پابندِ جبر و اختیار اب بھی

غمِ ہستی سے پژمردہ ہوں، تو اس پر نہ جا گلچیں　　مرا اک قطرۂ خوں ہے حاصلِ صد لالہ زار اب بھی

نہیں دار و رسن ہی میں وہ اب پہلی سی گیرائی　　انا الحق کہنے والے ہیں بہت منصور دار اب بھی

نہیں ہے میرے ویرانے میں کوئی زندگی باقی،　　مگر ہوتا ہے رقصِ سایۂ ابرِ بہار اب بھی

مرے نالوں میں اک بے اختیاری ہو چکی پیدا　　انھیں اپنے تبسم پر نہیں ہے اختیار اب بھی

زمانہ ہو گیا، مہمانِ شورش گاہِ ہستی ہوں　　یہ ہنگامہ مری نازک طبیعت پر ہے بار اب بھی

مذاقِ سیرِ دل داغوں کے مٹنے سے نہیں مٹتا　　ہماری روح کرتی ہے طوافِ لالہ زار اب بھی

نگاہِ اعتبارِ دوست نے جس کو نکالا تھا،　　کھٹکتا ہے خیالوں میں وہ کانٹا بار بار اب بھی

نہ کر باور کہ فارغ ہوں غمِ الفت سے تربت میں　　ہے کوسوں دور میری منزلِ صبر و قرار اب بھی

توجہ لے مرا رنگِ تکلم سوچنے والے　　سناتی ہے مرے اشعارِ غم لوحِ مزار اب بھی

حیاتِ جاوداں سیمابؔ حاصل ہے محبت میں
مگر ہوں شکوہ سنجِ ہستیِ ناپائدار اب بھی

محو ہو کر بے نیازِ ماسوا ہو جائیے　　ان سے جب مل جائیے سب سے جدا ہو جائیے

خلوتِ غم کی خموشی میں فنا ہو جائیے　　یوں حیات افروزِ ناموسِ وفا ہو جائیے

منتہائے منزلِ جاناں ہے جب وارفتگی　　کیوں نہ آوارہ مثالِ نقشِ پا ہو جائیے

سازِ دل کا نغمۂ خاموش سنتا ہے اگر　　صورتِ پروانہ مطلق بے صدا ہو جائیے

شرطِ آزادی اسیری جب مسلّم ہو چکی
توڑیئے پھر کیوں قفس کو، کیوں رہا ہو جایئے

عالمِ اسباب میں پیدا کیا ہے خود مجھے
خود تقاضا ہے کہ بے برگ و نوا ہو جایئے

آپ کی آواز میں ہے دعوتِ منزل کا راز
کاروانِ شوق کی بانگِ درا ہو جایئے

ہے فریبِ رنگِ دنیا سے یہ تدبیرِ گریز،
سادگیہائے محبت میں فنا ہو جایئے

دیجئے اُن کو کنارِ آرزو پر اختیار
جب وہ ہوں آغوش میں بے دست و پا ہو جایئے

کیا تعجب ہے یہی ہو اُنکا وقتِ التفات
کیوں وفورِ یاس سے نالہ سرا ہو جایئے

ہم تو اپنی بے خودیِ شوق میں سرشار تھے
آپ سے کس نے کہا تھا خود نما ہو جایئے

اپنی صورت میں اگر جلوہ گری سے ہے حجاب
میری ہی تصویر میں صورت نما ہو جایئے

پردۂ منزل میں چھپ چھپ کر تبسّم کیجئے
پاشکستہ کارواں کا آسرا ہو جایئے

خود بخود سیماب ہیں اُن کی نگاہیں ملتفت
ہے یہ وقتِ خاص، مصروفِ دعا ہو جایئے

لگی دل کی بھڑک اُٹھی ہے داغِ کہنۂ دل سے
کوئی پروانوں کو آواز دے لے اُنکی محفل سے

جہاں میں ہوں فرشتے بھی پہنچ سکتے ہیں مشکل سے
مری منزل بہت آگے ہے آزادی کی منزل سے

کہاں وہ اور کہاں سینا، کہاں موسیٰ کہاں جلوہ!
کوئی پردہ اُٹھا ہوگا تجلّی خانۂ دل سے

حجابِ گل میں خوننابے چھلکتے دیکھ لیتا ہوں
سمجھ لیتا ہوں میں انجامِ محفل رنگِ محفل سے

مری کشتی سے طوفاں کھیلتا ہے کھیل لینے دو
ملوں گا خاکِ ساحل میں، بنا ہوں خاکِ ساحل سے

مذاقِ حسن و ذوقِ دید، سب اسبابِ تسکیں ہیں
مگر دل نے وہ شورش کی کہ میں گھبرا گیا دل سے

اُٹھوں، بیٹھا رہوں، کھو جاؤں، یا خاموش ہو جاؤں؟ — نہیں معلوم محفل مجھ سے ہے یا میں ہوں محفل سے؟
اُنھیں دل میں لقیں کر کے تصور بے تکلف ہے — یہ دیوانہ ابھی واقف نہیں آدابِ محفل سے
بغیرِ شمع، تربت پر کہاں امکانِ پروانہ — کوئی ذرہ اُڑا ہوگا مری خاکسترِ دل سے!
دل اک دولت سرا ہی بے نیازِ کاسۂ و دامن — جو چاہا سر جھکا کر لے لیا دروازۂ دل سے
یہ بعدِ سیرِ طوفاں، خشکیٔ نظارۂ ساحل! — اگر موج آ گئی تو پھر گذر جاؤں گا ساحل سے
بس اب اک دو قدم کی بات ہی وہ آ گئی منزل! — مسافر، اللہ اللہ، اسقدر مایوس منزل سے!
بتائے وسعتِ کون و مکاں اس کو کہاں رکھیں؟ — ذرا سا درد لیکر آئے ہیں ہم اُن کی محفل سے

مناسب ہی ہمیں ہمراہ لے لیں قافلے والے
کہ ہم واقف ہیں اے سیماب راہ و رسمِ منزل سے

سر میں سودائے جنوں، طوفان چشمِ تر میں ہے — اک تباہی دشت میں ہو اک تباہی گھر میں ہو
جوش، ساقی کی نگاہِ میکدہ پرور میں ہے — کون مہمانِ کرم بزمِ مے و ساغر میں ہو؟
شمع سے خالی ہو لیکن شمع کے پیکر میں ہے — آہ، وہ محفل جو پروانوں کی خاکستر میں ہو
کعبہ و دیر و کلیسا بھی کنشت و عرش بھی، — ساری دنیائے عقیدت تیرے سنگِ در میں ہو
موجِ آب و رنگ میں پنہاں ہو نقشِ لازوال — اک حقیقت آدمی تصویر کے پیکر میں ہو
ذرہ ذرہ ہو خرابِ نشۂ عرفانِ دوست — میں ہی کیا چکر میں ہو سارا جہاں چکر میں ہو
ہے یہاں تعمیر میں تخریب جس پہلو سے ہو، — خود شکستِ آذری پروردۂ آذر میں ہو
خوں رگوں میں دوڑتا ہو کوئی قاتل ہو نہ ہو — کچھ تو گیرائی حدیثِ گردن و خنجر میں ہو!

ہے بتدریج آفتِ عالم مذاقِ کافری　　ہائے پھر وہ بت، جو پوشیدہ ابھی پتھر میں ہے
قید و آزادی، مری پرواز کے دو کھیل ہیں　　اک قفس اس پر میں ہے اک آشیاں اس پر میں ہے
خاک کر دل کو پھر اس میں ڈھونڈ نورِ زندگی　　تیرا آئینہ ابھی اندیشۂ جوہر میں ہے
عشرتِ فردا کی ندرت کاریاں نکلیں فریب　　میرے ساغر سے جو چھلکی تھی وہی کوثر میں ہے
عاشقی بے ابتدا، بے انتہا جوشِ نیاز　　ایک سجدہ آستاں پر ایک سجدہ سر میں ہے
جیسے ہم ایمان و جان و دل کے مالک ہی نہ تھے!　　کس قدر غارت گری اک جلوۂ کافر میں ہے

دل ہو یا ہو روح، اے سیمابؔ ہستی یا عدم
سب اُسی کے گھر میں ہیں یہ موجودہ ہر گھر میں ہے

سرگشتۂ خرابِ بہار و خزاں رہے　　برسوں ہم آشیاں میں بھی، بے آشیاں رہے
سب چاہتے ہیں بزمِ جہاں میں نشاں رہے　　یہ ہو تو بے نشانیٔ عالم کہاں رہے؟
یوں شاید اُس کو فکرِ بہار و خزاں رہے　　کچھ روز آشیاں میں مرے باغباں رہے
منزل پہ کوئی ذرّہ تو اپنا پہونچ گیا　　تھی مصلحت کہ خاکِ رہِ کارواں رہے
کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر　　ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے
وہ کیا ہو آپ کے کرمِ بے سبب سے شاد　　جس کو توقعِ ستمِ ناگہاں رہے
واماندگی نے نقصِ طلب کو چھپا لیا　　اچھے رہے جو گردِ پسِ کارواں رہے
شبنم کے ہم مزاج تھے، سبزے کے ہم مذاق　　ہم کیوں دماغِ دشت و چمن پر گراں رہے؟
صرف اتنی بحث مسئلۂ گلستاں میں ہے　　جس کا ہو باغ کیوں نہ وہی باغباں رہے

مجبورِ توبہ، جب دلِ بے کیف تھا مرا،　　اُس وقت یہ بہار کے بادل کہاں رہے؟
اندازۂ خموشیٔ صبحِ بہار کر،　　جب روحِ آشیاں نہ رہے آشیاں رہے
فطرت ہو نالہ دوست، تو پھر اس کا کیا علاج　　ہم کاروان میں بھی جرسِ کارواں رہے
اب کیا نشاطِ سیرِ چراغانِ جُوئبار!　　اب میری چشمِ شوق میں آنسو کہاں رہے
یا رب مری طرف رہے کچھ دن ہوا کا رُخ　　جب آشیاں جلے تو قفس تک دھواں رہے

سیمابؔ ہے خرابۂ عالم جنوں اثر
رہنا ہو جس کو خاک بسر، وہ یہاں رہے

آنسوؤں میں حسن کی شمعیں فروزاں کیجئے　　آج ہر موجِ تصور میں چراغاں کیجئے
جمع، خاکِ دل کے ذراتِ پریشاں کیجئے　　پھر مرتب اک نیا سازِ غزل خواں کیجئے
دیجئے پھر عشقِ سادہ کو فریبِ التفات　　ق　　پھر نئے انداز سے تجدیدِ پیماں کیجئے
پھر تبسم سے مجھے وحشی بنانے آئیے　　پھر نظر سے بخیۂ چاکِ گریباں کیجئے
پھر تکلم سے مجھے بادہ عطا فرمائیے　　پھر مجھے مستی سے میخانہ بداماں کیجئے
خاطرِ افسردہ کو دیکر پھر اپنا اضطراب　　بے نیازِ شورشِ غمہائے دوراں کیجئے
آئیے میرے تصور میں ستاروں کی طرح　　پھر مری تاریک راتوں کو درخشاں کیجئے
پھر مرے ہمراہ چلئے میرے سائے کی طرح　　چھاؤں میں تاروں کی گلگشتِ گلستاں کیجئے
دیجئے نظروں کو گردش شوخیٔ رفتار سے　　+　　پھر مرے خوابِ تمنا کو خراماں کیجئے
اک سکوں گیا اور بھی کچھ نعمتیں مل جائینگی　　تا بہ امکاں سیرِ جلوہ زارِ امکاں کیجئے

حادثوں کی ایک دنیا ہے جہانِ رنگ و بو　　چھوڑیے گلشن، تماشائے بیاباں کیجیے!
جوشِ یک حسن تھا ہنگامِ شرطِ ضبطِ غم　　کس طرح اُس ہاتھ کو صرفِ گریباں کیجیے!

تا بکے سیماب یہ بیکاری و افسردگی
کام کے دن ہیں کوئی کارِ نمایاں کیجیے

ایک نازک سی نظر کو دل میں مہماں کیجیے　　درد کا ساماں بہ مقدارِ رگِ جاں کیجیے
ہے حقیقت میں یہی پردہ حجابِ جزو و کل،　　غور سے نظارۂ ترکیبِ انساں کیجیے
آخری دیوانۂ دشتِ جنوں میں ہی تو ہوں　　بند میرے بعد راہِ بابِ زنداں کیجیے
منزل اک شمعِ سرِ جادہ نظر آنے لگے　　تا بہ منزل اس قدر شمعیں فروزاں کیجیے
مل گئے دو ہاتھ آزادی کے ماتم کو تو کیا!　　پاؤں پیدا قابلِ زنجیرِ زنداں کیجیے
روح کو پہنچے حکایاتِ محبت کا ثواب　　نوحہ خواں کو میری تربت پر غزلخواں کیجیے
عشق اک سوزِ مکمل، حسن برقِ ناتمام،　　طور کو لا کر مرے سینے میں پنہاں کیجیے
غافل اس کی خود نمائی نے خدا سے کر دیا　　سب سے پہلے ناخدا کو نذرِ طوفاں کیجیے!
ایک عالم اور بھی ہے صد بیاباں صد چمن　　سرنگوں ہو کر کبھی سیرِ گریباں کیجیے!

فطرت اے سیماب، ہے روزِ ازل سے غم پسند
کیا علاجِ خاطرِ آزردہ ساماں کیجیے

آ، مرے غمکدے میں آ سازِ وفا لئے ہوئے　　اپنے لبوں میں نغمۂ رنج رُبا لئے ہوئے
حسن کی سرد مہریوں کا ہوں مزا لئے ہوئے　　دل ہے مرا اگر ہنوز سوزِ وفا لئے ہوئے

جی میں ہے چشم و لب کو پھر دعوتِ اشک و آہ دوں
مدتیں ہو گئیں مجھے نام ترا لئے ہوئے

مجھ کو مٹا کے حسن کیوں عشق سے بے نیاز ہو
ہے مری خاک قوتِ نشو و نما لئے ہوئے

ہو نہ ملول چارہ گر اب تو قریب ہے سحر
دیکھ وہ آ گئی قضا میری دوا لئے ہوئے

ذوقِ تلاشِ دوست کا لطف نہ پوچھ ہم نشیں
ایک سکونِ خاص ہے گردشِ پا لئے ہوئے

قہر میں اُن کے جوش ہے رحم بہانہ کوش ہے
ہم بھی کھڑے ہیں سامنے عذرِ خطا لئے ہوئے

جورِ سرائے حسن سے آج پھر آ رہا ہوں، میں،
دل کو لہو کئے ہوئے لب پہ دعا لئے ہوئے

دستِ امید و بیم میں یوں دلِ غم شناس ہے
جیسے ہو کارواں کوئی قبلہ نما لئے ہوئے

بارگہِ جمال میں، بیٹھا ہوا ہوں مطمئن
عہدِ وفا کئے ہوئے عہدِ وفا لئے ہوئے

پھونک بھی دو جلا بھی دو، آؤ ہمیں مٹا بھی دو
ہم تو ازل سے آئے ہیں ذوقِ فنا لئے ہوئے

حسن کا حسن سے ہوا آج مگر مقابلہ!
ہے جو نگاہِ مست دستِ کیف نما لئے ہوئے

دیکھنا وارثیؔ کہیں دل مرا گر پڑا نہ ہو،
موجِ چناب ہے یہ کیا آئینہ سا لئے ہوئے!

عشق میں بھی حسن کا انداز ہونا چاہیئے
رنگِ استغنا بقدرِ ناز ہونا چاہیئے

یوں طوافِ بارگاہِ ناز ہونا چاہیئے
آنکھ میں بھی پاؤں کا انداز ہونا چاہیئے

مدعی سرِ محبت بھی نہ تجھ سے چھپ سکا
تیرے دل میں تو جہانِ راز ہونا چاہیئے

جب نہیں میرا گذر، انجام کے ادراک تک
کیوں مجھے سرگشتۂ آغاز ہونا چاہیئے؟

خونِ دل سے برق بننے کا تقاضا ہے مجھے
کچھ مداوائے رگِ پرواز ہونا چاہیئے

آدمی جب راز ٹھہرا پردۂ تخلیق کا،
آدمی کو آشنائے راز ہونا چاہیئے

ہم نفس بندِ قفس کا توڑنا مشکل نہیں،
صرف احساسِ پرِ پرواز ہونا چاہیئے

دل وہ کیا، جس دل میں ویرانی کی گنجائش نہ ہو
سازِ میں ظرفِ شکستِ ساز ہونا چاہیئے

بے ہمی ہر دو عالم ہے حقیقت حسن کی
ذرّے ذرّے کو امینِ راز ہونا چاہیئے

لطفِ غم یہ ہے کہ دنیا کو خوشی معلوم ہو
سوز سے پیدا طرازِ ساز ہونا چاہیئے

ہو گراں پائے تظرِ تا نہ راہِ بزمِ دوست
مثلِ پروانہ سبک پرواز ہونا چاہیئے

کیف کم بھی، سوز و غم بھی، درد بھی تسکین بھی
سازِ میں سب کچھ ہو لیکن ساز ہونا چاہیئے

ہے حدیثِ زندگی سیمابؔ اشکِ وقتِ نزع
آج بالیں پر کوئی ہمراز ہونا چاہیئے

محوِ یکتائی حسنِ جاوداں ہو جایئے
آج اپنے عشق سے بھی بدگماں ہو جایئے

پھر مرے جذبات کی کلیوں کے بس سے لیجئے
پھر لبِ رنگیں سے دل میں گلفشاں ہو جایئے

ہر طرف سے برقِ جلوہ ہے تماشا آزما
اِن اُجالوں میں کہاں آخر نہاں ہو جایئے؟

تا کجا ہم انتشارِ گردِ راہِ کارواں
دو قدم بڑھ کر امیرِ کارواں ہو جایئے

رفعتوں کی ہیں فضاؤں میں بہت گنجائشیں
اک نئی انگڑائی لے کر آسماں ہو جایئے

آستانِ دوست پر اک نقش بن کر بیٹھیے
کون کہتا ہے کہ خاکِ آستاں ہو جایئے

زندگی اور موت، دو آویزشیں ہیں عارضی
ہر تعیّن سے گذر کر، جاوداں ہو جایئے؟

کیجئے اقدام کوئے دوست، مٹ کر ہی سہی
رہگذارِ شوق میں کیوں رائیگاں ہو جایئے

دل اگر سیماب واقف ہے مزاجِ حسن سے
کیوں ذرا سی بات کہہ کر سرگراں ہو جائیے

اور اک خود آشنا نہیں ہے ۔۔۔ ورنہ انساں میں کیا نہیں ہے
کیا ڈھونڈنے جاؤں میں کسی کو ۔۔۔ اپنا مجھے خود پتا نہیں ہے
دل اور خراب صد تباہی ۔۔۔ یہ آپ کے کام کا نہیں ہے
اس طرح مجھے ستا رہے ہو ۔۔۔ جیسے میرا خدا نہیں ہے
اللہ رے تسلسلِ مساوات ۔۔۔ اب غم میں بھی کچھ مزا نہیں ہے
کیوں جامِ شرابِ ناب مانگوں ۔۔۔ ساقی کی نظر میں کیا نہیں ہے
حسن اور نوازشِ محبت! ۔۔۔ ایسا تو کبھی ہوا نہیں ہے
اس دل پہ نثار دونوں عالم، ۔۔۔ جس میں کوئی مدعا نہیں ہے

سیماب چمن میں جوشِ گل سے
گنجائشِ نقشِ پا نہیں ہے

آئیے بزمِ وفا کے ساز و ساماں دیکھیے ۔۔۔ شمع کی لَو پر پتنگوں کو غزلخواں دیکھیے
ہے یہ انجامِ شکستِ عہد و پیماں دیکھیے ۔۔۔ اپنا دامن دیکھ کر، میرا گریباں دیکھیے
کس قدر معصوم تھا ہستی کا عنواں دیکھیے ۔۔۔ سب سے پہلا صفحۂ تاریخِ انساں دیکھیے
یہ سمجھئے ہو کوئی دیوانہ دنیا میں اداس ۔۔۔ بے سبب جب بزمِ عالم کو پریشاں دیکھیے
خاک پر بیٹھا ہوا ہوں، عرش و کرسی زیرِ نگاہ ۔۔۔ میری بے سامانیوں کی سازو ساماں دیکھیے

ایک انگڑائی جو لی دشت و جبل تھرّا گئے
پردے پردے میں مذاقِ حسنِ پنہاں دیکھئے

غرق ہو کر ہر تعیّن سے میں باہر آگیا،
ایک لمحے میں نہ ساحل ہے، نہ طوفاں دیکھئے

خونچکاں سر ہیں بجائے لالہ و گل ہر طرف
دیکھئے فصلِ بہارِ بزمِ امکاں دیکھئے

سُست ہے تکبیر اور ناقوس سرمہ در گلو
کون ہو اب میری منزل کا حدی خواں دیکھئے

چاہتا ہوں جذب ہو جاؤں جمالِ دوست میں
کم نگاہی پر مرا ذوقِ فراواں دیکھئے

پھول جب میں نے چنے، کانٹوں پہ سر رکھنا پڑا
کیا ہوا انجامِ بہارِ گل بداماں دیکھئے

انقلاب آنے کو ہے کوئی، یقیں فرمائیے
جب مجھے آزردہ دل، افسردہ ساماں دیکھئے

اضطرابِ ساز ہے، نغموں کی الجھن کا سبب
کیجئے اک نالہ جب دل کو پریشاں دیکھئے

دیکھئے جوشِ جنوں کو دعوتِ دامانِ حسن
موسمِ گل آگیا بے جیبِ گریباں دیکھئے

پھر تصوّر میں مرے زلفیں بکھیرے آئیے
پھر مجھے اپنے تصور میں پریشاں دیکھئے

کیا پتہ اپنا دیا ہے اس معمّے کے نثار!
جان دیکھی ہو تو نزدیکِ رگِ جاں دیکھئے

یاد ہو تو ایک ترکیبِ تماشا یہ بھی ہے
جلوہ خود بن جائیے جب دل کو ویراں دیکھئے

شامِ ہستی ہو چکی سیمابؔ، اب کیا فروغ،
صبح ہونے تک یونہی خوابِ پریشاں دیکھئے

منزل خود آئے دعوتِ منزل لئے ہوئے
اُٹھّے تو کوئی جذبۂ کامل لئے ہوئے

میں خود ہوں بارِ دوریِ منزل لئے ہوئے
نازک سا ایک پردۂ حائل لئے ہوئے

ڈھونڈا کیا ہوں جلوہ گہِ دوست عمر بھر،
پہلو میں اپنے جلوہ گہِ دل لئے ہوئے

میں مشرقِ جمال تک آخر پہونچ گیا — دشت و چمن سے سلسلۂ دل لئے ہوئے

ہے عالمِ مجاز، فریبِ نظر ہنوز — ہر آئینے میں جلوۂ باطل لئے ہوئے

پھر آرہا ہے کوئی تصور میں بار بار — ق — خلوت کدے میں عشرتِ محفل لئے ہوئے

پنہاں ہر اک نگاہ میں، اک موجۂ بہار — ہر سانس میں نوائے عنادل لئے ہوئے

ڈالے ہوئے ہر اک خمِ گیسو میں اک گرہ — ہر ہر گرہ میں عقدۂ مشکل لئے ہوئے

مینا فروز آنکھوں میں لب ہائے سادہ میں — تارے بھرے ہوئے مہِ کامل لئے ہوئے

اک قشقۂ جمیل، جبینِ کشادہ میں، — کعبے کا اور دیر کا حاصل لئے ہوئے

گردن میں ہار، دستۂ گل دستِ ناز میں — یعنی پیامِ طوق و سلاسل لئے ہوئے

اک بانکپن فسردہ جگر کے محاذ میں — اک تیر بالمقابلۂ دل لئے ہوئے

وہ اور اس کے ساتھ یہ بیداریٔ جمال، + میں اور ایک دیدۂ غافل لئے ہوئے

بیٹھا ہوں انتظار میں، پیغامِ صبح کے — منزل کے پاس حسرتِ منزل لئے ہوئے

آتا ہے دلنواز سرِ رہگزار کون ؟ — ہر ذرۂ خراب ہی اک دل لئے ہوئے

پیدا ہوا ہوں عالمِ رسوائے دہر میں — اک ظرف، رازِ حسن کے قابل لئے ہوئے

برسوں جہانِ حسن کی رنگیں بساط پر — جھوما کیا ہوں میکدۂ دل لئے ہوئے

اٹھا ہوں صبحِ حشر ترے انتظار میں — اچٹی سی ایک نیند بمشکل لئے ہوئے

چھیڑا اے نگاہِ ناز کہ مدت گذر گئی! — چمکی کوئی قریبِ رگِ دل لئے ہوئے

یہ امتیازِ ساحل و دریا مٹائیے — طوفاں میں ڈوب جائیے ساحل لئے ہوئے

پروانے خاک ہو چکے، دل سرد ہو چکے　　بیٹھے رہو لٹی ہوئی محفل لئے ہوئے

سیماب میرے بعد کہاں سوز و سازِ عشق
میں جا رہا ہوں گرمیٔ محفل لئے ہوئے

ختم اس طرح نزاعِ حق و باطل ہو جائے　　اک طرف دونوں جہاں ایک طرف دل ہو جائے
حسن حیرت نہ بنے آئینہ دل ہو جائے　　حاصلِ جلوہ نہیں، جلوہ حاصل ہو جائے
اس کے نیرنگِ تجلّی کو کوئی کیا سمجھے　　جو کہیں چشمِ تماشا، کہیں محفل ہو جائے
دل میں وہ شورشِ جذبات وہ گرمی نہ رہی　　اب یہ شاید نگہِ دوست کے قابل ہو جائے
میری ہستی نہیں، پردہ ہے تری عصمت کا　　پردہ اٹھ جائے تو چھپنا ترا مشکل ہو جائے
میں نے دیکھا ہے تری حسن کو جو بائی ہوس　　اب نگاہوں میں حقیقت بھی نہ باطل ہو جائے
کے دنیا میں ہوا احساسِ نشاطِ فانی　　غمِ ہستی سے اگر سیر مرا دل ہو جائے
شدّتِ سوزِ نہاں کو جو ہنسی سمجھا ہے　　وہ مری ایک نظر کا متحمل ہو جائے
ابھی طوفاں ہے کہ پُر شور ہے سیلابِ امید　　اپنی حد پر یہ پہونچ جائے تو ساحل ہو جائے
دل کا مفہوم ہے، ہلکی سی تڑپ سینے میں　　تو جدھر دیکھ لے پیدا ادھر اک دل ہو جائے
جانتا ہوں کہ وفا جی سے گذرنا ہے، مگر　　یوں نہ دے طعن کہ جینا مجھے مشکل ہو جائے
دو جہاں ترکِ محبت میں کئے تیرے لئے　　اور بیزار جو تجھ سے بھی مرا دل ہو جائے!
عشق میں قسمتِ پروانہ اُسے ملتی ہے　　شمع سے پہلے جو خاکسترِ محفل ہو جائے
کوئی اس وقت مسافر کی نگاہیں دیکھے!　　چاند جب صبح کو آسودۂ منزل ہو جائے

قدرِ انساں ہے ابھی بزمِ عدم میں **سیماب**
کیوں وہ دنیا میں رہے جو کسی قابل ہو جائے

دل اور نفس کی یکجائی سازگار نہیں ہے
بقیدِ نفس، محبت کا اعتبار نہیں ہے

خفا نہ ہو جو مجھے عشق میں قرار نہیں ہے
قرار و صبر پہ انساں کو اختیار نہیں ہے

ستم، اور اُس پہ یہ تاکید لب تک آہ نہ آئے
یہ اور کیا ہی اگر جبرِ اختیار نہیں ہے؟

اُنھیں کمالِ تصور نے جذب کر لیا شاید
مری نگاہ میں اب ننگِ انتظار نہیں ہے

کبھی وہ دن تھے کہ انکار جانتے ہی نہ تھے تم
اب ایک عرضِ تمنا پہ بار بار نہیں ہے

کسی سے کیا ابدی ربط کی کروں میں تمنا
مجھے خود اپنی ہی ہستی پہ اعتبار نہیں ہے

دل اُن کو دیکے میں دل سے نجات پا تو چکا ہوں
یہ اور سینے میں کیا ہی جسے قرار نہیں ہے!

یہاں بہار و شباب ایک ہی ہوا کے ہیں دو رُخ
شباب بھی نہ رہے گا اگر بہار نہیں ہے

ہر ایک ذرہ ہے اک نقشِ پائمالِ خرابی،
وہاں بھی قبر بنا دو جہاں مزار نہیں ہے

دعائیں مانگ رہا ہوں اگر سکوں نہیں دل کو
خدا کے پاس بھی شاید مرا قرار نہیں ہے

سرائے دہر میں **سیماب** جاگنا ہے مناسب
مسافروں کو یہاں خواب سازگار نہیں ہے

تجھ پر سب کی نظر نہیں ہے
تو جلوۂ رہگذر نہیں ہے

انسان کی آن میں اُسے دیکھ
وہ شان میں جلوہ گر نہیں ہے

دیتا ہے مجھے فریب کافر!
کیا تجھ کو خدا کا ڈر نہیں ہے

دنیا کو مری خبر ہو شاید — دنیا کی مجھے خبر نہیں ہے
ہر کام میں شرط ہے سلیقہ — اک سانس بھی بے اثر نہیں ہے
اللہ ری ہجوم جلوۂ حسن — گنجائش یک نظر نہیں ہے
ہے ہر نفس اعتراف تیرا — نغمہ بے نغمہ گر نہیں ہے
جلوہ ہے ترا محیطِ عالم — موقوف نگاہ پر نہیں ہے
آزاد ہے وسعتِ تصور — زندانیٔ بام و در نہیں ہے
گلگشت نہ عشرتِ صبوحی! — اب میری سحر سحر نہیں ہے

آسودگی کا وجود سیماب
کہتے ہیں کہ ہے، مگر نہیں ہے

حسن کو، اے خدائے حسن، فطرتِ بیقرار دے — یا مری چشم شوق کو ہمتِ انتظار دے
رنگ نوائے عشق ہوں، دل کو مری قرار دے — خاطرِ غم نگار دے، فکرِ شگفتہ کار دے
سچ ہے بیانِ چارہ گر، ہاں میں سکوں پذیر ہوں — سمجھے وہ میرا درد کیا، جس کو خدا قرار دے
میں جو رہوں چمن نشیں رازِ شگفت کھل نہ جائے — دعوتِ وحشتِ جنوں کیوں نہ مجھے بہار دے
مدِ نظر جو عشق کو ہو نہ وفا کا امتحاں — کیوں مرے دل پہ وہ مجھے قوتِ اختیار دے
فطرتِ ظرف آشنا، جبر تجھے روا نہیں، — یا مرے دل کو غم نہ دے، یا غمِ سازگار دے
پھر ہے فضائے زندگی تشنۂ کیف و سرخوشی — اپنے کرم سے پھر مجھے باغ بنا، بہار دے
ذرہ نواز ہو اگر رفعتِ آستانِ دوست — کیوں مری خاک کو صبا زحمتِ رہگذار دے

بارشِ گل دیا، اس سے سرد ہے روح، ساقیہ ! — بادۂ شعلہ بار دے، ساغرِ پُر شرار دے
وہ بھی مری طرح رہے سوز بجاں خدا کرے — اُس کو قرار کیوں ملے، جو نہ مجھے قرار دے

شکوۂ فضول وارثیؔ، جب شنوا نہیں کوئی،
ہے گذراں یہ زندگی، جیسے بنے گذار دے

ساقی ہوا بیگانہ، بیگانے سے کیا کہئے، — بے کیفیٔ میخانہ، میخانے سے کیا کہئے
کیا اُس کو نہیں معلوم آشفتگیاں میری — بے رنگیٔ ویرانہ، ویرانے سے کیا کہئے
تکبیر و فغاں سُن کر خاموش ہیں بُت لیکن — پُر شور ہے بتخانہ، بتخانے سے کیا کہئے
ہم تلخیٔ قسمت سے ہیں تشنہ لبِ بادہ — گردش میں ہے پیمانہ، پیمانے سے کیا کہئے
یوں شمع پہ جھک پڑنا ہے شمع کی رُسوائی — سُنتا نہیں پروانہ، پروانے سے کیا کہئے
دنیا سے اک افسانہ، کہنے کو تھے پھر سوچا — دنیا ہے خود افسانہ، افسانے سے کیا کہئے

سیمابؔ کی سرمستی، اور غمکدۂ ہستی!
دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے سے کیا کہئے

افسوس گذر گئی جوانی — وہ لمحۂ کیف و شادمانی !
پھر آئی نہ لوٹ کر جوانی — اے وائے نشاطِ عمرِ فانی !
خوش ہوں کہ نہ تھی یہ جاودانی — مر مر کے کٹی ہے زندگانی
کیا آگئی نیند اہلِ محفل؟ — کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی !
میں حسن و وفا کی زندگی تھا — تم نے مری قدر ہی نہ جانی

تاروں کو بہارِ مستقل دی   اور مجھ کو دیا شبابِ فانی!
اب تک ایمن کی وادیوں سے   آتی ہے صدائے لن ترانی
ہم نے وہ خواب پھر نہ دیکھا   اک رات کو آئی تھی جوانی!
سیماب گرداب اللہ اللہ
تا چند یہ ماتمِ جوانی!

ہوا اسیر، تو کیوں انتشار میرے لئے ہے   بہار کے لئے میں ہوں، بہار میرے لئے ہے
یہ پھول اور یہ تارے مری بہارِ نظر میں   یہ آسمان و زمیں کا نکھار میرے لئے ہے
ہے کون میرے سوا قابلِ نظارۂ فطرت   یہ لالہ زار یہ ابرِ بہار میرے لئے ہے
ہیں صبح و شام تنوّع مرے مذاقِ نظر کے   تمام گردشِ لیل و نہار میرے لئے ہے
غلط کہ آپ کریں زحمتِ مسرّتِ خاطر   بجا، کہ تلخیِ غم خوشگوار میرے لئے ہے
تمہاری بزم کو حاصل ہے اک ثباتِ مسلسل   یہاں تو زندگی مستعار میرے لئے ہے
مرا تمام سرورِ نشاط دے اُسے یا رب   اُداس اگر نگہِ بادہ خوار میرے لئے ہے
سزائے موت ملی کیوں جو نام لوں میں تمہارا   حیات کس کے لئے ہے جو دار میرے لئے ہے
نگاہ و ذہن ہے احساسِ کائنات سے خالی،   عجیب چیز ترا انتظار میرے لئے ہے
یہ وہم ہو کہ حقیقت سکوں اسی سے ہے دل کو   سمجھ رہا ہوں کہ تو بیقرار میرے لئے ہے
دماغِ عشق ہے سیماب، کامیابِ تصوّر
وہ کہہ رہے ہیں "کوئی بیقرار میرے لئے ہے"

سجدوں پہ میرے طعنہ طرازی — یہ بے نیازی! یہ بے نیازی!

جلوے حقیقی، نظریں مجازی — اللہ رے تیری حسرت نوازی!

دل میرا کعبہ، میں محوِ کعبہ — ہوں خود ہی مسجد، خود ہی نمازی

کب تک خراب عجزِ محبت — یارب مجھے بھی دے سرفرازی

کلیوں کی لَو پر جگنو اُڑاتا — خاکِ چمن کی افسانہ سازی!

دیوانہ بن کر، ابرو ہوا کو! — میں نے سکھا دی دیوانہ سازی

وہ میرے دل کے ٹکڑوں سے کھیلے — آتی ہو جس کو آئینہ سازی

سیمابؔ پر ہے الہامِ رنگیں،

بندہ نوازا، بندہ نوازی!

اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے — کچھ اور بھی ہے تجھ میں فقط خاک نہیں ہے

شایاں مرے ہستیِ غمناک نہیں ہے — اظہارِ حقیقت میں مجھے باک نہیں ہے

انجام ہر اک شے کا بجز خاک نہیں ہے — کیا ہے جو یہ عالم خس و خاشاک نہیں ہے

باقی دلِ مجروح میں ہیں کچھ نفسِ سرد — یہ صید ابھی قابلِ فتراک نہیں ہے

کہہ دو وہ ستارے مجھے بے فکر نہ بیٹھیں — میرے ہی لئے گردشِ افلاک نہیں ہے

آنکھوں سے ہر اک پردۂ موہوم ہٹا دے — اتنی نگہِ شوق ابھی چالاک نہیں ہے

بے پردہ ہو کس طرح وہ جلوہ ترے آگے — دل پاک سہی تیری نظر پاک نہیں ہے

آدابِ تجلی میں ہے گنجائشِ ترمیم — نظارہ تری حسن سے بے باک نہیں ہے

کر چاکِ گریباں سے نہ اندازۂ وحشت | دیوانے ابھی دامنِ دل چاک نہیں ہے
کیا تو نے دمِ غسل و وضو غور کیا ہے | ہر آبِ رواں پاک ہے تو پاک نہیں ہے

سیمابؔ دعا کیجئے کیا صبر و سکوں کی
شائستۂ تسکیں دلِ غمناک نہیں ہے

خود اُٹھ کے میرے ہاتھ گریباں میں آ گئے | شاید قدم جنوں کے گلستاں میں آ گئے
ناحق حیات و مرگ کے طوفاں میں آ گئے | ہم کیوں فریبِ عالمِ امکاں میں آ گئے
بیداریٔ جمال کی آسودگی بخیر! | کیوں آپ میرے خوابِ پریشاں میں آ گئے؟
اس کے سوا بتائیں اسیری کا کیا سبب | گھبرا کے انجمن سے تو زنداں میں آ گئے
کانٹے دل و جگر میں تھے حسرت کے جس قدر | آخر وہ سب سمٹ کے رگِ جاں میں آ گئے
طوفانِ غم کے جب نہ کہیں پا سکے قرار | لینے پناہ قسمتِ انساں میں آ گئے
ہیں کچھ سُنی ہوئی سی صدائیں فضا میں آج | کیا میرے ہم صفیر بھی زنداں میں آ گئے؟
کیا ہوگا چار پھولوں سے اے موسمِ بہار | یہ تو ہمارے گوشۂ داماں میں آ گئے!
جوشِ بہار اور یہ بے اختیاریاں! | سوئے چمن چلے تھے بیاباں میں آ گئے
بھاری قدم، نظر متحیر، نفس دراز، | کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے؟

سیمابؔ کبر و ناز کا انجام کچھ نہ پوچھ
سب رفتہ رفتہ گورِ غریباں میں آ گئے

دل تیرے تغافل سے خبردار نہ ہو جائے | یہ فتنہ کہیں خواب سے بیدار نہ ہو جائے

انساں کہیں سرگشتۂ پندار نہ ہو جائے
بیزارِ گنہ ہو کے، گنہگار نہ ہو جائے

دشواریٔ جادہ سے ہے آسانیٔ منزل
ہو جائے یہ دشوار جو دشوار نہ ہو جائے

مدت سے یہی پردہ یہی پردہ دری ہے
ہو کوئی، تو پردے سے نمودار نہ ہو جائے!

بکتا پھرے یوسف کی طرح حسن ہمیشہ
کوتاہ اگر ظرفِ خریدار نہ ہو جائے

سجدے ہی سے تقدیسِ پرستارِ وفا ہے
سر اپنا اٹھا لے تو گنہگار نہ ہو جائے!

مجھ سے مرا افسانۂ ماضی نہ سنو تم،
افسانہ نیا پھر کوئی تیار نہ ہو جائے

اے مستیٔ الفت سبقِ کفر دیے جا
جب تک کہ مجھے ہر خیر سے انکار نہ ہو جائے

ہونا ہے جو مٹی کو مری خاک ہی **سیماب**
پہلے ہی سے کیوں خاکِ درِ یار نہ ہو جائے

مجھے عمرِ رفتہ کی پھر آرزو تھی
تصور میں اُن سے یہ کیا گفتگو تھی؟

تجھے میرے جذبات کی جستجو تھی
مری آرزو بھی کبھی آرزو تھی

تری خاکِ در غازۂ آبرو تھی
نمازِ طلب بے نیازِ وضو تھی،

شکایت ہے بے سود بے رنگیوں کی
طبیعت ہی کیوں اہلِ رنگ و بو تھی

ہیں اب صرفِ انجامِ گلشن نگاہیں
وہ موسم گیا جب نظر چار سو تھی

ہیں بادہ نوشی کی عادت تھی جب تک
شرابِ محبت سبو در سبو تھی

تھیں سب تیری نیرنگیاں اے تمنا
جوانی کی تاروں بھری رات تو تھی

بیاں کون اسرارِ میخانہ کرتا
میں بیخود، صراحی گرہ در گلو تھی

تمھیں میری رگ رگ میں جھلکے ہوئے تم — مرے ہر نفس میں تمہاری ہی بُو تھی
کہاں تک ترے سوزِ غم سے نہ جلتا — کہ دل کی بساط ایک قطرۂ لہو تھی

ابھی اور سیماب رونا تھا دل کو
ابھی گرم خاکسترِ آرزو تھی

حجابِ حسن سے ہوتا ہے آشکار مجھے — ترا ظہور ہے اپنا ہی انتظار مجھے
خوشی حرام ہے ساقی بس اب بہار مجھے — نہیں نہیں، نہ پلا خونِ لالہ زار مجھے
بہت دنوں میں جو اُس جلوہ گاہ تک پہنچا — تجلیوں نے کیا خوب شرمسار مجھے
اب اپنے ذوقِ تماشا کو کیا دعائیں دوں — بنا دیا ہے حریفِ جمالِ یار مجھے
خبر نہیں ہے مرے مطمحِ نظر کی اُنھیں — سمجھ رہے ہیں وہ اپنا ہی بیقرار مجھے
جو کھول دوں ابھی یہ راز کیا قیامت ہو؟ — کہ پردہ در نظر آیا وہ پردہ دار مجھے
جدا نہ کر مجھے نظروں سے میں نہ کہتا تھا، — اب انتظار تجھے ہے کہ انتظار مجھے؟
یہ جوشِ رنگ، یہ سیلِ نمو، یہ شوخیٔ بُو، — کہیں اُچھال نہ دے دامنِ بہار مجھے
تھی ذرے ذرے پہ تکرار جب میں زندہ تھا — زمین والوں نے اب کہیں دیا مزار مجھے
بنا کے بے خبرِ ہوش کر دیا آزاد — جنوں نے بخش دیا دل پہ اختیار مجھے
صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاگوں گا — کسی سُنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

سلام ہستیٔ سفلہ نواز کو سیماب
ہوا نہ عیش زمانے کا سازگار مجھے

حیرانِ جمال ہے خدائی — اب ختم بھی کر یہ خود نمائی
میں اور جہانِ بے وفائی! — تھی کوئی کشش جو کھینچ لائی
آتے ہی ہو تو ابھی نہ آنا — ہوں محوِ تصورِ آزمائی
اے حسن تری دیار میں بھی — موجود ہے لعنتِ گدائی
بہتر ہے سرود و چنگ و نے سے — اک نغمۂ مستِ بے نوائی
جو وقت گیا وہ پھر نہ لوٹا — جو سانس گئی وہ پھر نہ آئی
پچھلی راتوں کو میکدے میں — ڈھلتا ہے دماغِ پارسائی
میں اور یہ میری خود فروشی — تو اور یہ تیری خود نمائی
آخر میں سمجھ گیا تو کیا ہے — دے اور فریبِ آشنائی!
میری ہی نیازمندیوں سے — قائم ہے وقارِ کبریائی

منزل پہ پہنچ گیا میں سیماب
لے معذرتِ شکستہ پائی

نشاطِ بزمِ عالم زندگی کے کیف و کم تک ہے — یہ ساز اور اس کا ہر نغمہ نفس کے زیر و بم تک ہے
حیاتِ عاشقی میری دلِ مانوسِ غم تک ہے — مذاقِ آرزومندی فقط میرے ہی دم تک ہے
مرا کفرِ محبت ہی فروغِ جادۂ ایماں — وہ شمعِ دیر ہوں میں روشنی جس کی حرم تک ہے
کریں اربابِ جادہ کیا تعین اپنی منزل کا — مسلسل اک سفر ایوانِ ہستی سے عدم تک ہے
یہ خوں آمیز آنسو، اور یہ طوفان خیز آہیں — مرے دل میں ترا غم ہی نہیں پایانِ غم تک ہے

تری محفل میں اپنی نارسائی کی شکایت کیا
غنیمت ہے کہ در پردہ رسائی تیری ہم تک ہے

ہمیں اپنے ستم کی لذتوں میں محو رہنے دے
ہوس تیرے کرم کی صرف احساسِ ستم تک ہے

یہ راہِ عشق کی دشوار پیمائی، معاذ اللہ!
قدم کیسا کہ لرزش میں یہاں نقشِ قدم تک ہے

تصور کے حجابوں میں، تخیل کے نقابوں میں
نظر کا سلسلہ تیرے حریمِ محترم تک ہے

دیے جا کیفِ غم اپنا مجھے جب تک دیا جائے
دلِ غم آشنا کی شادمانی تیرے غم تک ہے

بساطِ دہر کی سیماب گرمی ہیں مرے نغمے
مرا چرچا عرب تک ہے، مری شہرت عجم تک ہے

ہے وقفِ جہاں فکرِ میخانہ کشا میری
ساقی ترے کانوں تک پہونچے یہ صدا میری

تھی راہبرِ منزل، تقلیدِ بجا میری
آخر مرے پس رو کے کام آئی وفا میری

میرا وہی عالم ہے، جو عشق میں پہلے تھا
دنیا کے بدلنے سے بدلی نہ فضا میری

یہ ناشنوائی کا تیری نہ کرے شکوہ
یارب دلِ انساں کو فریاد سکھا میری

تم سے بھی سکوں میں نے مانگا تھا خدا سے بھی
اب تک ہے فضاؤں میں محفوظ دعا میری

جذب اس نے بھی کرلی ہے کیا قوتِ پامردی
اٹھتی نہیں آندھی سے خاکِ کفِ پا میری

اقصائے ازل سے وہ ہمراہ چلا میرے
سیماب سنی جس نے آوازِ درا میری

اپنی نگاہِ ناز کو جرأتِ بے رخی نہ دے
محوِ امید رکھ مجھے، فرصتِ خودکشی نہ دے

کیفِ خودی سے مست ہوں، دعوتِ بیخودی نہ دے
ذہنِ فریب خوردہ کو زحمتِ آگہی نہ دے

حسن کو کر بنازِ مسندِ میرے حریمِ شوق کا
قسمتِ غزنوی تو دے شوکتِ غزنوی نہ دے!

مرحلہ ناشناس ہوں، پائے طلب بہک نہ جائے
جادۂ عشق میں مجھے ہمّتِ خود روی نہ دے

صرف ہی مطمحِ نظر قربتِ محفلِ جمال
خادمِ آستاں سمجھ، عزّتِ دوستی نہ دے

تابِ نظر نہیں مگر ڈھونڈنے کی آرزو تو ہے
ہمّتِ طُور دے مجھے فطرتِ موسوی نہ دے

میرے لبوں کی جنبشیں ہیں مری روح کا کُشاد
پرسشِ غم کیے ہی جا، مہلتِ خامشی نہ دے

میں ہوں ترا غم آشنا، عیشِ جہاں سے کام کیا
دے کے متاعِ سرمدی، دولتِ عارضی نہ دے

کسلِ حیات و کسلِ غم، ایک دل اور دو ستم
لذّتِ غم تو کر عطا، لذّتِ زندگی نہ دے!

ہاں مری بیقراریاں موجِ مئے مجاز ہیں
میں تو ہوس پرست ہوں تہمتِ عاشقی نہ دے

دفن اسی جگہ تو ہیں عشق و وفا کے میکدے
دعوتِ کیف و وجد کیوں تربتِ وارثی نہ دے

آنسوؤں سے نہ دل کی آگ دبی
ہائے اے عشق تیری بے سببی!

لبِ رنگین و بادۂ عنبی!
زندہ باشں اے مذاقِ تشنہ لبی!

میں ہوں عشق و وفا کا پیغمبر
مجھ سے دامن کشی ہے بو لہبی

چاہتا ہے اگر سکوں دل کا
چھوڑ دے شیوۂ سکوں طلبی

صبر کی عشق میں نہ کر تلقین
عشق اور صبر، وائے بوالعجبی!

عشق میں امتیازِ ملّت کیا
عجمی دل ہے بندۂ عربی

آہ، اُس بزمِ حسن کے آداب!
انتہائے ادب ہے بے ادبی

مجھے کیفِ جمالِ خوشۂ تاک — تجھے خوئے نشہ دہ عنبی،
پھر تغافل ہے حسن میں سیماب
آج پھر ایک آہِ نیم شبی!

گیا موسم، ابھی تک نقشِ دیوانہ نہیں اُٹھی — ہوائے دشت شاید بن کے افسانہ نہیں اُٹھی
اُڑا پروانہ بنکر سوزِ دل سے کب کوئی شعلہ — کہ مقدم کو ہماری شمع کاشانہ نہیں اُٹھی
ابھی لا انتہا ذرّوں کو ہے پرواز کی حسرت — کوئی آندھی بقدرِ ظرفِ ویرانہ نہیں اُٹھی
تصوّرِ جلوۂ مستور کو صد رنگ کر دے گا — نیا فتنہ اُٹھا، دیوارِ بت خانہ نہیں اُٹھی
دورِ کسلِ غم سے بیٹھا جاتا ہے دل میرا — نگاہِ حسن اب تک لے کے پیمانہ نہیں اُٹھی
یہ دنیا ہے ابھی بیگانۂ رندی و سرمستی — ابھی تبلیغ کو کیا قومِ میخانہ نہیں اُٹھی؟
کبھی کے کام آجاتے یہ ٹکڑے جام و مینا کے — مرے ہاتھوں کوئی بنیادِ میخانہ نہیں اُٹھی
شگفتِ غنچہ و گل سے صبوحی پی رہا ہوں میں — ابھی سو کر عروسِ صبحِ گلخانہ نہیں اُٹھی
بھڑک اُٹھی ہے کیوں دنیا مری اُنکی محبت پر — یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھی
اُٹھاؤ عشق کا سر، توڑ دو وحشت کی زنجیریں — ہنوز اس بزم سے رسمِ غلامانہ نہیں اُٹھی؟

بساطِ بزم اُٹھی، شمع اُٹھی، جامِ مے اُٹھا
مگر سیماب اب تک نقشِ پروانہ نہیں اُٹھی

تیری دنیا ہے دنیا الٰہی مگر، مطمئن ذہنِ دنیا نہیں ہے
کاوشِ زندگی، کاہشِ مرگ کا، کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے؟

پھول کا، خار کا، باغ و کہسار کا، علم انسان کو کس کا نہیں ہے؟
پھر بھی اس جلوہ گاہِ پُراسرار کا، کوئی راز آشکارا نہیں ہے
جتنے پروانے پہلے فنا ہو چکے، گر انہیں زندہ اور پوچھ اُن سے
دَیر میں جس کے پرتو سے ہے روشنی، کیا یہ شمعِ کلیسا نہیں ہے؟
یاد صبحِ ازل کو ہے وہ ماجرا، جب فرشتوں کا مسجود یہ تھا
ہے یہ تاوان اُس جرمِ تقدیس کا، سجدہ انسان کا سجدا نہیں ہے
یہ تو رسماً ہے اک عادتِ بندگی، ورنہ میں کیا مری التجا کیا!
آپ چاہیں تو کونین دیدیں مجھے، آپ کے ہاتھ میں کیا نہیں ہے!
میں بہاریں سپردِ چمن کر چکا، تو بہاروں سے ہے گل بداماں،
میری منزل میں اور راستے میں ترے، فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے
اک نشیمن (وہ خاشاک و خس کا مکاں) اور اُس پر یہ غرّہ یہ فغاں
کس قدر تنگ بیں ہے مرا باغباں، جیسے دنیا میں صحرا نہیں ہے!
مستقر اپنا دنیا کو کر لے یقیں، دے مگر فکر کو اتنی زحمت
تھی جو گہوارۂ آدمِ اوّلیں، کیا یہ دنیا وہ دنیا نہیں ہے؟
سب یہ جلوے ہی جلوے تو ہیں ہر طرف، ہیں حجاباتِ اوہام باطل
جتنے پردے ہیں ان سے ہیں پردہ کوئی، حائلِ چشمِ بینا نہیں ہے
تو اور ارمانِ حرص و ہوا و ہوس، اس کی تکمیل فطرت کرے کیوں؟

یہ تو اک آب و گندم کی انگڑائی ہے، یہ تمنا، تمنا نہیں ہے
حدِ عالم سے ہوتا اگر آشنا، اس میں محصور انساں نہ رہتا،
آج تک تو نے تحقیق جتنا کیا، یہ جہاں صرف اتنا نہیں ہے
زندگی کا ہے ادراک مقصود اگر، قیدِ ہستی سے آگے گذر جا،
زندگی کے ظواہر پہ نقد و نظر، فلسفہ زندگی کا نہیں ہے
اختیاراتِ فطرت، ترا شکریہ! چھٹ گئے ہم بڑی کشمکش ہے،
پہلے کچھ عزم تھا دل میں اچھے برے، لیکن اب کچھ ارادا نہیں ہے
تیرے ہونے کا اقرار ہے ہر عدم، لیکن اقرار و انکار کیسا!
ہستی و نیستی کا توازن ہی کیا، لا بمقدارِ الاّ نہیں ہے!
فکر کے وقت سیماب خونِ جگر، عرش کا طوف کرتا ہے اکثر
شعر کہنا ہے در اصل پیغمبری، شاعری ہے تماشا نہیں ہے!

اب کہاں وہ گرمیٔ محفلِ مجاز ہے — میں بھی پاکباز ہوں، وہ بھی پاکباز ہے
کیفِ دل سے مست ہوں، مجھے احتراز ہے — بے مزہ سی ہے شراب، وہ بھی خانہ ساز ہے
میں ادب شناس ہوں، مائلِ خودی نہ کر — بیخودی کے ہوش تک حدِ امتیاز ہے
تیرا نام لے لیا اور سر جھکا دیا — یہ مرا سجود ہے، یہ مری نماز ہے
میرا ظاہر ونہاں ایک ہی، مگر کہاں! — لب پہ ایک داستاں دل میں ایک راز ہے
فطرتِ ہوس میں ہے عادتِ فتادگی — ہے ہوس نیاز مند، عشق بے نیاز ہے

شاہبازیوں کا درس دی نہ میری ذہن کو　　میری ہمت بلند جبرئیل ساز ہے
ایک ہی نظر کے ساز، ہیں حقیقت و مجاز　　تھا جو پہلے دلنواز اب بھی دلنواز ہے
سوزِ عشق سے ترا، دل پگھل گیا تو کیا!　　شمع سر سے تا بپا، مطلقاً گداز ہے
ہے رہِ طلب بری، قید قرب و بعد سے　　یہ سر نیاز ہے، یہ حریم ناز ہے

میرا شعر وارثی، ہے حدیث دائمی
عمر میری کم سہی، زندگی دراز ہے

بھولی ہوئی یاد آئی کہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
واپس پھر آجائے عہدِ فانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
ہر وقت نشہ، ہر وقت مستی، تصویرِ جنت ایوانِ ہستی
بے جام و بادہ اک سرگرانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
پھولوں کے گجرے، کلیوں کے گہنے، سینے پہ مٹھیاں، بکھری پریشاں
شامیں معطر، راتیں سہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
سینے میں گرمی، منہ پر پسینہ، آنکھوں میں شعلے، دل میں طراری
نظروں میں دنیا لیلائے ثانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
وہ ان کا جانا دامن جھٹک کر، وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر
وہ ان کا آنا وہ شادمانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
وہ شامِ فرقت آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں

آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!

وہ چاندنی میں نظریں بچا کر اُن کے مکاں کا طوفِ مسلسل
سب سے چھپانا رازِ نہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!

مایوسیوں سے مجبور ہو کر، قسمت سے منت، فطرت کو سجدے،
پچھلے کو اُٹھ کر تسبیح خوانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!

خط اُن کو لکھنے راتوں کو اُٹھ کر، منھ کے صفحے دفتر کے دفتر
پیغام پھر بھی دینا زبانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!

ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں دل کا فسانہ جاگ کے سُننا
اپنی کہانی، دل کو سُنانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!

گذری جوانی سیماب لیکن، سوزِ محبت اب تک ہے باقی
یہ آگ شاید ہے جاودانی، ہائے محبت ہائے جوانی!

تضمین

کیف و سکونِ بزمِ ازل سے جدا ہوا دنیا میں آ کے موردِ رنج و بلا ہوا
احساسِ حسن و عشق سے درد آشنا ہوا افسردۂ سرابِ وفا و جفا ہوا
ہنگامۂ حیات سے محوِ بکا ہوا آزردۂ کشاکشِ بیم و رجا ہوا
ان آفتوں کے بعد، خراب فنا ہوا غم، قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا
پُتلہ عذاب کا ہوا انسان کیا ہوا!

تھا یوں بھی اسمیں آگ کا طوفاں دبا ہوا پہلو میں اک خموش جہنم چھپا ہوا
یہ رنگ عشق کا تھا ظاہر دبا ہوا ضبط اس لئے تھا پردۂ تسکیں بنا ہوا
اب حسن، برق بن کے اگر شعلہ زا ہوا مجھ کو نصیب طور ملا، کیا بُرا ہوا
اکسیر بن گیا، اثرِ کیمیا ہوا تقدیر میں اضافۂ سوز وفا ہوا
تم نے جو دل میں آگ لگا دی تو کیا ہوا!

دیوانہ پُرشکیب ہے، ویرانہ رقص میں، صحرا ہے آج صورتِ دیوانہ رقص میں
آسودہ برگ و بار ہیں، گلخانہ رقص میں، روحِ مکیں سکوں میں ہے، کاشانہ رقص میں
بزمِ سرور و کیف ہے مستانہ رقص میں جام و سبو کے ساتھ ہے میخانہ رقص میں
ساقی ہے مثلِ ساغر و پیمانہ رقص میں ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں

شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

اب ہے وہ آسماں، وہ فضا ہے نہ وہ زمیں　　　پُرکیف میکدے، نہ وہ گلخانۂ حسیں
دیر و حرم بھی حدِ نظر تک کہیں نہیں　　　اب فکرِ آستاں ہے نہ وہ شورشِ جبیں
ہے فکرِ پیرہن، نہ غمِ جیب و آستیں،　　　میں ہوں کہیں نگاہ کہیں ہے، قدم کہیں!
بے نام ایک عالمِ ہو ہے نظر نشیں　　　ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں

یہ آگیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا؟

ابتک تو مستقل یہ رہی خوئے عاشقی　　　اس نے کیا ستم تو دعائیں دلِ نے دی
خوش تھا کہ ایک بات جو ہے رازِ زندگی　　　کہدونگا وقتِ قتل بہ اندازِ سرخوشی
قاتل کے علم میں تو وفائیں رہیں مری　　　ہوں ترجمانِ عمر کچھ الفاظِ آخری
لیکن یہ بیخودی میں بڑی بھول ہو گئی　　　مُنہ سے دعا نکل ہی گئی وقتِ قتل بھی

کہنا یہ تھا کہ حقِ محبت ادا ہوا!

ہے سال بھر سے مجھ کو بہاروں کا انتظار　　　لب تشنۂ بہار ہوں، سرگشتۂ خمار
بیٹھا ہوا ہوں خاک پہ، پامالِ رہگذار　　　پیمانہ دربغل، قدحِ خشک درکنار
بے کیفیوں سے دل ہے پریشان و بیقرار　　　آثار آج کچھ نظر آتے ہیں خوشگوار
وہ ہو اگر تو کیوں نہ اُسے لیں ہیں آثار!　　　کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقئ بہار؟

جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اڑا ہوا

نور و ظہور ہے نہ کلیم و کلام ہے　　　بزمِ سحر اداس ہے، سنسان شام ہے

جلوؤں کے انتظار میں ہر خاص و عام ہے عالم تمام تشنۂ حسنِ تمام ہے
ایمن کی وادیوں میں سکوتِ دوام ہے گر زندگی یہی ہے تو جینا حرام ہے
یہ اہتمام ہے تو غلط اہتمام ہے! اے خادمانِ حسن یہ کیا انتظام ہے؟
اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا

تھے کبر و عجز صرفِ عمل بزمِ حسن میں، کچھ ہو رہا تھا ردّ و بدل بزمِ حسن میں
فطرت کے جل رہے تھے کنول بزمِ حسن میں تھا انتظامِ بزمِ ازل بزمِ حسن میں
نور آفریں جبیں پہ تھے بل بزمِ حسن میں تھی شوق کی زباں پہ غزل بزمِ حسن میں
تھا ایک گوگو کا محل بزمِ حسن میں بحثِ نیاز و ناز تھی کل بزمِ حسن میں
سیماب کچھ خبر نہیں کیا فیصلا ہوا؟

―――― ❊❊❊ ――――

مثلث

گوہرِ اشک کو خونِ نابہ حرماں دیکھا　　　دلِ خوں گشتہ کو سیلاب بداماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

ذہنِ فطرت کی تمنا ہی پریشانی تھی　　　غالباً فطرتِ دنیا ہی پریشانی تھی
جسے دیکھا اُسے دنیا میں پریشاں دیکھا

رشتۂ اُنس سے مربوط تھی انسانیت　　　اُنس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دے دیا منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

انہیں دو حسینوں کو برہم زنِ محفل پایا　　　نغمۂ عشق کو ہنگامہ گرِ دل پایا
حسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

رنگِ امید سے تھا جب دلِ مضطر خالی　　　شبِ غم جب نظر آتا تھا بھرا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

ماہِ تاباں ہو کہ تاروں کے جلوخانے ہوں　　　شمع ہو، رونقِ محفل ہو، کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اُسے اک رات کا مہماں دیکھا

ذوستا شوق کی نظروں کو زمانے کی طرح　　　طور پر پھر نظر آجا نظر آنے کی طرح
یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

آئینہ تھیں نظرِ گلکدہ رس کی راتیں　　　کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں

آنکھ جب بند ہوئی خوابِ گلستاں دیکھا

شرط تھی پنجہ کشی دہر کی دست پہ مجھے　　ہوش آیا تو ہنسی آگئی وحشت پہ مجھے
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

کوئی نازاں مجھے جانا کوئی مجبورِ حجاب　　کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودہ خواب
سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا

اور کیا کرتے، نہ خاموش اگر رہتے ہم　　کس سے سیمابؔ پریشانیٔ دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

مثلّث

کیا چارۂ مصیبتِ شام و سحر کریں،　　حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں
آخر ہم ایک حال میں کبتک بسر کریں؟

بے پردہ تجھ کو دیکھ لیں کوشش اگر کریں　　اہلِ نظر وسیع گر اپنی نظر کریں
ذرّے نقاب الٹ کے تجھے جلوہ گر کریں

تائید میں ہے حسن جواں کی خدائے حسن　　فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن
آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں

کمزور ہے خیال، تصور ہے منتشر　　ہو منتشر نہ سلسلۂ حسن و عشق اگر
نالے براہِ راست تجھی پہ اثر کریں

پھر چھیڑ دے نیا کوئی نغمہ ربابِ حسن، پھر وہ فضائے طور میں بھر دیں شرابِ حسن
پھر انتظامِ دعوتِ کیفِ نظر کریں

اب یہ تعیّنات ہیں، تیری قسم فضول جب تو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں

جائز ہے آہ و نالہ، نہ یارائے صبر ہے لے اقتضائے ضبط یہ ضد ہے کہ جبر ہے
کیا آنکھ ہم بجنبشِ مژہ بھی نہ تر کریں

ہنگامہ در کنار ہے دنیائے خیر و شر ہے محشر نگاہ تماشائے خیر و شر
فرصت کہاں کہ فیصلۂ خیر و شر کریں

معمورِ سوز و درد ہے سازِ شبِ فراق خود ہوگا چاک پردۂ رازِ شبِ فراق
احباب انتظارِ نمودِ سحر کریں

ممکن نہیں کہ اُن کے تغافل پہ ہو اثر انجامِ اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر
پھر کیوں ہمارے حال کی اُنکو خبر کریں

زندہ رہیں تو جینے میں آتا نہیں مزا مر جائیں تیرے غم میں تو چرچے ہوں جابجا
ہو داستاں طویل اگر مختصر کریں

پھر خلوتِ جمال میں جلوے سنور چکے فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گذر چکے
شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

پردے تمام اُٹھ گئے تا حدِّ جلوہ گاہ اُس مرکزِ جمال پہ اب ہے مری نگاہ

جلوے بھی دیکھ لیں تو ادائے نظر کریں

تم نے تو دل حجاب سے محفوظ کر لیا
تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں!

نقص و کمال پیشِ نظر خود ہیں بے حساب
سیماب ہم میں عیب ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب ہنر پر نظر کریں!

مثلث

عیاں عالم کی حالت ہو رہی ہے
نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے
مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے

رہائی کی اجازت ہو رہی ہے
بدن سے روح رخصت ہو رہی ہے
مکمل قیدِ غربت ہو رہی ہے

انھیں تو اب بھی دلجوئی ہے منظور
میں خود ترکِ تعلق پہ ہوں مجبور
کچھ ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے

نہ کیوں لذتِ کشِ مستی بنوں میں
سرِ محفل نہ کیوں کھل کر پیوں میں
ان آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے

بتوں کی سازشیں اللہ اکبر
خدا سے مل گیا ہے حسن کافر
خدائی پر حکومت ہو رہی ہے

الٰہی ہم کو وحدت آشنا کر سکونِ نظمِ وحدت پھر عطا کر
کہ برہم بزمِ کثرت ہو رہی ہے

بصارت قوتِ جلوہ سے معدوم تجلّی کا مذاقِ جبر معلوم،
نظر مجبورِ حیرت ہو رہی ہے

ہیں کتنے بے محل تیرے مواعظ یہ بے ربطی یہ نقصِ وعظ واعظ!
جوانی میں نصیحت ہو رہی ہے

کہیں ملتا کوئی تاریک جنگل، نہیں تنہائیِ زنداں مکمل
مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے

مری نظروں میں نشتر بھر رہے ہو یہ تم ہنس ہنس کے باتیں کر رہے ہو
کہ تقسیمِ جراحت ہو رہی ہے؟

کہاں وہ جوہرِ ذاتی صفت میں ابھی تک محشرِ انسانیت میں
تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے

قریبِ کعبۂ ابرو رُکی ہیں، لبِ لعلیں پہ نظریں جم گئی ہیں
بڑی رنگیں عبادت ہو رہی ہے

جہاں میں دے دیا دل جس کو چاہا ملا جب دل تو انساں یہ نہ سمجھا
کہ تفویضِ امانت ہو رہی ہے؟

اگر مذہب وہی پہلا ہے سیماب اگر مشرب نہیں بدلا ہے سیماب
تو کیوں تجدیدِ بیعت ہو رہی ہے؟

سنہ ۱۹۰۹ء تا سنہ ۱۹۱۸ء

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند
گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

(خواجہ حافظ)

از وصالِ گل و پیمانہ صدائے برخاست
شعرِ نایاب دہ بہ بازدلِ دیوانہ زدند

(نایاب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادۂ دوشیں

اس انجمن میں جو عزمِ ظہور تو نے کیا — حجابِ خاک کو شایانِ نور تو نے کیا
عجب معاملہ بالائے طور تو نے کیا — شرارِ سنگ میں چھپ کر ظہور تو نے کیا
جہاں نواز یہ انساں نوازیاں تیری — کہ اس کو قابلِ حور و قصور تو نے کیا
مسلط اس پہ رہیں قوتیں عناصر کی — یہ انتظامِ دلِ ناصبور تو نے کیا
شریکِ حالِ گنہگار تھی تری رحمت — ندامتوں پہ کرم بھی ضرور تو نے کیا
بشر سے کیوں ہو گلہ تیری کبریائی کو — بشر کو مائلِ کبر و غرور تو نے کیا
دکھا کے حسن کے پردوں میں اپنے نقش و نگار — ہلاکِ جلوۂ نور و ظہور تو نے کیا
یہی رہا نگہِ جلوہ دوست کو ارماں — کہ پھر نہ قصدِ تجلائے طور تو نے کیا

قصور ہی پہ کرم کی اساس ہے سیماب
قصور اگر نہ کیا تو قصور تو نے کیا

اب تو یہ حال ہے نظرِ سوگوار کا — کیفِ جمال ہے نہ مزہ انتظار کا
گرتی رہی ہیں چشمِ تماشا پہ بجلیاں — ہوتا رہا ہے حُسن پہ دھوکا شرار کا
کہتے ہیں جسکو نزع کا عالم فضا شناس — پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا
اہلِ خطا پہ چشمِ کرم ٹوٹ کر گری — جُھکنا ستم ہوا نگہِ شرمسار کا
اک چشمِ التفات کہ ہوں تشنۂ وفا — اک پیار کی نگاہ کہ بھوکا ہوں پیار کا
پانی میں ایک جوش ہی مٹی میں اک گداز — بنتا نہیں مزار ترے بیقرار کا
مُنہ زرد خونِ یاس سے پلکیں بھری ہوئی — عالم تو دیکھئے سحرِ انتظار کا

سیماب کیا سُناؤں میں اپنا کسی کو حال
زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

مذاقِ درد پسندی مرا شعار ہوا — میں بیقرار نہ ہونے سے بے قرار ہوا
گراں سری سے نہ زانو پر آنکے بار ہوا — سرور مجھ کو بہ اندازۂ خمار ہوا
مری ستم زدگی کی کہیں مثال نہیں — میں ایک ہی تو غم اندوزِ روزگار ہوا
ہے تیرگیِ شبِ غم میں کیسی ویرانی — الٰہی گھر نہ ہوا گوشۂ مزار ہوا
بلا سے اپنی جو ہیں غمگساریاں ارزاں — کوئی جہاں میں ہمارا ابھی غمگسار ہوا
بُجھا تو داغِ جگر بن گیا گُلِ تربت — بھڑک اُٹھا تو چراغِ سرِ مزار ہوا

حسد سے مجھ کو بچایا خدا نے ای **سیماب**
خوشا نصیب کہ محسودِ روزگار ہوا

معجزۂ حسنِ تخیّل کا نمایاں ہوگیا جب تصور بڑھ گیا، تصویرِ جاناں ہوگیا
دل تو وحشی تھا اسیرِ زلفِ جاناں ہوگیا اے دماغِ آرزو تو کیوں پریشاں ہوگیا
جلوۂ پنہاں نے رازِ عشق افشا کردیا تیرا چھپنا میری رسوائی کا ساماں ہوگیا
شرم رکھ لی شامِ فرقت میری ضبطِ شوق کی ہائے وہ آنسو جو سوزِ دل کا درماں ہوگیا!
شامِ غم آیا بہت بن بن کے خوابِ آرزو اور آنکھوں میں سماتے ہی پریشاں ہوگیا؟
میں تو یہی حسرتِ ناکام کا ممنون ہوں زندگی مشکل سہی مرنا تو آساں ہوگیا
آبروئے عشق اُس آنسو کی دستِ پر نثار جو مری آنکھوں سے نکلا اور طوفاں ہوگیا
ہم خطِ تقدیر میں لکھوا کے اُن سے لائے تھے ایک لفظِ آرزو وہ بھی پریشاں ہوگیا

ایک لفظِ "حسن" میں سیمابؔ اتنی وسعتیں!
سینکڑوں افسانہ ہائے دل کا عنواں ہوگیا

جنت جو ملے لا کر میخانے میں رکھ دینا کوثر مرے چھوٹے سے پیمانے میں رکھ دینا
میت نہ مری جا کر ویرانے میں رکھ دینا پیمانوں میں دفنا کر میخانے میں رکھ دینا
وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا
سجدوں پہ نہ دیں مجھ کو اربابِ حرم طعنے کعبے کا کوئی پتھر بتخانے میں رکھ دینا

سیمابؔ یہ فطرت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
خاموش سی اک کلی پروانے میں رکھ دینا

غم میں اُلجھا کر طریقِ عشق مشکل کردیا مختصر سی راہ کو قسمت نے منزل کردیا

باعثِ ہنگامہ و گرمیِ محفل کر دیا — کس قیامت کو خدائے عشق نے دل کر دیا

جس جگہ تھے رک گئے دیوانگانِ راہِ عشق — قیس کا اعلان کیوں منزل بہ منزل کر دیا

عشق ہے اک انقلابِ دہر مجبورِ زوال — اک حقیقت تھی اُسے بھی تو نے باطل کر دیا

حسبِ مرضی بیٹھنے اُٹھنے کی آزادی رہی — بیخودی نے بے نیازِ نظمِ محفل کر دیا

واہ رے صورت گرِ فطرت یہ تیرا انتظام — مار ڈالا جب مجھے جینے کے قابل کر دیا

سو گئے سیماب اہلِ بزم، شمعیں بجھ گئیں
ہم نے آخر مختصر افسانۂ دل کر دیا

خاک سے پا کے نمو، خاک میں پنہاں ہونا — سچ تو یہ ہے کہ عجب کھیل ہے انساں ہونا

پہلے خود جلوہ فروزِ دلِ انساں ہونا — پھر اُسی کی نگہِ شوق سے پنہاں ہونا

اس مصیبت کا نہیں کوئی مداوا نہ علاج — کیا بُرا روگ ہے دل دیکھ کے پریشاں ہونا

اک قیامت تھا مرے عالمِ غربت کے لئے — رنگِ حسرت کا شفق بن کے نمایاں ہونا

گردِ صحرائے مصیبت کا خدا حافظ ہے — چاہتی ہے یہ لباسِ تنِ عریاں ہونا

وہ رگِ گل ہو کہ ہو آئینہ زارِ شبنم — انھیں ہر رنگ سے آتا ہے نمایاں ہونا

کھولدیں عبرتِ انجام نے آنکھیں سیماب
میں سمجھتا تھا بڑی چیز ہے انساں ہونا

بیٹھ کر بزم میں مسرور مرا دل نہ ہوا — جس سے محفل تھی وہی رونقِ محفل نہ ہوا

سببِ تلخیٔ احباب مرا دل نہ ہوا — سرگراں ہو کے بھی بارِ سرِ محفل نہ ہوا

ہاں غلط قصۂ الفت۔ مگر افسوس یہ ہے تیرے پہلو میں مرا درد بھرا دل نہ ہوا
بحر امید میں وہ تختۂ سوزاں تھا میں جل بجھا اور چراغ سر ساحل نہ ہوا
اور تنہائی میں ہم اس کے سوا کیا کرتے روئے دل تھام کے جب صبر بمشکل نہ ہوا
چٹکیاں بزم میں کلیوں نے بہت لیں کھل کر تبسم مگر افسردہ محفل نہ ہوا

آگ سی سینے میں ہر وقت لگی ہے سیماب
کوئی شعلہ ہوا پہلو میں مرے دل نہ ہوا!

مرا دل ہے ترے جلوؤں کی خلوت میں نہ سمجھا تھا
حقیقت یہ ہے، خود اپنی حقیقت میں نہ سمجھا تھا
تجھے سجدہ کیا تھا میں نے اک دن جوش الفت میں
یہ ہی ہو جائے گا جزو عبادت میں نہ سمجھا تھا
نظر وا ماندۂ کنہ حقیقت ہو گئی آخر
نہ آئے گا سمجھ میں راز فطرت میں نہ سمجھا تھا
گھٹائیں ہیں تو میری ہیں، ہوائیں ہیں تو میری ہیں
تجھے دلچسپ اتنا شام غربت میں نہ سمجھا تھا

دل آگاہ اے سیماب طور معرفت نکلا،
سمجھنے کی طرح اس کی حقیقت میں نہ سمجھا تھا

شوق جمال دوست جو حد سے سوا دیا آئینہ کیوں نہ مجھ کو خدا نے بنا دیا

تفصیل یہ ہے میری حیات اور موت کی
مٹی کا ایک نقش بنایا مٹا دیا

آیا مری سمجھ میں مآلِ کلیم و طور
جب سر چڑھا لیا تو نظر سے گرا دیا

دل ہی نہیں تو حسرتِ عیشِ جہاں فضول
دل کو مٹا دیا تو جہاں کو مٹا دیا

اب تک گلہ ہے طور کو برقِ جمال سے
اے دشمنِ کلیم مجھے کیوں جلا دیا!

اک نعمتِ عجیب ہے یہ منصبِ وفا
انسان کو بلا تو فرشتہ بنا دیا

سیمابؔ میری خاک بنی جامِ زرنگار
مٹی کو عشق نے اثرِ کیمیا دیا

لازم آیا انھیں پابندِ حیا ہو جانا
ہائے رسوا مری بیتابیوں کا ہو جانا

ازلی دردِ محبت کا پتہ دیتا ہے
خود بخود دل کا مرے نالہ سرا ہو جانا

اس نے پائی سندِ عشق ہوا جسکو نصیب
تمہیں دل دے کے گنہگارِ وفا ہو جانا

موت سے کم نہیں اک خوگرِ الفت کیلئے
دل سے اسبابِ تمنا کا فنا ہو جانا

جان دینے پہ جسے فخر ہو اُس سے کہدو
کچھ نہ ہونا ہے محبت میں فنا ہو جانا

صبر کر اے دلِ بیکس جو ہوا تو برباد
ابھی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا!

اُس کی قسمت پہ نہ کیوں روئے محبت سیمابؔ
جس کی قسمت میں ہو محرومِ وفا ہو جانا

شرارہ میری آہِ آتشیں کا
ستارہ بن گیا چرخِ بریں کا

گیا جھگڑا وہ جیب و آستیں کا
بھلا ہو وحشتِ خاطر نشیں کا

انھیں غم کی نوازش سے ہے انکار — خدا حافظ دلِ اندوہ گیں کا
لحد کو چاندنی سے کیا تعلق! — کرشمہ ہے مرے داغِ جبیں کا

جنونِ جستجو ہے مجھ کو سیماب
الٹ دوں گا ہر اک ذرّہ زمیں کا

تھے مجھ میں ترے جلوے۔ ایسا بھی ہوا ہوتا — تو جلوہ نگر ہوتا۔ میں جلوہ نما ہوتا
یہ جبر او کھا ہے قانونِ محبت کا — جینا جو نہ تھا جائز، مرنا تو روا ہوتا
جان اپنی اگر دے کر اس کو نہ بچا تا میں — ظاہر ہے جو انجامِ ناموسِ وفا ہوتا
تسکین محبت کے یہ دو ہی طریقے تھے — یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا
ملتی نہ زباں مجھ کو، ملتا نہ بیاں مجھ کو — پھر بھی مرے ہونٹوں پہ پیغامِ وفا ہوتا
یہ عشق کی بربادی اور یہ ترا استغنا! — اے حسن کبھی تجھ پر یہ وقت پڑا ہوتا

ضائع نہ کبھی ہوتا سیماب جو مٹتا میں
خاکسترِ الفت تھا، اکسیرِ وفا ہوتا

کاروانِ غم کا مقصودِ نظر اچھا رہا — مختصر سا، دل سے آنکھوں تک سفر اچھا رہا
جسکو ہوش آیا یہاں، اس کی خرابی آگئی — اس خرابے میں رہا جو بے خبر اچھا رہا
عمر کاٹی چین سے کنجِ قفس میں بیٹھ کر — میں تو اے بے چارگی بے بال و پر اچھا رہا
صورتِ تصویر اک پتلی میں سو جلوے رہے — آئینے سے، دیدۂ حیرت نگر اچھا رہا
دستِ گلچیں سے بچا سنگِ حوادث سے بچا — میں بھرے گلشن میں بے برگ و ثمر اچھا رہا

رات بھر بیٹھا رہا محفل میں ہم پہلوئے دوست
گو رہا سب کی نگاہوں میں، مگر اچھا رہا

تھی نگاہِ حسن اے سیماب گرمِ امتحاں
یہ تماشا بھی فرازِ طور پر اچھا رہا!

تجھے ہم نے جو اپنا دوست اے بیداد گر جانا
تو کیا جانِ وفا شیوہ کا دشمن جان کر جانا؟

وہ تیرا انتظار، اور وہ دلِ بے صبر کی وحشت!
ہزاروں بار اُٹھنا اور اُٹھ کر تا بہ در جانا

یہ دنیا صرف اک منزل تھی وہ بھی چھوٹنے والی
جسے ہم نے کسی دھوکے سے اپنا مستقر جانا

میں جامِ مرگ پی کر بن گیا میخانۂ باقی
مبارک ہو مرے پیمانۂ ہستی کا بھر جانا

مری دانست میں یہ جاننا عینِ حقیقت تھا
کہ میں نے پھول کی ہر پنکھڑی کو نیشتر جانا

ہوا مانوس کیوں آئینہ اُن کی بزم کا مجھ سے
مجھے بھی اس نے کیا اپنی طرح حیرت نگر جانا؟

میں ہو کر خاک اے سیماب جزوِ کل ہوا آخر
مرے شیرازۂ ہستی کو راس آیا بکھر جانا

جی بہل جاتا ہے دل کا داغِ حرماں دیکھ کر
اور کیا ہوتا تماشائے گلستاں دیکھ کر

وقتِ مرگ احباب کے گریے پہ آتی ہے ہنسی
یعنی روتے ہیں مری مشکل کو آساں دیکھ کر

ہم تجھے دیکھیں نہ دیکھیں تیرے قائل ہیں ضرور
اور ہیں وہ لوگ جو لاتے ہیں ایماں دیکھ کر

دین و مذہب و ایماں کی لگا دی قید ذہنِ عشق نے
اُس کو کافر جان کر مجھ کو مسلماں دیکھ کر

طور جل کر ہو گیا سرمہ، ہوئے بے خود کلیم
میری آنکھیں کھل گئیں دیدارِ جاناں دیکھ کر

دل بھر آیا ہم نفس کیا مجھ پہ گزری کچھ نہ پوچھ
آشیاں اپنا بھرے گلشن میں ویراں دیکھ کر

دل کے پُر اسرار ہونے کا معمہ کھُل گیا
بوئے گُل کو پھول کے تہ میں نہاں دیکھ کر

حُسن اُدھر صبر آزما ہے دل اِدھر شوق آشنا
دیکھیے کیا حال ہو دیدارِ جاناں دیکھ کر

خاطرِ غمگیں کو ہے سیماب کچھ تسکین سی
کس کو رحم آیا مرا حالِ پریشاں دیکھ کر!

فصلِ گُل ہے جمع ہیں گلشن میں سامانِ بہار
تو بھی کر تکلیف اے روحِ چمن، جانِ بہار!

اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اُٹھ کر گُل فروش
چار دن کے بعد لُٹ جاتی ہے دوکانِ بہار

فرشِ گُل پہ بیٹھ کر گلبازیاں کر لے کوئی
آج اتنے پھول برسیں ابرِ بارانِ بہار

سبز سطروں میں لکھی جاتی ہے نظمِ گلستاں
سب سے پہلا پھول بنتا ہے عنوانِ بہار

ہے بہارِ دائمی فیضِ گلستانِ خلیل
میں انھیں معنوں میں ہوں سیماب مہمانِ بہار

نہ رکھنا پاؤں بھولے سے کہیں گورِ غریباں میں
نکل آئے نہ کوئی ہاتھ پابوسی کے ارماں میں

یہ کس کافر نے لیں انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاکِ داماں میں

جفاؤں کی ندامت بھی وفاؤں سے خجالت بھی
سبھی کچھ ہے تری نظروں کے اندازِ پشیماں میں

نہ تم آئے، نہ خط بھیجا، اُٹھے جھولے گیا ساون
کوئی جھولا کرے کب تک تمہارے عہد و پیماں میں

نئی تحقیق ہے وہ جلوہ فرمائے کلیسا ہے
اضافے ہونے والے ہیں مذاقِ چشمِ حیراں میں

ہوئی محسوس صبحِ حشر یہ تعبیر دنیا کی
کہ ہم اک رات جاگے تھے کسی خوابِ پریشاں میں

یہ اُچٹی اچٹی نظریں اور بھی بے چین کرتی ہیں
وہ نشتر چاہیے جو جذب ہو جائے رگِ جاں میں

تمہارے پاؤں پڑنیکے لئے بیچین ہیں رو میں — تمہارا پاؤں پڑتا ہی نہیں گو یہ غریباں میں!

کوئی سیماب سا دیوانہ شاعر تم نے دیکھا ہو
مذاق درد سے خالی نہیں اک شعر دیواں میں

کلیم وادیٔ جاں ہوں خلیل کعبۂ دل ہوں — غرض مجھ کو جہاں دیکھو وہیں میں رنگ محفل ہوں
بہ شکل ماہ آوارہ جو یوں منزل بہ منزل ہوں — میں اس ظلمت سرائے دہر میں سرگشتہ دل ہوں
مجھے عرفان کیونکر ہو کسی کا بزم ہستی میں — میں خود بیگانہ ہوں نا آشنائے رنگ محفل ہوں
تری پہچان آساں ہے اگر پہچان ہو اپنی — مصیبت تو یہ ہے اپنے لئے میں آپ مشکل ہوں
کہیں رکھتا ہوں اور پڑتا کہیں ہے پاؤں وحشت میں — مرا نقش قدم شاہد ہے میں گم کردہ منزل ہوں
نکال اے جوش وحشت قبر سے فصل بہار آئی — کہیں میں ایک گوشے میں پڑے رہنے کے قابل ہوں؟

مرے غمگیں فسانے کارنامے ہیں محبت کے
وفائے دل کی اے سیماب اک تاریخ کامل ہوں

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں — وہ بھی ملا لئے کرم بے حساب میں
لاؤں کہاں سے جام شراب و کنار نہر — کیوں چھیڑتی ہیں سرد ہوائیں شباب میں
ہمسے نہ پر غبار ہوائے خاک کوئے دوست — پلکوں سے صاف کی ہیں رہیں شباب میں
تقدیر ہی کسی کی بنا تا خدا مجھے — آتا میں جلنے کو تری بزم خواب میں
امید تیری خاک پہ بارش ہو نور کی — تھی تجھ سے چاندنی مری شام شباب میں
آ۔ اے گل فسردہ کہیں داد خواہ ہوں — تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

اٹھا ہے ابرِ میکدہ دستِ دعا کے ساتھ — اتنی برس پڑے کہ نہالوں شراب میں

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا — دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

سیماب خاک بھی نہ ملا لطفِ زندگی
مٹی ہوئی خراب جہانِ خراب میں

حشر میں آہ و اثر کے درمیاں کوئی نہیں — آج تو حدِ نظر تک آسماں کوئی نہیں

جو کہے بس سے کہے جو کچھ سنے اِس سے سُنے — آدمی کا دل ہی بہتر رازداں کوئی نہیں

میری میٹھی نیند کے دشمن تھی کل تک سینکڑوں — اب لحد میں مانعِ خوابِ گراں کوئی نہیں

کہنے سُننے سے نکل جاتا ہے کچھ دل کا بخار — ہائے وہ کم بخت جس کا رازداں کوئی نہیں!

جب نہیں کوئی تو پھر کس نے یہ دی دل سے صدا؟ — تم کسے آواز دیتے ہو یہاں کوئی نہیں؟

کامیابی کی کوئی تدبیر جب کرتا ہوں میں — یہ سمجھ لیتا ہوں سر پر آسماں کوئی نہیں

عالمِ ہو سے بھی ہے سیماب یہ عالم نیا
اب تصور میں جہاں ہم ہیں وہاں کوئی نہیں

بڑی مشکل سے کچھ تسکین کے پہلو نکلتے ہیں — جگر پھٹتا ہے، جب آنکھوں سے دو آنسو نکلتے ہیں

ہماری بے کسی یارانِ گلشن دیکھتے رہنا — کہ ہم کنجِ قفس سے بے پر و بال نکلتے ہیں

کبھی وہ دن بھی تھے گریہ ہمارا خندۂ گل تھا — مگر اب تو ہنسی کے نام سے آنسو نکلتے ہیں

تری محفل میں اپنی آمد و شد کا یہ عالم ہے — بشکلِ رنگ آتے ہیں، برنگِ بو نکلتے ہیں

چھپائے سے کہیں سیماب رازِ عشق چھپتا ہے؟

نہیں ہے درد پہلو میں تو کیوں آنسو نکلتے ہیں!

کوئی چمن نہیں ایسا جہاں بہار نہیں — مگر بہار مرے دل کو سازگار نہیں
ہوا ہوں فرطِ محبت سے بدگماں ایسا — مجھے اب اپنی نظر پر بھی اعتبار نہیں
~~تمہارے کوچے میں ہر ذرہ ایک ٹھوکر ہے — وہاں بھی پھول چڑھا دو جہاں مزار نہیں~~
وہ پوچھتے ہیں قیامت میں سب سے گھبرا کر — یہاں تو کوئی ہمارا امیدوار نہیں؟
ہو ناگوار جسے زندگی وہ مر جائے — وہ کیا کرے جسے مرنا بھی خوشگوار نہیں
شبِ فراق کرے کون میری غمخواری — میں بیقرار ہوں دنیا تو بیقرار نہیں!
میں حشر میں تری رحمت کے فیصلے پہ نثار — گناہگار ہوں پھر بھی گناہگار نہیں
زمیں مزار کے قابل کہاں تلاش کروں — میں خود ہی بعدِ فنا قابلِ مزار نہیں

ہر ایک چیز کو ہی کچھ نہ کچھ سکوں سیماب
قرار مند مری جانِ بے قرار نہیں

مجھے رسوائیاں کیوں قبر سے لے آئیں محشر میں — سکوں سب سے بڑی راحت تھی اُس زندانِ بے در میں
شبِ غم شام سے دھوکے ہی دھوکے ہیں مقدر میں — طلوعِ صبح سے پہلے اُجالا ہے مرے گھر میں
فسون و فتنہ، دو چیزیں ہیں چشمِ شعبدہ گر میں — جو تم چاہو تو دنیا کچھ سے کچھ ہو جائے دم بھر میں
تبسم میں کشش، آنکھوں میں بجلی، تیر تیور میں — معاذ اللہ، کیا کیا قوتیں ہیں حسن کافر میں
ہوئی ہیں ختم لاکھوں ہجر کی راتیں قیامت پر — مشیت ہے ابھی تک انتظامِ صبحِ محشر میں
مری فطرت وفا، اور واسطہ حسنِ جفا جو سے — غلط بھی لکھ دیا کچھ لکھنے والے نے مقدر میں

وہی میں بھی ہوں جو تم ہو، مگر اک فرق ہے پھر بھی
میں وہ قطرہ ہوں جو مل کر نمایاں ہو سمندر میں

وصالِ دوست اُدر میں، اتفاقاتِ محبت ہیں
یہ ہے وہ چیز جو شاید نہ تھی میرے مقدر میں

عبودیت بقدرِ ذوق، شایانِ نوازش ہے
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں

تو کیا سمجھے گا اے بت ساز یہ پردے کی باتیں ہیں
تراشا جس کو تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

بڑی گہری نظر سے سیر کی ہے بزمِ فطرت کی
بہت کھویا رہا ہوں چاندنی راتوں کے منظر میں

بنا لو آستانِ ناز اپنا ذرّے ذرّے کو
ابھی لاانتہا محفوظ ہیں سجدے مرے سر میں

تصور کی کرشمہ سازیاں **سیماب** لاحاصل
پڑے گی جان کیا تصویر کے خاموش پیکر میں

دل کہاں جب دل میں حسرت ہی نہیں
اب تو کچھ دل کی حقیقت ہی نہیں

تیری آنکھیں دیکھنے کی چیز ہیں
مست بھی ہیں خوبصورت ہی نہیں

زندگی کی مُہلتیں معلوم ہیں
مجھ کو مرنے کی تو فرصت ہی نہیں

صبر و تسکیں کا مجھے طعنہ نہ دے
درد والوں کی یہ فطرت ہی نہیں

انتہائے یاس کا ممنون ہوں
اب مجھے کوئی شکایت ہی نہیں

شوق کو گنجائشیں درکار ہیں
تنگنائے دل میں وسعت ہی نہیں

دل میں اے **سیماب** سوہانِ حیات
اور بھی کچھ ہے محبت ہی نہیں

کیا سعیٔ عشق، عشق کے قابل تو کوئی ہو
دلبر بہت ہیں، نازکشِ دل تو کوئی ہو

آئیں نظر ہزار طرح کی تجلّیاں،　　مصروفِ سیرِ جلوہ گہہِ دل تو کوئی ہو
گونجیں صدائے درد سے دنیا کی محفلیں　　شامِ فراق زخمہ زنِ دل تو کوئی ہو
رسوا کنِ تخیّلِ مجنوں ہزار ہیں　　پردہ کشائے لیلیِٰ محمل تو کوئی ہو
میرا کوئی انیس نہیں تو نہیں سہی　　یارب شریکِ بیکسیِ دل تو کوئی ہو
آتی نہیں پھر آج مرے کارواں کو نیند　　ہاں قصہ خوانِ فسانۂ منزل تو کوئی ہو!

ضبطِ دل و نظر کا ابھی سے سوال کیا
سیماب پہلے رونقِ محفل تو کوئی ہو

اہلِ دل سے نام کا پردہ ہی یا پردے میں ہو　　کیوں نہیں دیتے جواب صاف کیا پردے میں ہو؟
یہ تصوّر کا کرم ہے، یہ تجلّی کا ستم　　ہم نہ ہوں لیکن نگاہِ آشنا پردے میں ہو
فائدہ شرمِ حضوری سے اٹھاتے ہیں گناہ　　پھر وہ بندہ کیا کرے جسکا خدا پردے میں ہو؟
ہاں فریبِ پردہ سے ہشیار اے اہلِ نظر　　پردہ پردہ ہی تو ہے، کیا جانے کیا پردے میں ہو
رسمِ پردہ بھی محبت میں انوکھا جبر ہے　　ہائے وہ مجبور، جس کا مدعا پردے میں ہو
لطف تو جب ہے کہ ہو تجھ کو تمنا دید کی　　اور تیری طرح کوئی دوسرا پردے میں ہو
آرزو کا وہ اثر بھی دیکھنے کی چیز ہے　　جس اثر سے کوئی گھبرایا ہوا پردے میں ہو
تجھ کو در پردہ سمجھ کر ہو رہا ہوں بے قرار　　کیا تماشا ہو جو کوئی دوسرا پردے میں ہو

ہم کو پردہ تھام کر فریاد کرنے سے غرض
کوئی پردے میں نہ ہو سیماب یا پردے میں ہو

وہ کن لفظوں میں صرفِ التجا ہو
جو خود ناآشنائے مدعا ہو

اسیرِ عقدۂ ہستی وہ کیا ہو
کہ جس کا ہر نفس تفسیرِ "لا" ہو

اب اُس سے کوئی کیا عہدہ برآ ہو
جو دل میں بیٹھ کر دل مانگتا ہو

پڑھیں تاریخِ کعبہ دیر والے
یہی بتخانہ کل کیا جانے کیا ہو

سبکدوشِ نظامِ آشیاں ہیں
الٰہی برق و باراں کا بھلا ہو

وہ کیوں آئے فریبِ ابتدا میں
جسے معلوم اپنی انتہا ہو

لبِ رنگین و چشمِ کیف انگیز
اسی عنوان سے تم میکدا ہو

وہیں بزمِ عزائے دل ہو قائم
جہاں خاکسترِ اہلِ وفا ہو

یہ شور ہُو، یہ جوشِ نالہ **سیماب**،
ابھی رگ کوئی کھل جائے تو کیا ہو؟

دل کو اُس کی یاد سے آباد رکھ
بھولنا اچھا نہیں ہے یاد رکھ

جبتک اُس در تک نہ پہونچوں ای فلک
میری مٹی کو یونہی برباد رکھ

ابرِ نو، ایجاد کر اے چشمِ نم
آبروئے گلشنِ ایجاد رکھ

ایک دن یہ عرش بھی ہو جائیگا
پہلے دل میں عشق کی بنیاد رکھ

حشر میں کہنا پڑے گا ای شباب
اپنی ناکامی کا قصہ یاد رکھ

دل ہے اک ویرانۂ ظلمت نصیب
اپنے جلووں سے اسے آباد رکھ

ہے یہی **سیماب** آزادی بڑی

اپنے ذہن و فکر کو آزاد رکھ

ڈھونڈتی ہے فطرت کسی کو دلربائی کے لئے　　دل ترستا ہے مذاقِ آشنائی کے لئے
حسن اب تک ڈھونڈھتا ہے مصر کے بازار میں　　دامنِ یوسفؑ لباسِ پارسائی کے لئے
کیا دلِ موسیٰ تجلی کے لئے کافی نہ تھا　　طور پر کیوں آئے تم جلوہ نمائی کے لئے ؟
بھیک کے ٹکڑے نہیں شاید دل کے ٹکڑے ہوں نصیب　　روز ان کے در پہ جاتا ہوں گدائی کے لئے
مشکلوں سے میری قسمت کو ملی تھی تیرگی　　وہ بھی حصہ ہو گئی شامِ جدائی کے لئے !
گوشۂ تربت میں کچھ ٹکڑے دلِ مجروح کے　　رکھ لئے ہیں تیری جور آزمائی کے لئے

حسن بیحد اور اے سیمابؔ اک محدود دل
ظرفِ دریا کاش ملتا آشنائی کے لئے

پیمانۂ الفت میں تدبیر نظر آئی　　تدبیر سے کچھ آگے تقدیر نظر آئی
وحشت کی بہاروں میں تاثیر نظر آئی　　پھولوں کی جو رگ ابھری زنجیر نظر آئی
بس ہنس کے کئے سجدے رو رو کے لئے بوسے　　دیوانوں کو جب اپنی زنجیر نظر آئی
پروانوں کا طوفانِ جلوہ طلبی توبہ!　　ہر شمع پریشانِ تنویر نظر آئی
ہر سلسلۂ وحشت اک ربطِ مسلسل تھا　　زنجیر سے پیوستہ زنجیر نظر آئی
جب اپنے تصور کو معدوم کیا میں نے　　ہر آئینے میں تیری تصویر نظر آئی

سیمابؔ زہے مستی! میخوارِ حقیقت کو
خاکِ درِ میخانہ اکسیر نظر آئی

یہ تصور کوششیاں ہیں خاطرِ دلگیر کی　　منہ سے بول اٹھی ہے خاموشی تری تصویر کی
میری آوارہ نصیبی حسنِ وحشت ہو گئی　　آبروئے عشق تھیں رسوائیاں تقدیر کی
گو جگر پر داغ ہے گو دل میں لاکھوں زخم ہیں　　پھر بھی ہے سینے میں گنجائش تمہارے تیر کی
ترجمانِ صد سکوں تھا تیرا اندازِ سکوں　　جانے کیا کچھ کہہ گئیں خاموشیاں تصویر کی
دل کے سو ٹکڑے لئے بیٹھی ہے حسرت گود میں　　آج بزمِ درد میں دعوت ہے کس کے تیر کی؟
کیا قیامت تھی ترے حسنِ تبسم کی ادا　　مسکرا کر رہ گئی افسردگی تقدیر کی
سب یہ تیرے عکس ہیں دنیا میں ہیں جتنے حسیں　　جتنی تصویریں ہیں نقلیں ہیں تری تصویر کی
ضبط کے پردے پڑے ہیں اور خلش ہے پاسباں　　دل کا ہر ٹکڑا ہے خلوت گاہ تیرے تیر کی
اے جنوں وحشت نصیبی سے میں اپنی تنگ ہوں　　دھجیاں اب کے اڑا دے دامنِ تقدیر کی
اڑ گئی کاغذ سے میرے دل میں چسپاں ہو گئی　　دیکھنے کی چیز ہیں دلچسپیاں تصویر کی

اکبر آبادی ہوں اے سیماب میرے شعر میں
رنگ غالب کا ہے شوخی ہے زبانِ میر کی

رہی بالا نشیں افتاد میری　　فلک پرواز ہے فریاد میری
وفا انجام ہے مرگِ محبت　　انہیں کرنی پڑے گی یاد میری
فریبِ عشرتِ فردوس معلوم　　نہ بہلی خاطرِ ناشاد میری
کچھ اتنا مختصر تھا حشر کا دن　　کہ باقی رہ گئی روداد میری
نوید امن دو فرصت آندھیوں کو　　کہ مٹی ہو چکی برباد میری

قفس میں ہوں مگر کرتی ہے اکثر — طوافِ آشیاں فریاد میری

یہ ذوقِ حشر میں سننے کی باتیں — فسانہ آپ کا روداد میری

جنوں کے جوش میں نکلی جو سیماب

تماشا بن گئی فریاد میری

وفا کی میں نے بنیاد آج زیرِ آسماں رکھ دی

جہاں تھا سنگِ در تیرا جبیں اپنی وہاں رکھ دی

یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی

کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

خدائی کی خوشی اپنی خوشی پر چھوڑ دی اس نے

مراد کر آگیا تو میری قسمت درمیاں رکھ دی

سنا تھا قصہ خواں کوئی نیا قصہ سنائے گا

ہمارے منہ پہ ظالم نے ہماری داستاں رکھ دی

خدا کے سامنے بھی چل گئے ہم چال محشر میں

بجائے نامۂ اعمال دل کی داستاں رکھ دی

خلوصِ دل سے سجدہ ہو تو اس سجدے کا کیا کہنا

وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

اٹھایا میں نے شامِ ہجر لطفِ گفتگو کیا کیا

تصور نے تری تصویر کے مُنہ میں زباں رکھ دی

بگولے لے گئے تھے وحشیٔ مرحوم غربت کو
انھیں سے پوچھ لو میت کہاں پھینکی کہاں رکھ دی

شکستہ پائی کا سیماب درماں اور کیا کرتے
پڑے چھالے تو اُن پر گردِ راہِ کارواں رکھ دی

اب کیا بتاؤں عمرِ دو فا کیوں خراب کی ۔۔۔ نوحہ ہے زندگی کا کہانی شباب کی

تم نے خبر نہ لی مرے حالِ خراب کی ۔۔۔ کالی ہوئیں فراق میں راتیں شباب کی

تھی الوداعِ ہوش تجلّی مختصر ۔۔۔ میرا تو کام کر گئی جنبش نقاب کی

وہ میرے ساتھ ساتھ مجسّم ترا خیال! ۔۔۔ وہ جنگلوں میں سیر شبِ ماہتاب کی!

ممنون ہوں تری نگہِ بے نیاز کا ۔۔۔ رسوائیاں تو ہیں مرے حالِ خراب کی

میں اپنی جلوہ گاہِ تصور سجاؤنگا ۔۔۔ تصویر کھینچ دے کوئی اُن کے شباب کی

دیدو غبارِ دل میں ذرا سی جگہ ہمیں ۔۔۔ تربت بنائیں گے دلِ خانہ خراب کی

گھبرا کے جس سے چیخ اُٹھا عالمِ وجود ۔۔۔ وہ چیز دل نے میرے لئے انتخاب کی

چمکیں تو خوفناک، گریں تو حیات سوز ۔۔۔ ساون کی بجلیاں ہیں نگاہیں عتاب کی

سیماب زندگی کی ہے تاریخ ہر غزل
ہر شعر میں ہے ایک کہانی شباب کی

نوائے دردِ شامِ غم نہ کیوں اندوہ گیں ہوتی ۔۔۔ یہ ہے وہ نغمۂ خاموش جس میں لے نہیں ہوتی

تغافل سے وہاں دل کی پذیرائی نہیں ہوتی — یہاں یہ آرزو تربت بھی ہوتی تو نہیں ہوتی
وفا سے تم کو مطلب کیا، یہ دیوانوں کا حصہ ہے — خدا حسنِ وفا دیتا تو صورت کیوں حسیں ہوتی
گواہی خون کے دھبوں سے محشر میں تو دلوائی — خدا کے سامنے کیا ہاتھ بھر کی آستیں ہوتی
اگر اے حسن فطرت میں تری ہوتی وفا کیشی — تو دشتِ نجد میں مجنوں کی لیلیٰ جانشیں ہوتی
نہ ہو جاتی جو دامن گیر وحشت موسمِ گل میں — تو کیا اس طرح دو ہاتھوں میں آدھی آستیں ہوتی!

ہم اے **سیماب** مٹ کر بھی رہے عنوانِ میخانہ
یہ وہ مٹی نہ تھی جو گل کے پیمانہ نشیں ہوتی

کششِ دل انھیں چلمن میں تو لے آئی ہے — آگے اب حوصلۂ چشمِ تماشائی ہے
عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے — جستجو تیری بڑی بھیڑ میں لے آئی ہے
نگہِ ناز سے ناسور ہوا ہے پیدا — آنکھ کی چوٹ کلیجے پہ ابھر آئی ہے
میری امید تجھے گلشنِ جنت ہو نصیب! — تو جوانی میں بہت کچھ مرے کام آئی ہے

دیکھیے خلد میں سیماب کی راحت طلبی
زانوئے حور پہ کیا چین سے نیند آئی ہے

وہ دن آئے کہ حیرانِ رخِ رعنا کرے کوئی — وہ آئینہ بنوں میں بھی کہ منہ دیکھا کرے کوئی!
نیازِ عشق میں نازش اگر پیدا کرے کوئی — وہیں سو عرش پیدا ہوں جہاں سجدا کرے کوئی
ہوا کرتی ہے ہر منظر میں ناظر کی رعنائی — جسے دیکھا کرے کوئی اسے دیکھا کرے کوئی
پیامِ خوابِ اجل مجھ کو نہ دے آغوشِ مدفن میں — پھر اٹھنا ہے، ذرا سی دیر سو کر کیا کرے کوئی

مذاقِ آرزومندی بھی اک نعمت ہے دنیا میں — اگر دل ہو تو دل میں آرزو پیدا کرے کوئی

تصور میں بھی جن کی ضوفشانی ہو نہیں سکتی — وہ جلوے کیا بہ امکانِ نظر پیدا کرے کوئی

نہ موسیٰ ہیں، نہ کوہِ طور کی وہ شعلہ سامانی — یہ عالم ہے تو پھر عزمِ تجلّی کیا کرے کوئی

وبالِ زیست آخر اور بھی دنیا کے جھگڑے ہیں — تنگ ہو گئے اے بارِ محبت کیا کرے کوئی

چھپا لے قطرہ ہائے خونِ منصور اے زمیں جلدی — کہیں ایسا نہ ہو رازِ اناؔ افشا کرے کوئی

ضعیفی میں مرا یادِ جوانی سے یہ مقصد ہے — کہ اس بھولے ہوئے قصے میں یاد آیا کرے کوئی

دلِ بیتاب گھبرا کر جو پہلو سے نکل آیا — خیالِ یار چلایا مرا پردا کرے کوئی

ہمیں تو مار ڈالا کثرتِ حسنِ تصور نے — اِدھر بھی تو اُدھر بھی تو کدھر سجدا کرے کوئی

جس آئینے میں ہے سیمابؔ اتنی جستجو اُس کی،
اُس آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھا کرے کوئی

کب تک دلِ مایوس کو برباد کرینگے — اب ہم تری امید سے فریاد کرینگے

کعبے پہ ہی موقوف نہیں ضد ہی بتوں کو — جس گھر میں رہیں گے اُسے برباد کرینگے

یکسوئی سے بیٹھیں گے تو اے خلوتِ زنداں — تدبیرِ سکونِ دلِ ناشاد کرینگے

فریاد کی محشر میں نہ رکھ ہم سے تو امید — جلوے ترے لوٹیں گے کہ فریاد کرینگے

سیمابؔ مری قدر کریں یا نہ کریں آج
مرنے پہ ضرور اہلِ وطن یاد کرینگے

محبت میں خودی، حدِ جہانِ بے خودی ہوگی — وہ عالم دوسرا ہوگا، وہ دنیا دوسری ہوگی

بڑی دلچسپیوں سے صبحِ شامِ زندگی ہوگی
میں دیکھوں گا انھیں اور ساری دنیا دیکھتی ہوگی

فضائے دل میں نشتر ہے تڑپ دردِ تمنا کی
بس اتنی کو زندگی ہوگی جو بجلی کوندتی ہوگی

ادا یوں تیرے کوچے میں نمازِ بیخودی ہوگی
کہ اک دنیا کی دنیا تجھ کو سجدے کر رہی ہوگی

نہ مرتا زندگی پر میں اگر پہلے سمجھ لیتا
کہ صبحِ حشر کا عنوان شامِ زندگی ہوگی

کچھ ایسے درد سے فرقت میں میں نے ہاتھ اٹھائے ہیں
دعا بھی کامیابی کی دعائیں مانگتی ہوگی

سرِ محشر حجاب و شوق کا اک معرکہ ہوگا
انھیں اپنی پڑی ہوگی مجھے اپنی پڑی ہوگی

مزا آجائے گا کچھ حشر میں سننے سنانے کا
زباں ہوگی ہماری اور کہانی آپ کی ہوگی

شرابِ آرزو پی کر نہ اٹھیں گے قیامت تک
ہمیں جب بیخودی ہوگی تو ایسی بیخودی ہوگی

نہ کرتے حشر کو رسوا کبھی دن کے اجالے میں
خبر کیا تھی تری فرقت کی رات اتنی بڑی ہوگی!

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے میں
ہزاروں دل میں انگارے بھرے تھے لگ گئی ہوگی

جدھر دیکھو ادھر جنت میں حسنِ جاودانی ہے
الٰہی کیا یہاں میری بھی گم گشتہ جوانی ہے؟

لحد میں کیا اٹھاؤں سر، خمارِ زندگانی ہے
خمارِ زندگانی ہے کہ اب تک سر گرانی ہے

کہانی کہنے والے، ہائے کیونکر جوانی ہے
جوانی کی کہانی کیا، جوانی خود کہانی ہے

عجب دلچسپ اک نیرنگ میری زندگانی ہے
کسی عالم میں باقی ہے کسی عالم میں فانی ہے

کھچا جائے جہاں تک تم سے کچھ کر بیٹھ جاؤ تم
ہمیں آج اپنے جذبِ دل کی قوت آزمانی ہے

فنا دراصل ہے جذبات کا افسردہ ہو جانا
نہ میرا عشق فانی ہے نہ تیرا حسن فانی ہے

مرا رونا ہی طوفانی ہے مجھے تم کیوں ڈراتے ہو — سمجھ لینا کہ دل سے آنکھ تک پانی ہی پانی ہے
عجب اک نشہ ہے کیف جوانی جسکو کہتے ہیں — جدھر اب آنکھ اٹھتی ہے جوانی ہی جوانی ہے
حیات نو ہے میرا ہر نفس عمر محبت میں — غم یک لحظہ بھی مجھ کو نشاط جاودانی ہے
تغافل پیشگی آخر مجھے مایوس کیوں کر دے — ابھی تیری حقیقت میں مذاق داستانی ہے

پھر آخر بتکدہ سے آگیا سیماب مسجد میں
وہی پھر سجدہ بازی ہے وہی تسبیح خوانی ہے

واقف نہ ہو کوئی مرے حال تباہ سے — چھپنا پڑا ہے خود مجھے اپنی نگاہ سے
برہم کچھ اور بھی وہ ہوئے عذر خواہ سے — عذر گناہ ہو گیا بدتر گناہ سے
ساقی نہ کر ملول مجھے، مانگتا ہوں میں — اک جام!- وہ بھی تیری نشیلی نگاہ سے
میری فغان نیم شبی کیا قبول ہو — رہتی ہے دور دور تری خوابگاہ سے
ہوتی ذلیل تنزل غربت میں میری لاش — لیکن ہوئی نہ پردہ دری گرد راہ سے
محشر میں سب کے سامنے رسوا نہ ہو کوئی، — اے آرزو ابھی نہ ٹپکنا نگاہ سے
کیا ڈھونڈتے ہو مدفن بربادگان عشق — مٹی کے چند ڈھیر ہیں وہ بھی تباہ سے!
میری نظر سے تم مجھے دیکھو تو لطف ہے — کچھ دیر کو نگاہ بدل لو نگاہ سے
واعظ تعلقات کرم پر مجھے ہے ناز — تو نیکیاں بھی دے تو نہ بدلوں گناہ سے
حد سے گذر گئی ہے تمنا بھری نظر — کوسوں نکل گئی ہے تری جلوہ گاہ سے
کیا جانے دل کا خون ہوا، یا جگر جلا — آنسو کچھ آج سرخ سے ہیں کچھ سیاہ سے

بزمِ جہاں میں شمع کو جلنے سے کام ہے　　کیسی لگی ہے آگ پتنگوں کی آہ سے

یہ کوہ و دشت اور یہ ہمراہِ موسیٰ کلیمؔ!　　یارب گرے نہ کوئی کسی کی نگاہ سے!

ملتی ہے اہلِ حسن سے یوں عشق کی نگاہ　　جیسے کوئی فقیر ملے بادشاہ سے!

سیمابؔ کم ہو تیرگئ شامِ زندگی
کوئی گھٹا اُٹھے مرے بختِ سیاہ سے

حیرتِ جلوہ گری مُہرِ لبِ خاموش ہے　　آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے

جوشِ عصیاں سے زیادہ رحمتوں میں جوش ہے　　میں ندامت کوش ہوں مولا ندامت پوش ہے

بے سوالی پر مری آخر انھیں رحم آگیا　　حسرتِ دیدار ممنونِ لبِ خاموش ہے

جوش پر ہے جلوۂ مستانۂ عہدِ شباب　　او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے!

قصرِ کسریٰ، چترِ دارا، تختِ نادر، بزمِ جم　　ہائے وہ عالم کہ جو زیرِ زمیں روپوش ہے

پوچھتا کیا ہے مآلِ باریابئ نگاہ،　　کھوگئے خود ہی تری جلووں کا کس کو ہوش ہے!

تیری زلفیں بھی نہ نکلی تھیں سوادِ حسن سے　　حسرتِ آوارہ جب سے خانماں بردوش ہے

دیکھنا محویتِ لطفِ شکرِ خوابِ خیال　　جیسے کوئی فی الحقیقت گرمئ آغوش ہے

ہم ملے تھے ایک دن سیمابؔ سے یادش بخیر!
آدمی خوش فکر ہے - خوش وضع ہے - خوش پوش ہے

کیوں ہنسی تو اے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے　　ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!

راہِ تاریکِ طلب میں دیکھ کر تنہا مجھے　　دُور سے موسیٰ دکھاتے ہیں یدِ بیضا مجھے

غم مجھے، حسرت مجھے، وحشت مجھے، سودا مجھے
ایک دل دیکر خدا نے دیدیا کیا کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

گرمیٔ محفل رہا میں سوز و سازِ عشق سے
کوئی شمعِ بزم سمجھا کوئی پروانا مجھے

یہ نمازِ عشق ہے کیسا ادب، کسکا ادب!
اپنے پائے ناز پر کرنے بھی دو سجدا مجھے

دین ہے اُس کی سمجھ کر تیرے کوچے کا فقیر
خاک کے ذرّوں میں دیدی دولتِ دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

کیا خرامِ طور کا دیگا یدِ بیضا ثبوت
حضرت موسیٰ دکھائیں پاؤں میں چھالا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیئے
آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

جلوہ گر ہے اس میں اے سیمابؔ اک دنیائے حسن
جامِ جم سے ہے زیادہ دل کا آئینا مجھے

موجزن کیا آفتابِ صبح پیمانے میں ہے
آج کچھ بھیگی ہوئی سی دھوپ میخانے میں ہے

حق بجانب شمع کی مانند جل جانے میں ہے
کچھ محبت ہو تو کچھ غیرت بھی پروانے میں ہے

کوئی پروانوں کی خاکستر سے دیتا ہے پیام
زندگی کا لطف جل کر خاک ہو جانے میں ہے

مجھ سے پوچھ اے قیس اب نیرنگیٔ جوشِ جنوں
تیرے ویرانے میں تھا اور میرے ویرانے میں ہے

ہے مری افسردگی دیباچۂ صبحِ چمن
بن کھلی کلیوں کا عالم دل کے مرجھانے میں ہے

سب کے حصے میں نہیں لذت شرابِ عشق کی
جس کے پیمانے میں ہو یہ اُسکے پیمانے میں ہے

اک نہ اک دن بیٹھ جائیگا گلا ناقوس کا — ہر طرف سیندور ہی سیندور بتخانے میں ہے
سیر ہو نیت تو دیتا ہے خدا بھی برکتیں — جتنی پی لی ہے ابھی اتنی ہی پیمانے میں ہے

اہلِ محفل محو ہیں سیماب دل تھامے ہوئے
کسقدر رومان میرے غم کے افسانے میں ہے

اس درجہ شغلِ روح تری بندگی رہی — مرنے کے بعد بھی مری نیّت بندھی رہی
اللہ رے مذاقِ محبت ترے فریب — انسانیت کے بھیس میں دیوانگی رہی
مجبورِ اعتقاد رہا گو ترا وجود — پھر بھی مری نگاہ تجھے دیکھتی رہی
ارمان میں نے دفن کئے گردِ یاس میں — پچھلے پہر غبار سی جب چاندنی رہی
میں باوجودِ علم رہا صیدِ التفات — کیا کیا مجھے فریب سے دلبستگی رہی
نیرنگ دیکھئے شفقِ گل کے شامِ ہجر — اک آگ سی فضائے نظر میں لگی رہی
آئے ہزار گردشِ دوراں سے انقلاب — لیکن میں کیا کروں مری دنیا وہی رہی

اب تو وداع ہوتے ہیں یارانِ بزم سے
سیماب پھر ملیں گے، اگر زندگی رہی

موجوں میں نفس کی جو تری یاد بھری ہے — ہر آہ دمِ صبح، نسیمِ سحری ہے
اک بار جسے دیکھ لیا، کیا اُسے دیکھوں — جلوہ جو گذرتا ہے نظر سے نظری ہے
میں سوزِ محبت میں جلا، جل کے ہوا راکھ — اور اب بھی مرے دل میں دبی آگ بھری ہے
اے حسن مرے ذوقِ تماشا کو نہ دے طعن — اب تجھ میں کہاں حوصلۂ جلوہ گری ہے؟

لایا ہے اُنھیں کوئی پھر آغوشِ نظر تک		معلوم نہیں ہوش ہے یا بے خبری ہے!
ہر شام جنوں ساز ہے ہر صبح جنوں خیز		کیا چیز مرا موسمِ شوریدہ سری ہے!
سیمابؔ وہ معمور ہے پہنائے نظر میں
میں اُس کو نہ دیکھوں یہ مری کم نظری ہے

حشر میں بھی ستمِ حسن کی پرسش نہ ہوئی		ہم بھی کچھ کہتے، مگر تابِ گذارش نہ ہوئی
مجھے دیتی رہی یک گونہ محبت کا ثبوت		وہ نظر تیری جو مرہونِ گذارش نہ ہوئی
غمِ پیہم سے مری روح گھُلی جاتی ہے		اک مصیبت ہوئی ذرات کی، کاہش نہ ہوئی
سب ترستے ہیں محبت کی پذیرائی کو		یہی اک چیز وہ تھی جس کی نوازش نہ ہوئی
بے خودی میں بھی نہ بھولا میں رہِ منزلِ دوست		سرخوشی میں بھی مرے پاؤں کو لغزش نہ ہوئی
اِس طرح ہم تو ہمیشہ رہے محرومِ شراب		کبھی آئی نہ میسر، کبھی خواہش نہ ہوئی
کہہ گئے اُن سے ہم افسانۂ غم اے سیمابؔ
اور بالکل لبِ خاموش کو جنبش نہ ہوئی

حسن کے دل میں جگہ پاتے ہی دیوانہ بنے		ہم ابھی راز بنے ہی تھے کہ افسانہ بنے
ذرّے ذرّے میں ہے اک شعلۂ پرواز مگر		ہو کشش گرمیٔ محفل کی تو پروانہ بنے
نہ پھریں مست نگاہیں تو پیے کون شراب؟		نہ تری آنکھ میں گردش ہو نہ پیمانہ بنے
کہدیا ہے کہ تو ہم سے تو یک سُو ہو کر		اب نبھے یا نہ نبھے اُن سے بنے یا نہ بنے
حسن ہشیار ہی ہوتا نہیں دیوانۂ ہوش		جسے دیوانہ بنانا ہو وہ دیوانہ بنے

جانبِ میکدہ کیوں آنکھ اُٹھا کر دیکھوں　　جب لبوں میں ترے میرے لئے میخانہ بنے
آج وہ بزم میں خود شمع بنے بیٹھے ہیں،　　ہے کوئی مدعیٔ سوز جو پروانہ بنے؟
دلِ آزردہ ہے لبریز حدیثِ غمِ عشق　　میں اگر چاہوں تو ہر سانس اک افسانہ بنے
حرمِ دل میں پرستش تری موقوف ہوئی　　خود پرستی کے لئے کعبۂ و بتخانہ بنے
دور بیٹھے ہوئے جلتے ہیں تو جلنے دو ہمیں　　کس کی قسمت کہ چراغِ درِ جانانہ بنے

کتنے دیوانے محبت میں مٹے ہیں سیماب
جمع کی جائے جو خاک ان کی تو ویرانہ بنے

موجِ ناتمام

کبھی جو اپنی جفاؤں سے منفعل نہ ہوا — مری وفاؤں سے وہ شرمسار کیا ہوگا
ابھی سے یاس کلیجہ بٹھائے دیتی ہے — الٰہی تا سحرِ انتظار کیا ہوگا؟
جو روز روز محبت میں موت آئیگی، — تو بار بار کوئی سوگوار کیا ہوگا
یہی فلک ہے تو مٹجائیگا نشاں میرا — یہی زمیں ہے تو اس پر مزار کیا ہوگا؟

ناقابلِ یک آہ ہے دل ٹوٹ پھوٹ کر — خمیازۂ شکستگیِ ساز دیکھنا
ہیں فرشِ خاک پہ کفن ہیں، کفن میں ہم — لوگو ہماری خوابِ گہِ ناز دیکھنا
شاخِ نہالِ طور سہی شاخِ نخلِ گل — پر کھول لوں تو پھر مری پرواز دیکھنا

جس طرح شیشۂ شفاف سے جھلکے مئے ناب — پسِ پردہ بھی ترا رنگ جھلکتا ہی رہا
اشکِ حسرت نہ سہی حسرتِ دیدار سہی، — کچھ نہ کچھ چشمِ تمنا سے ٹپکتا ہی رہا

مرا سجدۂ مسلسل ہے عبادتِ محبت　　کبھی سر اُٹھا ہی لیتا جو سرِ نماز ہوتا
غمِ زندگی سے مجھ کو نہ کبھی نجات ملتی　　جو نصیب میں نہ میرے غمِ جانگداز ہوتا

چراغِ داغِ عصیاں کی جگہ تجویز کرنی ہے　　کہاں تک پھیلنا ہے رحمتِ بالیدہ داماں کو
بغیرِ قصدِ نغمے روح کے تا صبح سنتا ہوں　　حجابِ شب میں کوئی چھیڑ دیتا ہے رگِ جاں کو

شورش کدۂ حشر کہاں، اور کہاں میں!　　یہ دیکھنے آیا ہوں، یہاں تُو تو نہیں ہے

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

سیمابؔ

سیماب اکبرآبادی
بعمر ۲۲ سال

۷۵۹

صہبائے کہن

گہرائیوں میں روح کی عالم ہے نور کا	شاید یہ وقت خاص ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ بھی تابِ جلوۂ جاناں نہ لا سکے	جل بجھ کے رہ گیا تو یہ تھا ظرف طور کا
ساقی نے مجھ کو خوگرِ بادہ بنا دیا	دن رات ذکر کرکے شرابِ طہور کا
موسیٰ سے تھے جن کو طور پہ تم نے بُلا لیا	ہم پاس بھی نہ جائیں کہ ہو حکم "دُور" کا
اُس روئے آتشیں پہ رہے کس طرح نقاب	رکھتی ہے تابِ حُسن اثر برقِ طُور کا
کعبے سے کیا غرض تجھے دل میں نہ دیکھ لیں	کیوں پھیر کھا کے جائیں وہ رستہ ہی دُور کا

سیماب مثلِ بادہ چھلکتے ہیں اشکِ خوں
آنکھیں مری جواب ہیں جامِ بلور کا

نامہ کوئی گیا نہ کوئی نامہ بر گیا	تیری خبر نہ آئی زمانہ گزر گیا
جنت بھی خوب بھر گئی دوزخ بھی بھر گیا	جوشِ جنوں بتائے مجھے میں کدھر گیا؟
ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں	روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

شیرازہ بندیٔ دلِ صد چاک ہو چکی — میں تو وہ ہار ہوں جو گندھا اور بکھر گیا
جی سے غمِ جہاں ہی سن لے زندگی پرست — جی سے گذر گیا تو جہاں سے گزر گیا
اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے — دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا
تجھ سے شبابِ رفتہ میں اب کیا گلہ کروں — کم بخت خود لٹا مجھے برباد کر گیا
میں ننگِ کائنات کہ مجھ سے ملا نہ تو — تو نازشِ حیات کہ میں تجھ پہ مر گیا

سیماب اب تو عمر کے دن کر رہا ہوں تیر
تھی جس میں زندگی وہ زمانہ گزر گیا

ہلکا سا اک کفن ہو شہیدِ بہار کا — سایہ ہی ڈال دو کسی سیماب وار کا
جو پھول گر پڑا ہے کہیں اُنکے ہار کا — غازہ بنا ہے چہرۂ صبحِ بہار کا
جب میری بیکسی پہ بہت روئی وقتِ صبح — شبنم نے منھ دھلا دیا شمعِ مزار کا
آنکھوں کو اپنی چوم لوں امکان ہو اگر — ان میں مزہ بھرا ہے ترے انتظار کا
کس کی شمیمِ زلف اُڑا لائی ہے کہ آج — ملتا نہیں مزاج نسیمِ بہار کا
بن جائے میری قبر پہ تعویذ کی جگہ — چھوٹا سا اک مزار دلِ بے قرار کا
دل میں بنا ہوا ہے تری دید کا خیال — آنکھوں میں گھر بنا ہے ترے انتظار کا

سیماب کیا شگوفہ نیا دیکھیے کھلے
اب کے کچھ اور رنگ ہے فصلِ بہار کا

پر تو سے تیرے رخ کے یہ رنگ ہے چمن کا — ہر پھول بن گیا ہے آئینہ انجمن کا

حال اپنا کیا سناؤں، کیا دوں پتہ وطن کا　　اک پھول ہوں فسردہ اُجڑے ہوئے چمن کا
وقتِ وداع آیا کس نازشِ چمن کا　　پھولوں کی پتیوں میں سامان ہے کفن کا
سوزِ دروں کا عالم دونوں پر ایک سا ہے　　مجھ کو لگی کا رونا اور شمع کو لگن کا
ہے گلشنِ جہاں میں صد رنگ میری خلوت　　ہے میرے آشیاں میں تنکا چمن چمن کا
پھر زندگی کے ہاتھوں مرنا پڑے نہ مجھ کو　　اُٹھا ہوں حشر کے دن منہ دیکھ کر کفن کا

سیماب ہے یہ فیضِ بیداریٔ شبِ غم
مہمانِ مستقل ہوں تاروں کی انجمن کا

تری ٹھوکروں میں ظالم جو مرا مزار ہوتا　　مری خاکساریوں کو نہ کبھی غبار ہوتا
نہ کیا خدا سے شکوہ کہ وہ شرمسار ہوتا　　جو وہ شرمسار ہوتا مجھے ناگوار ہوتا
وہ نہ تھی جو میرے بس میں تو اسی پہ زور چلتا　　مرے دل پہ کاش یارب مجھے اختیار ہوتا
کبھی خاک ہی میں مل کر مری آرزو نکلتی　　جسے آپ نے مٹایا وہ مرا مزار ہوتا
جو نگاہِ مست ساقی کبھی میکدے پہ پڑتی　　تو کہیں صراحی ہوتی کہیں بادہ خوار ہوتا
یہ گھٹائیں کالی کالی یہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی　　مجھے خوشگوار ہوتیں۔ جو وہ نوبہار ہوتا

نہ اُٹھانے دیتے سیماب اسی ناز ہم کسی کے
اگر اپنے دل پہ کچھ بھی ہمیں اختیار ہوتا

دل تڑپ جائے نہ کیوں دیکھ کر انسانوں کا　　عبرت و یاس ہے عنواں مرے افسانوں کا
یہ خزانہ تھا کبھی عیش کے سامانوں کا　　اب تو مدفن دلِ برباد ہے ارمانوں کا

مشربِ قیس کی ترویج نہ کی دنیا نے — کبھی میلہ نہ لگا نجد میں دیوانوں کا
یوں تو ہونے کو ہیں صحرا و چمن سب دلکش — جی بہلتا ہی نہیں تیرے پریشانوں کا
گرمئ محفلِ عشرت کا نتیجہ، تو یہ! — تھا جہاں رقص وہاں ڈھیر ہے پروانوں کا
فطرتاً ہو گئے تبدیل وہ آدابِ جنوں — چاک ہونا نہیں اب فرض گریبانوں کا

تجربے ایسے ہی کچھ تلخ ہوئے ہیں سیماب
ہیں اپنوں کا بھروسہ ہے نہ بیگانوں کا

دل کی نوائے راز میں ہوں ترجمانِ غیب — روح القدس سے سیکھی ہے میں نے زبانِ غیب
شاعر ہے اک مغنئ رنگیں بیانِ غیب — ہے اپنے دل کے ساز پہ یہ نغمہ خوانِ غیب
رونق فروزِ منزلِ دل ہیں امید و بیم — نازل ہوا ہے غیب سے یہ کاروانِ غیب
فکر و خیال و ذہن کی پرواز ہے بلند — اُڑتے ہیں بامِ عرش پہ یہ طائرانِ غیب

الہام کیوں نہ ہو دمِ فکرِ سخن مجھے
سیماب ہے زبان مری ترجمانِ غیب

دل سے ساقی نے مٹایا قلقِ جامِ شراب — رکھ دیا سامنے لاکر طبقِ جامِ شراب
ہاں پلا اتنی لطیف آج اور اتنی گہری — عین مستی میں اُتاروں ورقِ جامِ شراب
مئے گلرنگ نہیں لائقِ ہر ظرفِ رنگی — سچ تو یوں ہے کہ یہ ہے مستحقِ جامِ شراب
وجہ رنگینئ عالم یہی دو چیزیں ہیں — افقِ ساغرِ گلگوں، شفقِ جامِ شراب

بادہ خواران ہم آہنگ سے کہہ دو سیماب

یوں بہاتے ہیں زمینِ ادقِ جامِ شراب
ساقیا دے مجھے وہ جام ولائے وارثؒ
جس طرف آنکھ اُٹھاؤں نظر آئے وارثؒ

رہے آباد الٰہی یہ زمین دیوہ
ذرہ ذرہ ہے یہاں جلوہ نمائے وارثؒ

چاندنی کا ہے گماں اہلِ نظر کو کیا کیا
روضۂ پاک پہ چھائی ہے ضیائے وارثؒ

رونق افزا تھے جہاں دفن وہیں آپ ہوئے
اب کسی کے لئے خالی نہیں جائے وارثؒ

آبرو آبِ بقا کی مری نظروں میں نہیں
ہوں شہیدِ لبِ اعجاز نمائے وارثؒ

جا لگا چرخ سے یہ کون ستارہ بن کر
تھا اگر ذرۂ خاکِ کفِ پائے وارثؒ

کہیں سیمابؔ کو سب وارثِ اقلیمِ سخن
مدعا اس کا یہ برآئے برائے وارثؒ

منظور اُن کو مشقِ خدنگِ نظر ہے آج
سینہ کہاں ہے آج کلیجہ کدھر ہے آج!

دنیا سے تیرے غم میں کسی کا سفر ہے آج
او بے خبر تجھے بھی کسی کی خبر ہے آج

دستِ جنوں جو سلسلۂ جنبانِ در ہے آج　　وحشت زدہ مرا دلِ شوریدہ سر ہے آج
برخیز چارہ ساز نہیں اب امیدِ زیست　　کل سے بھی کچھ بڑھا ہوا دردِ جگر ہے آج
کھولا نگاہِ ناز نے ہر زخم کا دہن　　سینہ جوابِ خندۂ چاکِ سحر ہے آج
حسرت مقابلے کی ہے ابرِ بہار سے　　کتنا بلند حوصلۂ چشمِ تر ہے آج

سیماب اپنا عکس بھی آتا نہیں نظر
یہ کون آئینے میں مرے جلوہ گر ہے آج!

دے نئی پھر کر مجھے ساغر میں روح　　پھر مکدر ہے مرے پیکر میں روح
سجدے کو اُس آستاں پر جب جھکا　　آ گئی کھنچ کر بدن سے سر میں روح
نکلی آخر تنگنائے جسم سے　　کیوں نہ گھبراتی اندھیرے گھر میں روح
اک کھلونا ہے مرا خاکی بدن　　اک تماشا ہے مرے پیکر میں روح
جام میں مے ہو، خم بادہ میں جام　　روح میں ساغر رہے ساغر میں روح
کارفرما جلوۂ بت خانہ ہے　　ڈالدی ہے حسن نے پتھر میں روح

کون ہے سیماب ہم آغوشِ فکر
مہکی جاتی ہے مرے پیکر میں روح

بھولے سے جس نے کی نہ دلِ مبتلا کی یاد　　یادش بخیر! آئی پھر اُس بے وفا کی یاد
چھوٹوں جو بتکدے سے تو کعبے کی راہ لوں　　بھولوں میں ان بتوں کو تو آئے خدا کی یاد
کوئی مجھے سُنے تو عجب قصہ خواں ہوں میں　　لاکھوں کہانیاں ہیں دلِ مبتلا کی یاد

اُس دل سے پوچھ کیفِ تصوّر کی مستیاں جس میں سوائے تیرے نہ ہو ماسوا کی یاد
ڈرتا ہوں اور پھر نہیں ڈرتا گناہ سے آتی ہے اور پھر نہیں آتی خدا کی یاد

از بہرِ ہے تجھ کو ہجر کی راتوں کی داستاں
سیماب تیری یاد بھی ہے کس بلا کی یاد

یہ کیا جانے میں جانا ہے کہ جاتے ہو خفا ہو کر
میں جب جانوں مرے دل سے چلے جاؤ جُدا ہو کر

تصوّر آپ کا کیا کیا فریب جلوہ دیتا ہے
کہ رہ جاتا ہوں میں اکثر ہم آغوشِ ہوا ہو کر

وہ پروانہ ہوں، میری خاک سے بنتے ہیں پروانے
وہ دیپک ہوں کہ انگارے اُڑاتا ہوں فنا ہو کر

قیامت تک اُڑے گی دل سے اُٹھ کر خاک آنکھوں تک
اسی رستے گیا ہے حسرتوں کا قافلا ہو کر

تمھیں اب دردِ دل کے نام سے گھبرائے جاتے ہو
تمھیں تو دل میں شاید آئے تھے درد آشنا ہو کر

یونہی ہم تم گھڑی بھر کو ملا کرتے تو بہتر تھا،
یہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جُدا ہو کر

یقینی حشر میں سیماب اُن کی دید ہے لیکن

وہ پھر پڑے میں جا بیٹھے اگر جلوہ نما ہو کر؟!

مجھے پسند نہ کیوں آئے صحنِ صافِ قفس
لکھا ہوا مری تقدیر میں ہے قافِ قفس

لگی نہ مجھ کو ہوا تک ریاضِ ہستی کی
مرے نصیب سے تھا بند ہر شگافِ قفس

زباں درازیٔ صیاد سے پریشاں ہوں
ہوا ہے میرے لئے فرض اعتکافِ قفس

بڑھا قفس کا یہ رتبہ مری اسیری سے
ہوائے گل کے لئے فخر ہے طوافِ قفس

کھلی ہے آنکھ یہیں اس سے مجھ کو الفت ہے
اُبھار مجھ کو نہ اے ہم نشیں خلافِ قفس

کسی سے منتِ اخفائے حال کیا کرتا
کہ دودِ آہ سے خود بن گیا غلافِ قفس

میں جل ہی جاؤں گا اے گرمیٔ فغاں بس کر
لگے گی آگ ابھی سر سے تا بہ نافِ قفس

نگاہ میں ہیں عروسِ بہار کے جلوے
مجھے دریچۂ فردوس ہے شگافِ قفس

مجھے قفس سے عقیدت بھی تھی محبت بھی
رہا ہوا بھی تو برسوں کیا طوافِ قفس

شعاع پڑتی ہے داغِ جگر کی اے سیماب
بنا ہے مطلعِ خورشید صحنِ صافِ قفس

رنگ یوں اپنا حسینوں میں جما دیتے ہیں
آنکھ ملتی ہے تو ہم دل بھی ملا دیتے ہیں

نزع میں چھیڑ کے پیغامِ وفا دیتے ہیں
ہائے کیا وقت ہے اور وہ مجھے کیا دیتے ہیں

آپ کے دستِ تسلی میں ہے کچھ بات ہی اور
یوں تو آنسو بھی لگی دل کی بجھا دیتے ہیں

چھیڑتے ہیں مجھے سودائی سمجھ کر اُن کا
لوگ تو اور بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

زہر کھایا شبِ فرقت تو دوا کام آئی
جان یوں بھی کہیں ربابِ وفا دیتے ہیں !

نام کو بھی نہ کسی دل میں رہے گا ناسور   اب اطبا تری خاکِ کفِ پا دیتے ہیں
خوش رہیں کوچۂ جاناں میں ہوا کے جھونکے   دل کے ٹکڑے تو بھی ڈھونڈ کے لا دیتے ہیں

آج کل مشقِ ستم کی انھیں دُھن ہے سیماب
آگ غنچے میں لگاتے ہیں بجھا دیتے ہیں

چمن میں صبح کے انوار سے برسی ہمو برسوں   کیا ہر تیری نے آبِ شبنم سے وضو برسوں
ہمیں دیکھو کہ ہمنے کی نہ اُن سے گفتگو برسوں   دیا آنکھوں ہی آنکھوں میں پیامِ آرزو برسوں
چمن کی دھوپ دنیا میں ہوگی سرخرو برسوں   کہ اس کمبخت نے چوسا ہی پھولوں کا لہو برسوں
یہی دل میں وہ بن کر یہ رہے دل کی آرزو برسوں   لہو کی بوند نے پائی ہے کیا کیا آبرو برسوں
تجھے سجدے سکئے ہیں اے حریمِ آرزو برسوں   نیازِ عشق پر میرے کرے گا ناز تو برسوں
گھڑی بھر بھی جہاں ٹھہرے نہ ٹھیریں ہوشیار دیکھی   وہاں گونجی تمہارے ایک دیوانے کی ہُو برسوں
ہو دل خون جب رنگِ وطن غربت میں یاد آیا   شفق نے میرے ویرانے میں برسایا لہو برسوں
یہ دل میرا ہی میرا ہی جسے جلووں نے گھیرا ہی   یہ گھر تیرا ہی تیرا ہی، رہا ہی تو ہی تو برسوں
لہو میں ڈوب جانا، چند بوندوں کو اُٹھا لینا   نگاہِ یاس سے سیکھی ہی ترکیبِ وضو برسوں
محبت کے زمانے بھی قیامت کے زمانے تھے   رہا دل میرا اس پہلو میں اُس پہلو میں تو برسوں
تو وہ باقی ہے سب دنیا فنا ہو جائے گی تجھ میں   رہا ہی تو ہی تو برسوں، رہیگا تو ہی تو برسوں
ضرورت کیا ہی اُنکی کمسنی سے پوچھتا ہو نہیں   کہ لُوٹا جائے اک خانہ خرابِ آرزو برسوں

نہ آیا بعدِ موسیٰ کوہِ سینا پر نظر کوئی

رہی سیماب سُونی جلوہ گاہِ آرزو برسوں

شاید جگہ نصیب ہو اُس گل کے ہار میں
میں پھول بن کے آؤں گا اب کی بہار میں

خلوت خیالِ یار سے ہے انتظار میں
آئیں فرشتے لے کے اجازت مزار میں

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں
آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں

اے دردِ دل کو چھیڑ کے پھر بار بار چھیڑ
ہے چھیڑ کا مزہ خلشِ بار بار میں

ڈرتا ہوں یہ تڑپ کے لحد کو اُلٹ نہ دے
ہاتھوں سے دل دبائے ہوئے ہوں مزار میں

تم نے تو ہاتھ جور و ستم سے اُٹھا لیا
اب کیا مزہ رہا ستمِ روزگار میں

اے پردہ دار اب تو نکل آ کہ حشر ہے
دنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں!

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

سیماب پھول اُگیں لحدِ عندلیب سے
اتنی تو تازگی ہو ہوائے بہار میں

ہوں تجلیٔ رخِ یار کے حیرانوں میں
آئینے دیکھتا پھرتا ہوں پریخانوں میں

نہ ملا حسرتِ موسیٰ کا نتیجہ، نہ ملے
اک فسانہ تو بڑھا حسن کے افسانوں میں

وہ پریشان ہیں اور شمع کی لَو برہم ہے
دیکھنا روح تو میری نہیں پروانوں میں

اگر انکار ہے زخموں میں نمک بھرنے سے
زخم لے جائیے بھر بھر کے نمکدانوں میں

کیف ہی سب کا جدا، اور ہیں آنسو یک رنگ
ایک سی ڈھل نہ سکی ایک سے پیمانوں میں

پھونک دی روح نئی شمعِ سحر نے سرِ بزم
اُڑ کے ٹوٹے ہوئے پَر مل گئے پروانوں میں

بوئے گیسوئے دوتا پھرتی ہی کیوں خانہ بدوش   تو بھی آبیٹھ محبت کے پریشانوں میں
سوز یکسو ہوئیں اور بزم تری سوز نواز   کبھی جل بل کے چلا آؤں گا پروانوں میں
نیم مست آنکھوں نے مجذوب بنا رکھا ہے
ہوشیاروں میں ہوں سیماب نہ دیوانوں میں

خراب فتنۂ بیداد یار ہم بھی ہیں   سہے ہوئے ستم روزگار ہم بھی ہیں
خرام ناز کرے التفات یا نہ کرے   پڑے ہوئے تو سر رہگذار ہم بھی ہیں
چلو جہاں تمہیں چلنا ہو قافلے والو   تمہارے ساتھ مثال غبار ہم بھی ہیں
ہمارے جذب محبت کی ہے یہ دو اثری   انہیں بھی چین نہیں بیقرار ہم بھی ہیں
ہمیں بھی یاد وطن سے سکوں نہیں سیماب
اس انجمن میں غریب الدیار ہم بھی ہیں

مست کرکے نگہ ہوش ربا نے مجھ کو   بزم ساقی میں لگایا ہے ٹھکانے مجھ کو
لطف پروردۂ فطرت ہی سحر گشت مرا   کہ نسیم سحر آتی ہے جگانے مجھ کو
ہاتھ رکنے نہ دیا مشق جفا نے اُن کا   چین لینے نہ دیا شوق وفا نے مجھ کو
ایک چھوٹا سا نشیمن تو بنا لیتا میں   چار تنکے نہ دیے میرے خدا نے مجھ کو
نغمہ سنجی مری سیماب بہت دل کش ہے
یاد ہیں طوطیٔ سدرہ کے ترانے مجھ کو

صبر و شکیب بھی تھے دل بے خبر کے ساتھ   گھر والوں کو بھی لوٹ لیا تم نے گھر کے ساتھ

چارہ گرو ہمیں وعدہ درمانِ سوزِ دل — تا صبح گھل نہ جاؤں گا شمع سحر کے ساتھ!
دنیا و دیں کی مجھ کو ذرا بھی خبر نہیں — جاگا ہوں رات بھر کسی کافر نظر کے ساتھ
اب فکر موت کی ہے نہ اندیشۂ حیات — دنیا کی سو بلائیں گئیں ایک سر کے ساتھ

سیمابؔ اُٹھئے اور قدم ان کے لیجئے
آنے لگیں فلک سے دُعائیں اثر کے ساتھ

تم مرے پاس رہو پاسِ ملاقات رہے — نہ کرو بات کسی سے تو مری بات رہے
ہو سرافرازِ یقیں، حدِ تصور سے گزر — وہ بھی کیا عشق جو پابندِ خیالات رہے
میں نے آنکھوں سے نہ دیکھی سحرِ شامِ فراق — شمع سے پہلے بجھا ایک پہر رات رہے
ذہن ماؤف، دل آزردہ، نگاہیں بے کیف — مر ہی جاؤں گا جو چندے یہی حالات رہے

دیر میں آنے کی تکلیف تو کی ہے سیمابؔ
یاد کعبے کی بھی اے قبلۂ حاجات رہے

کٹ چکی فرقت کی رات آرام سے — انتظارِ صبح میں ہوں شام سے
یاد جب آتی ہیں مست آنکھیں تری — دل کو بہلاتا ہوں شغلِ جام سے
جذبِ صحرائے جنوں کا دیکھنا — دل کھچا جاتا ہے سو سو گام سے
وحشیو پیراہنِ بے آستیں — کم نہیں ہے جامۂ احرام سے
جب رہا ہونے لگے ہم غم پسند — خوب ہی روئے لپٹ کر دام سے
ہیں وہی یارب مرے لیل و نہار — فائدہ کیا گردشِ ایام سے

اس کو مجھ سے کوئی نسبت ہے ضرور — جی بہلتا ہے چراغِ شام سے
وہ ہیں اور سیماب تاکیدِ سکوں
اور میں مجبور اپنے نام سے

تلافیِ غمِ حاصل کی تم نے خوب کہی — یہ بات آج مرے دل کی تم نے خوب کہی
یہ وحشتیں مری پابندِ دار وگیر نہیں — جنوں میں قیدِ سلاسل کی تم نے خوب کہی
میں ہوش میں ہوں، خدنگِ نگاہ تو پھینکو — حفاظتِ جگر و دل کی تم نے خوب کہی
یہ کیا کہا کہ رہ و رسمِ عشق مشکل ہے — محالِ محض ہے مشکل کی تم نے خوب کہی
یہ حکم کیا کہ جو مانگے گا پائے گا سائل — تمہیں نہ مانگ لے سائل کی تم نے خوب کہی
ذرا سی دیر میں غمگیں ذرا سی دیر میں شاد — مرے اُمید بھرے دل کی تم نے خوب کہی
ہے دل فروختہ سیماب تم نہ جاتے تھے
پھر اس سے گرمیِ محفل کی تم نے خوب کہی

رفتہ رفتہ وہ مرے جینے کا ساماں ہوگئے — پہلے میرا دل بنے پھر راحتِ جاں ہوگئے
لگ گئی صحنِ چمن میں آگ آتے ہی بہار — پھول کھل کر آتش افروزِ گلستاں ہوگئے
کیا کریں فکرِ رہائی کی اسیرانِ قفس — ہوچکے مایوس تو مانوسِ زنداں ہوگئے
کر رہے تھے جانے ہم اللہ سے کس کا گلہ — آپ اپنا سر جھکا کر کیوں پشیماں ہوگئے
ہجر کی شب تھی قیامت خیز چار آنسو مرے — آنکھ سے نکلے اگرے، اگرتے ہی طوفاں ہوگئے
تیرگیِ قسمت کی تاریکی، ہجومِ یاس کی، — یہ اندھیرے بھی شریکِ شامِ ہجراں ہوگئے

ہوگیا دشوار یکسوئی سے دم بھر بیٹھنا
ہم تو اے سیماب اس دل سے پریشاں ہوگئے

جو تھا برتاؤ دنیا کا، وہی اس نے کیا مجھ سے
میں دنیا سے انوکھا تھا کہ وہ کرتا وفا مجھ سے؟

ہوئی ہے آئینہ خانے میں کیا ایسی خطا مجھ سے
کہ تیرا عکس بھی ہے آج شرمایا ہوا مجھ سے

تپ فرقت کا شاید کچھ مداوا ہونے والا ہے
کہ اب خود پوچھتے ہیں چارہ گر میری دوا مجھ سے

مرے پہلو میں دل رکھ کر مجھے قسمت نے لٹوایا
نہ میرے پاس دل ہوتا نہ کوئی مانگتا مجھ سے

جلا کر اے مذاق دید تو نے خاک کر ڈالا
جمال یار کا اب پوچھتا کیا ہے مزا مجھ سے

شب غم مجھ پہ جو گذری تھی میں اس سے نہ واقف تھا
چراغ صبح نے شب بھر کا قصہ کہہ دیا مجھ سے

میں دیوانہ ہوں میرے پاس محشر میں کھڑی رہنا
نہ جانے میں کہوں کیا اور کیا پوچھے خدا مجھ سے

تو کیا اپنی سزائے قتل پر خود دستخط کر دوں؟
وہ لکھواتے ہیں کیوں جرم وفا کا فیصلہ مجھ سے

غلط تھی یہ مثل سب دبنے والے کو دباتے ہیں
دبا میں خاک میں، تو خاک کو دبنا پڑا مجھ سے

یہ میری حیرت دیدار کا انجام ہونا ہے
نہ تم جلوہ دکھاؤ گے نہ دیکھا جائے گا مجھ سے

بتا دو میرے غارتگر، اب انکو کیا بتاؤں میں؟
مسافر پوچھتے ہیں تیری منزل کا پتا مجھ سے

سُنے کس کس کی وہ سیماب کس کس کو تسلی دے
پڑے رہتے ہیں لاکھوں انکے در پہ مبتلا مجھ سے

کسے فکر آسائش زندگی ہے
ذرا سی رہی ہے بہت کٹ گئی ہے

جدھر دیکھتا ہوں نظر آ رہی ہے
تری شکل حد نظر بن گئی ہے

گناہوں سے اپنے جو کرتا ہوں توبہ ۔۔۔ تو چشمِ کرم میرا منھ دیکھتی ہے
شبِ ہجر بستر پہ تنہا نہیں ہوں ۔۔۔ مرے ساتھ تقدیر بھی سو رہی ہے
شبیہیں تو دیکھی ہیں آنکھوں نے لاکھوں ۔۔۔ مگر تیری تصویر، تصویر ہی ہے
عجب اک شگوفہ ہے عاشق کا دل بھی ۔۔۔ کھلے تو کنول بند ہو تو کلی ہے

کوئی اُس کو چھیڑے تو وہ کیوں نہ روئے
کہ سیماب پتھر نہیں آدمی ہے

قدم لے جلد اے دستِ دُعا بڑھ حوصلہ کر کے
دُعا کچھ لائی ہے بامِ فلک سے جھولیاں بھر کے
بہت بے کیف ہے دل سرد مہری سے زمانے کی
پلا دے آج تو شیشے میں ساقی بجلیاں بھر کے
ذرا سا دن ہے میری داستانِ غم ہے طولانی
سرِ محشر کہاں تک روؤں دُکھڑے زندگی بھر کے
دکھا دی برہمن کو کیا تُوں نے صورتِ باطن
یہ بُت خانے میں کیسے شور ہیں اللہ اکبر کے
اُدھر ہے عکس اُن کا وہ اِدھر ہیں محوِ آئینہ
کھڑے ہیں ایک ہی تیور سے دو قاتل برابر کے
یہ معراجِ محبت عشق میں قسمت سے ملتی ہے

ترے زانو پہ رکھتے ہی نصیبے کھل گئے سر کے
تڑپ کر سونے والے گور کے تختے الٹ دینگے

سرِ تربت نہ رو اور رونے والے سسکیاں بھر کے
الٰہی اس تپِ سوزِ دروں میں آگ لگ جائے

کہ ساری رات کپڑے جسم پر رکھتا ہوں تر کر کے
ہم اے سیماب آخر کشتۂ بے تابیٔ دل تھے
فنا ہو کر بدن سے پھوٹ نکلے کیمیا گر کے

سیہ روزی کا یہ عالم زمانے سے نرالا ہے
مرے گھر میں اندھیرا، ساری دنیا میں اجالا ہے

وہ جوشِ عشق جسکو دل کی نیرنگی نے پالا ہے
رہے پنہاں تو حسرت ہے نکل جائے تو نالا ہے

پڑا ہے روشنی میں ذرہ ذرہ میرے صحرا کا
چراغ بیکسی سے شامِ غربت میں اُجالا ہے

سرشکِ شوق کی موجوں سے کیوں گھبرا گئی دنیا
ابھی تو ایک ہی قطرہ سمندر سے نکالا ہے

دوا سے درد دینے درد سے کی ہے مصیبت میں
کہ جب کانٹا چبھا ہے نوکِ خنجر سے نکالا ہے

دلِ مشتاق جھونکے لے رہا ہے فرطِ مستی سے
چمن میں آج یہ سیماب جھولا کس نے ڈالا ہے

محتاجِ عبادت کرمِ یار نہیں ہے
افسوس ہے اُس پر جو گنہگار نہیں ہے

یہ تو نہ کہوں گا کہ غمِ یار نہیں ہے
سب کچھ ہے مگر قابلِ اظہار نہیں ہے

بے پردہ وہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں سرِ محفل
کیا آج کوئی طالبِ دیدار نہیں ہے؟

سوچا ہے کہ اب اپنی مدد آپ کریں گے — اچھا ہے جو اپنا کوئی غمخوار نہیں ہے
افتادہ جہاں ہوں پس دیوار میں ناکام — قسمت سے وہیں سایۂ دیوار نہیں ہے
اس سے تو مری لذتِ غم ہوتی ہے تازہ — فریاد کسی حال میں بیکار نہیں ہے

سیماب وہ کہتے ہیں کہ ہم خوش ہیں اسی سے
اب زندگیٔ غم مجھے دشوار نہیں ہے

بس ان سے محبت کی ادا بھی نہیں ہوتی — اور اب تو سلیقے سے جفا بھی نہیں ہوتی
آجاتا ہے کچھ یاد تو بھر آتے ہیں آنسو — ہم سے تو مصیبت میں دعا بھی نہیں ہوتی
شاید ہوا پیوست خدنگِ نگہ ناز — اب میں کہیں دل میں ذرا بھی نہیں ہوتی
اے برقِ جمال ایسی بھی کیا پردہ نشینی — اب طور پہ تو جلوہ نما بھی نہیں ہوتی!
یوں قافلے سے دور میں جاتا ہوں اکیلا — ہمراہ مرے بانگِ درا بھی نہیں ہوتی
ہے قحطِ وفا ہے کہ غزل میں مری اکثر — ارزانیٔ مضمونِ وفا بھی نہیں ہوتی

اس وقت ہمیں عادتِ گلگشت ہے سیماب
جب باغ میں گلچیں کی ہوا بھی نہیں ہوتی

امتحاناً ہی وہ مجبورِ فغاں کر دیکھتے — پھر فلک کو ایک لمحے میں زمیں پر دیکھتے
نبض سے امراض کی تشخیص کرتے ہیں طبیب — تم تو میرا حال دل پہ ہاتھ رکھ کر دیکھتے
رسمِ پردہ دیکھنے والوں کی حارج تو نہ تھی — دیکھنا ہوتا تو آنکھوں میں چھپا کر دیکھتے
اپنے صانع پر اگر مصنوع کی ہوتی نظر — آئینے ہر گھر میں تصویرِ سکندر دیکھتے

مانعِ نظارۂ حُسن اس لئے حیرت ہوئی دیکھ لیتے ایک دن موسیٰ تو اکثر دیکھتے
آنکھ کھل جاتی اگر تقدیر سے روزِ ازل سب سے پہلے کھول کر خطِ مقدر دیکھتے
یوں نہ گر پڑتے جو کرتے روک تھام اپنی کلیم دیکھ کر اُن کو سنبھلتے پھر سنبھل کر دیکھتے
اے امیدِ دوست کہتے ہیں کہ مرنا سہل ہے تو نہ ہوتی کاش، تو یہ کام بھی کر دیکھتے

گر نہ تھی سیماب فکرِ امتحانِ اضطراب
آگ میں رکھ کر مجھے کیوں کیمیا گر دیکھتے؟

طاقوں میں جگمگاتے ہیں شیشے شراب کے جلتے ہیں میکدے میں چراغ آفتاب کے
دیں گے جواب کیا مری چشمِ پُر آب کے خالی پڑے ہوئے ہیں کٹورے حباب کے
آنسو تو پونچھ دو مری چشمِ پُر آب کے اک سرسری نگاہ ہیں صدقے حجاب کے
اُن کی طرف سے آپ کئے سیکڑوں سوال قاصد کو یوں سکھائے سلیقے جواب کے
ڈھالیں گے اپنے ہاتھ سے وہ پھول سی شراب لادے کوئی چمن سے کٹورے گلاب کے
نکلے ہیں سیر کرنے شہیدانِ فصلِ گُل خاکِ چمن سے بھیس بدل کر گلاب کے
یہ اشک، یہ شرارِ فغاں، یہ جگر کے داغ، کیا کیا چراغ ہیں مری شامِ شباب کے
جاتے ہیں خوفِ سیلِ فنا سے بہے ہوئے موجوں سے دور دور سفینے حباب کے
ہے خاکِ نقشِ پا سے امیدِ سراغِ دوست ذرّوں سے پوچھتا ہوں پتے آفتاب کے
راہِ فنا میں چلتے ہیں آزاد سر کے بل دیکھے نہیں ہیں پاؤں کسی نے حباب کے

سیماب دن ہیں عید تو راتیں شبِ بہار

کیا خوشگوار خواب ہیں عہدِ شباب کے

دل کے بہلانے کا وحشت میں ہو ساماں کوئی — لا کے رکھ جائے مرے گھر میں بیاباں کوئی

بزمِ اربابِ وفا میں کبھی کام آ جاتی — کھینچ لیتا مری تصویرِ پریشاں کوئی

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں — اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

اک جہاں مجھ کو پریشان نظر آتا ہے — یوں بھی یارب نہ ہو دنیا میں پریشاں کوئی

سرِ مدفن وہ پھر آئے ہیں ستانے مجھ کو — جمع کر دے مرے اجزائے پریشاں کوئی

باغباں تختۂ گل دیکھ لے کلیاں گن لے — وہ گیا پھاند کے دیوارِ گلستاں کوئی!

نغمۂ عشق سُنے ہو گئی مدت سیماب
چھیڑ دے آج مرا سازِ رگِ جاں کوئی

کر غور رنگ و بو کے احساس سے گذر کے — یہ پھول اور کلیاں دھوکے ہیں سب نظر کے

شیرازہ بندیٔ گل جوشِ بہار تک ہے — اک روز یہ ورق سب رہ جائیں گے بکھر کے

مجبور کیوں نہ کر دوں ترکِ ستم پہ تجھ کو — میں کیوں ترے ستم پر رہ جاؤں صبر کر کے

بیداریٔ فضا میں پہلو بدلنے والے — اتنا تڑپ کہ تارے رہ جائیں آہ بھر کے

کیا داد اُس نظر سے مانگوں وفائے دل کی — جو مسکرائے دل کی دنیا تباہ کر کے

ایمان حشر پر ہے لیکن یہ سوچتا ہوں! — دل ہو چکا ہے مردہ اب کیا جیونگا مر کے

خاکِ رہِ محبت خود ایک کارواں ہے — رہگیر ہیں یہ جتنے ذرّے ہیں رہگذر کے

آدابِ وصل معلوم! اب میں کہاں تمہیں ہو — کھویا گیا ہوں حدِ جذبات سے گذر کے

سیمابؔ اب وطن میں اتنا ہے آنا جانا
آئے ہیں عید کرنے، جائیں گے عید کر کے

جلوہ جو تیرے حسن کا نالے میں ہے مرے　　یہ ساری کائنات اُجالے میں ہے مرے
دیکھوں تو میرا راز سمجھتا ہے کس طرح　　کتنی نگاہ دیکھنے والے میں ہے مرے
ہر خار میری وادیٔ وحشت کا مست ہے　　کیا تیز ہے شراب جو چھالے میں ہے مرے
یہ تیرے بتکدے میں تو پتھر ہیں برہمن　　وہ بت ہی اور ہے جو شوالے میں ہے مرے
میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں　　ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے
اے رات دیکھ میرے تصور کی روشنی　　کس شان کا ہے چاند جو ہالے میں ہے مرے

سیمابؔ دل جو مائلِ ناز و نیاز ہے
انداز فقر کا بھی دوشالے میں ہے مرے

کون کہتا ہے کہ فتنے نہ اُٹھاتے چلئے　　گر افتادہ سروں کو نہ ستاتے چلئے
آئینے نقشِ کفِ پا سے بناتے چلئے　　چار چاند آج زمیں کو بھی لگاتے چلئے
آپ کیوں گورِ غریباں میں چلے آئے یہ کیا!　　اہلِ مدفن ابھی باہر نکل آتے چلئے
مجھ سے کہتا ہے حریفوں کی تگ و دو کا خیال　　نقشِ پارا ہِ محبت میں مٹاتے چلئے
سُرخ ہولی میں ہوائیں بھی ہوں یارانِ نشاط　　تا درِ پیرِ مغاں رنگ اُڑاتے چلئے
قبرِ عاشق پہ تکلف کی ضرورت کیا ہے　　پھول بھول آئے تو کانٹے ہی چڑھاتے چلئے
جی میں ہے روئیے واماندگیوں پر اپنی　　اور سب قافلے والوں کو رُلاتے چلئے

مجلس وعظ کا آخر ہے ارادہ سیماب
میکدہ پاس ہے کچھ پیتے پلاتے چلئے

تری اے چارہ گر حیرت بجا معلوم ہوتی ہے
کہیں سب کو محبت کی دوا معلوم ہوتی ہے

تڑپ جاتا ہوں میں کانٹا اُلجھتا ہے جو دامن سے
مجھے اس میں محبت کی ادا معلوم ہوتی ہے

مآلِ آفرینش ہے لحد کی آخری منزل
یہیں تو ابتدا کی انتہا معلوم ہوتی ہے

زمانہ آج مانوسِ جفا ہے دیکھتا ہوں میں،
خدائی آج مایوسِ وفا معلوم ہوتی ہے

میں اے سیماب ترکِ عشق پر آمادہ تھا لیکن
نگاہِ حسن پھر ہمت فزا معلوم ہوتی ہے

شورِ سیدائی کی دیوانو ضرورت کیا ہے
کیوں بھڑکتے ہو بہاروں سے، یہ وحشت کیا ہے

باہر آتی نہیں رہ رہ کے کھٹک جاتی ہے
دل میں ٹوٹی ہوئی اک پھانس ہے حسرت کیا ہے

چڑھ گیا ہے نگہِ شوق پہ رنگِ ہمہ اوست
اب مجھے آپ سے ملنے کی ضرورت کیا ہے

شکوۂ دوست نہ کر دے کہیں بیمارِ فراق
سب یہی پوچھتے آتے ہیں شکایت کیا ہے

جان پڑ جائے شبِ غم مرے ارمانوں میں
آپ آجائیں تو مرنے کی ضرورت کیا ہے

تم یہیں کیوں نہ دکھا دو ہمیں جلوہ اپنا
طور پر بیٹھ کے جلنے کی ضرورت کیا ہے

اُن کا جلوہ تھا کوئی کھیل نہ تھا اے سیماب
خیرگی چھا گئی آنکھوں پہ تو حیرت کیا ہے

اب اُس کا فضل میرا، رحمتیں میری، عطا میری،

مناسب قیمتوں پر بک گئی جنسِ دعا میری

نہیں اے برہمن ناقوس سے کچھ کم صدا میری
بتوں کے کان بہرے ہیں تو سُن لے گا خدا میری

نہ جانے کیا ترا انجام ہو اے وعدۂ فردا
قیامت ایک دن کی حسرتیں لے انتہا میری

تپ غم کی لپٹ سے چارہ گر گھبرائے جاتے ہیں
یہ بیچارے علاج اپنا کریں گے یا دوا میری

وفا کی جستجو میں اب مری تربت پر آئے ہو
جہاں تم نے جفا کی تھی وہیں ڈھونڈو وفا میری

مری نظروں میں اے سیماب جلوے ہیں حقیقت کے
نظر کیا کیمیا پر ہو نظر ہے کیمیا میری

کسی مردِ وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے — اُداسی مانگنے آئی ہے دنیا میرے مدفن سے
جہاں والوں میں اور اہلِ فنا میں فرق اتنا ہے — انہیں آنا ہے مدفن میں انہیں اُٹھنا ہے مدفن سے
مری عریانیٔ وحشت کی رکھ لے شرم غربت میں — کفن کی بھیک مانگ اے بیکسی صحرا کے دامن سے
خبر اِس انقلابِ دیر ساماں کی نہ تھی ہم کو — کہ ہم ہونگے قفس میں پھول برسیں گے نشیمن سے

ہمیں اُستاد کی تقلید اے سیماب کرنی تھی
عظیم آباد میں یوں پیشتر آئے ہیں ساون سے

ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے | نہ تھا حجاب تو آنکھوں میں اشک بھر آئے
ذرا سی دیر میں دنیا کی سیر کر آئے | کھلے کہ تیری خبر تیرے بے خبر آئے
اسیر ہونے کے آثار پھر نظر آئے | قفس سے چھوٹ کر آئے تو بال و پر آئے
تجھے ملال ہے ناکامیٔ نگاہ فضول | نظر میں جو نہ سمائے وہ کیوں نظر آئے
وہ جانتا ہے میں پابند رسم و راہ نہیں | فضول ٹھوکریں کھانے کو راہبر آئے
تمام عمر یہ ناکامیاں قیامت ہیں | کبھی کبھی تو الٰہی، امید بر آئے
جسے تصرفِ تیرِ نظر نہ ہو معلوم | وہ میرے سامنے لے کر دل و جگر آئے
شریکِ قسمتِ تنہائیٔ فراق ہوں میں | اجل بھی کیوں ترے آنے سے پیشتر آئے
بلائے جاں ہے وہ نصفِ شباب کا عالم | کسی حسین کی جب زلف تا کمر آئے

نگاہ جلوہ میں شاید سما گئے سیماب
کہ منتظر گئے لوٹے تو منتظر آئے

کس قدر شامِ شبِ غم تھی پریشانی مجھے | تھا چراغ خانہ بھی غولِ بیابانی مجھے
لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے | حشر تک ڈھونڈا کرے اب خانہ ویرانی مجھے
باغ میں لے جائے گر برگشتہ سامانی مجھے | پھول کھل کر دیں نویدِ چاک دامانی مجھے
دل دہی و دلبری دونوں میں ہمت آزما | کچھ پریشانی انھیں ہے، کچھ پریشانی مجھے
دل شگفتہ ہو کے بھی آزردۂ غم ہی رہا | خوش نہ آئی یہ بہارِ ہستیٔ فانی مجھے
موسمِ وحشت میں عالمگیر ہے دیوانگی | ساری دنیا اب نظر آتی ہے دیوانی مجھے

اب بہ آسانی کرے گا جذب دریائے کرم تو نے اے جوشِ ندامت کر دیا پانی مجھے
دیکھئے انجامِ دورِ غم جنوں ہو یا سکوں عشق ہے صبر آزما، فکرِ تن آسانی مجھے

بے نیازِ محفلِ عالم ہوں اے سیماب میں
ہے غنیمت اپنے دل کی جلوہ سامانی مجھے

کیوں نظر بند کوئی پردۂ حائل میں رہے جس کو صورت نہ دے اللہ وہ محمل میں رہے
دل کے ارمان ستانے کے لئے دل میں رہے ہم تو مر کر بھی الٰہی اسی مشکل میں رہے
تیرے جلووں نے ہمیں ہوش میں آنے نہ دیا بے خبر ہی رہے جب تک تری محفل میں رہے
جذب کرنا اسے آتا ہے، کہے دیتا ہوں جس کو بننا ہو مرا دل وہ مرے دل میں رہے
اُس کی کلے اُمید کے طوفان کا اندازہ کر ڈوبتے ڈوبتے جو حسرتِ ساحل میں رہے
عشق سے حسن بدل لے گا حقیقت اپنی عمر بھر ہم اسی اندیشۂ باطل میں رہے

جی میں ہے ترک کریں شغلِ محبت سیماب
کون اُلجھا ہوا اس عقدۂ مشکل میں رہے

اس درجہ ہوش بہکے جامِ شراب پی کے آنے لگے زباں تک اسرار بے خودی کے
محشر میں ہوں نہ رسوا جذبات عاشقی کے اب کیا کریں گے یارب مر کے بعد جی کے
پھر شورشِ محبت ہنگامہ آفریں ہے پھر دل میں دیکھتا ہوں آثار زندگی کے
شاید شگفتہ اس کو صبحِ بہار کر دے دل کی گرفتگی میں انداز ہیں کلی کے
آگاہِ راز آنکھیں ہر بھید جانتی ہیں پنہاں کچھ اور بھی ہے ہر پردے میں آدمی کے

کیا کیجیے کسی سے تحریکِ دوستی کی، ہم خود فریب خوردہ بیٹھے ہیں دوستی کے

سیماب اپنی فطرت، ہے خوگرِ محبت
جو درد آشنا ہو، بندے ہیں ہم اُسی کے

شبِ غم اے مرے اللہ بسر بھی ہوگی
رات ہی رات رہے گی کہ سحر بھی ہوگی؟

میں یہ سُنتا ہوں وہ دنیا کی خبر رکھتے ہیں
جو یہ سچ ہے تو اُنہیں میری خبر بھی ہوگی

چین ملنے سے رہا اُن کے نہ جُدا ہونے سے
آخر اے عشق کسی طرح بسر بھی ہوگی!

جس کی ہلکی سی جھلک بن گئی افسانۂ طور
ہائے کیا چیز وہ دزدیدہ نظر بھی ہوگی!

وہ ہیں اور دورِ صبوحی ہے، گھٹا چھائی ہے
کبھی یہ صبحِ الٰہی مرے گھر بھی ہوگی؟

ایک وہ شمع نہ ہوگی جو بجھی جل جل کر
شام بھی ہوگی زمانے میں سحر بھی ہوگی

فکرِ سیماب ہے انجامِ دعا کی ناحق
دل سے نکلی تو ہم آغوشِ اثر بھی ہوگی

جُرعات

کبھی وہ طور پر اب جلوہ فرما ہو نہیں سکتا
اگر موسیٰ بھی آ جائیں تو ایسا ہو نہیں سکتا

ترے جلووں کو پوچھے کوئی ابراہیم و موسیٰ سے
بھڑک کر نور ہو جانا۔ چمک کر نار ہو جانا

کیا جانے انکے سامنے کیوں ہونٹ سل گئے
لفظِ اُمید تا بہ زباں آ کے رہ گیا

یہ آفتاب ہی جو مرے دل میں ہی عیاں
وہ داغ تھا جو ہاتھ میں موسیٰ کے رہ گیا

یہی تقاضا ہے میرے جی کا کہ ایک نالہ ہو برہمی کا
نہ ہو ارادہ جو دلبری کا تو صبر لیں آپ کیوں کسی کا

ہوئی نمودار صبحِ رحلت خیال تھا خوابِ عیش و عشرت
شباب کہتا ہے ہو کے رخصت کہ میں نہیں آشنا کسی کا

شبِ فرقت ہمارے ہاتھ تھا جی سے گزر جانا   مگر منظور کس کو تھا انھیں بدنام کر جانا
جو روٹھے ہو تو ٹھہرو، ذبح کر کے اپنے گھر جانا   گلا تو پھیر لی ہے اب چھری بھی پھیر کر جانا

اُن کے کوچے میں مقدر کی نوازش دیکھئے   مجھ کو دی آواز، درباں کو اشارا کر دیا

تھی وجہِ آتشِ گل گرمیٔ فغاں میری   مجھی سے باغ میں ہنگامۂ بہار رہا
کسی سے میں نے سُنا تھا کہ وہ کریم بھی ہے   بس اتنی بات پہ برسوں گناہگار رہا
اُمنگ دل میں بمقدارِ رنگ و بو اُٹھی   جنوں میں جوش بہ اندازۂ بہار رہا

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا آنکھ تر کرنا   ہمیں بھی انعقادِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا

مرتے ہی میں نے سب کو سبکسار کر دیا   دنیا کے سر پہ بوجھ مری زندگی کا تھا
توبہ، فرشتے چوٹ نگاہوں کی جھیلتے!   غش کھا کے رہ گیا یہ جگر آدمی کا تھا

آج تو پاؤں پہ ساقی کے گرا کر مجھ کو   کام اے لغزشِ مستانہ بنایا ہوتا
اللہ اللہ یہ تبسم یہ نشیلی آنکھیں!   آج تم نے مجھے دیوانہ بنایا ہوتا
یا نہ دیتا مجھے دل اور تمنائے وصال   یا خدا نے تمھیں ایسا نہ بنایا ہوتا

یا الٰہی جو نصیبوں میں تھی میرے گردش
محفل دوست کا پیمانہ بنایا ہوتا

گرے کیوں مختصر اک موج سے تجلی کی اے موسیٰ
تمہیں تو اشتیاقِ جلوۂ دیدار جاناں تھا!

یہ کون آیا تھا اپنے کشتۂ غم کی زیارت کو؟
یہ کیسا طور کا جلوہ سرِ گورِ غریباں تھا

دکھائے شعبدے وحشت نے کیا کیا مجھ کو صحرا میں
کبھی دامن میں کانٹے تھے کبھی کانٹوں میں داماں تھا

مرے دیوانہ پن نے خیرہ کی اتنی ہشیاری
پھٹا جو میرے ہاتھوں سے وہ میرا ہی گریباں تھا

جا کر جو میں نے کل ارنی طور پر کہا
آواز آئی موسیٰ عمراں نہیں ہیں آپ!

نظروں میں میری یوسفِ ثانی تو آپ ہیں
آنکھوں میں میری خوابِ پریشاں نہیں ہیں آپ

امید کو ہے وعدۂ دیدار قیامت
یارب ہو کہیں جلد نمودار قیامت

اٹھتا ہے ہر اک لمحہ نیا درد جگر میں
آتی ہے شبِ ہجر کئی بار قیامت

ہیں چاک جگر اور سحر چاک گریباں
ہیں صبح شبِ ہجر کے آثار قیامت

سنتا ہوں کہ آئے گا کوئی دیکھنے مجھ کو
اللہ کرے اور نہ نکلے مرا دم آج

باغ دکھائے موسمِ گل
دل سوئے کہسار نہ کھینچ

پھیر نہ دل پر تیغ نگاہ — شیشے پر تلوار نہ کھینچ
آگ نہ لگ جائے سیمابؔ — آہِ آتش بار نہ کھینچ

صبا کی گود لے پہونچی مجھے شاخِ نشیمن پر — قفس رکھا کا رکھا رہ گیا دیوارِ گلشن پر
بہار آئی تو ٹوٹیں بجلیاں ہر نخلِ گلشن پر — میں سمجھا تھا کہ اب کے پھول برسیں گے نشیمن پر
تمنا رقص کرتی ہے مری طرزِ طپیدن پر — اثر کو وجد آتا ہے مرے اندازِ شیون پر
کتر کر پَر خدا جانے کہاں صیاد جا بیٹھا — تو کیا اب میں یونہی بیٹھا رہوں دیوارِ گلشن پر؟

یہ اپنی راہ پر ہے تو وہ اپنی راہ پر — نالوں سے تھی امید بھروسا تھا آہ پر
جب سے نظر پڑی ہے تری جلوہ گاہ پر — چڑھتے نہیں ہیں طور کے جلوے نگاہ پر

پیمانہ کو توبہ کے عوض توڑنے والے — توبہ کو نہ توڑا کبھی پیمانہ سمجھ کر

برہمن دیر میں پہونچے ہیں جو کچھ دیر سے ہم — کعبے ہوتے ہوئے آئے ہیں بڑی پھیرے ہم
کوئی پیالہ کوئی ساغر کوئی مینا ساقی — آس باندھے ہوئے بیٹھے ہیں بڑی دیر سے ہم
اتفاقاتِ زمانہ کا بُرا ہو سیمابؔ
ہم سے اجمیر چھٹا چھٹ گئے اجمیر سے ہم

ہوا پامال جس نے سر اُٹھایا تیرے کوچے میں — ہم اُفتادہ مثالِ سایۂ دیوار اچھے ہیں
انیس کنجِ غم، کیفِ نظر، خاموش، بے پردہ — یہی رخ آپ کی تصویر کے دو چار اچھے ہیں
وہ مل جاتے تو موسیٰ کی طرح لطفِ طلب جاتا — ہم اس وادی میں سرگرمِ تلاشِ یار اچھے ہیں

خاکے ہیں چاند سورج تیرے ہی نقشِ پا کے — آئینے ہیں زمیں پر عکس آسمان پر ہیں

میں ہر آنسو کو اپنے گوہرِ یکتا سمجھتا ہوں — سُنا ہے سات پردوں سے یہ قطرے چھن کے آتے ہیں
لگی دل کی بھڑک اُٹھتی ہے سمجھانے بجھانے سے — ہمارے دوست جب آتے ہیں دشمن بن کے آتے ہیں

وضو کرتے ہیں مَے سے خشتِ خم پر سر جھکاتے ہیں — یہ رند اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں

ہو جائیں محوِ لذّتِ دنیا وہ ہم نہیں — جینے کی کچھ خوشی نہیں مرنے کا غم نہیں
اے داغِ دل مجھے نہیں خوفِ رہِ فنا — کیا میرے ساتھ مشعلِ راہِ عدم نہیں

ہوں وہ سودائی کہ وحشت کو جنوں ہے مجھ سے — بید مجنوں نہیں اُگتا مرے ویرانے میں
پھر رہا ہے مری نظروں میں زمانہ ساقی — میرے سر میں ہے کہ چکر ترے پیمانے میں
جستجو نے تری کیا جانے کہاں پہنچایا — آج کعبے میں ہے سیماب نہ بتخانے میں

کسک سی دل میں ہوتی ہی رہی اُن کے تغافل سے | وہ لیتے ہی رہے ضبطِ الم کا امتحاں برسوں
بہار و باغ کی تاریخ ہم سے پوچھ لے کوئی | رہا ہے شاخِ نخلِ گل پہ اپنا آشیاں برسوں
رہا ویراں، کوئی آواز تک دل سے نہیں آئی | کسی نے بھی نہ دی اللہ کے گھر میں اذاں برسوں

دیکھ کر تیرا مرقع رنگ اُڑتا ہے مرا | یا میں اپنا رنگ بھرتا ہوں تری تصویر میں

میخانے میں دو چار ہی میکش نظر آئے | ہم عام سمجھتے رہے ساقی کی صلا کو
یوں حشر کے دن مانگ لیا اُن کو انہیں سے | وہ خود بھی نہ سمجھے مرے اندازِ دعا کو

اے آفتاب بچ کے نہ چل مجھ سے روزِ حشر | رسوا یہاں کہیں مری تر دامنی نہ ہو
کہتے ہیں وہ کہ ہم بھی تو کچھ بے قرار ہوں | دل کو ترے قرار اگر واقعی نہ ہو

تنگ آگئے ہیں گرمیِ ارمان و شوق سے | وہ ہاتھ اُٹھا کے کوس رہے ہیں شباب کو

دیکھ کر یوں نہ کوئی نیچی نگاہیں کر لے | میری آنکھوں میں اگر حسرتِ دیدار نہ ہو

خوش تو ہو حشر کی اُمید پہ تم اے سیماب

اور پورا جو وہاں وعدۂ دیدار نہ ہو!

کرو کرم کی نظر میرے حال پر دیکھو　　وہ اک نگاہ غلط ہی سہی، مگر دیکھو
ہر ایک شخص نظر آئے طالب دیدار　　زمانے کو مری آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھو

مرن ہو جائیگا جینا ترے امیدواروں کو　　نوید صبح محشر مار ڈالے گی ہزاروں کو
قیامت میں تماشائے جنوں ہو دید کے قابل　　اٹھا لائے ہیں اپنے سر پہ دیوانے مزاروں کو

دبا رکھا ہے اے سیماب دل کو بھی جگر کو بھی
چھپا رکھا ہے اک پہلو میں دو دو بے قراروں کو

طالب گور ہوں سیماب یہ حسرت ہے مگر　　تالب گور وہ آئیں مجھے دفنانے کو

ہوش جاتے رہے آتے ہی تری کوچے میں　　دل کو میں بھول گیا اور مرا دل مجھ کو

آخری میری نظر کر گئی کام اے سیماب
اس نے کس یاس سے دیکھا سر محفل مجھ کو

کیا اُسے بیداری شبہائے ہجراں کی خبر　　عمر بھر جس فتنہ گر کی آنکھ بھی آئی نہو

یارب مآل ان کے تبسم کا ہو بخیر　　بجلی تڑپ رہی تھی کہیں گر پڑی نہ ہو

وہ عالمِ شکستگی، تا ز الاماں — جب حُسن خود کسی کے اثر سے تباہ ہو!

مٹا کر پھر مٹا غربت میں اے چرخِ کہن مجھ کو — ستا اتنا کہ یاد آجائے آرامِ وطن مجھ کو
تمہاری شوخ چشمی بزم میں کوئی نہ دیکھے گا — مگر الزام دے گی انجمن کی انجمن مجھ کو
نظر آکتا گئی تھی صبح و شامِ زندگانی سے — تماشا ہو گئی شامِ لحد، صبحِ کفن مجھ کو
غبار آلود ابھی سے ہو گئیں خورشید کی کرنیں — ابھی تو جھاڑنی ہے حشر میں گردِ کفن مجھ کو

کیا گذرتی ہے کسی پر دمِ فریاد نہ پوچھ — نکل آتی ہے زباں نالۂ شب گیر کے ساتھ
آہ کیوں اس کو ازل میں نہ کسی نے روکا — کیوں چلی آئی تنا مری تقدیر کے ساتھ
ساری دنیا کو جگانا مجھے مقصود نہ تھا — صور کیوں چیخ اٹھا نالۂ شب گیر کے ساتھ
پھوٹی تقدیر لئے جاتا ہوں سوئے زنداں — جوڑ دوں گا کسی ٹوٹی ہوئی زنجیر کے ساتھ

آسماں انقلاب بھول گیا — کس نے کی اضطراب میں توبہ
غسل کرنے کو روز آتی ہے — میرے جامِ شراب میں توبہ
کالے بادل میں پردۂ رحمت — توڑتا ہوں حجاب میں توبہ

ہائے سیمابؔ اُس کی مجبوری!
جس نے کی ہو شباب میں توبہ

شرم بسمل کی ہے قاتل ترے اوسان کے ہاتھ　　ہاں ذرا تول کے تلوار۔ ذرا تان کے ہاتھ

جدھر دیکھو اُدھر جنت میں حسن جاودانی ہے　　الٰہی کیا یہاں میری بھی گم گشتہ جوانی ہے؟
مری آنکھوں کا ہر آنسو طلسم زندگانی ہے　　جھلک اُٹھے تو موتی ہے ٹپک جائے تو پانی ہے
یہ دل کا آبگینہ اک حباب زندگانی ہے　　ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو پھر پانی ہی پانی ہے

تری تصویر ایسی کھچ گئی کچھ کلکِ قدرت سے　　کہ صورت آفریں کی بھی زباں سے آفریں نکلی

ڈراتی ہے کہ اب روئے تو دُنیا کو ڈبو دو نگی　　مجھے کرنی پڑی اُلٹی خوشامد چشم پرنم کی

کچھ نہ اتنا قدم آنکھوں سے لگا لینے دے　　آج تو حسرت پابوس مٹا لینے دے
ضعف کہتا ہے کہ ہاتھوں سے گرا دے تصویر　　درد کہتا ہے کلیجے سے لگا لینے دے

خامشی بھی نازسے خالی نہیں　　تم نہ بولو ہم پکارے جائیں گے

سعیٔ آسانی سے بڑھ جاتی ہے مشکل اور بھی　　ضبط کرتا ہوں تو دُکھتا ہے مرا دل اور بھی
چلتے چلتے ضعف سے بیٹھا اور اُٹھا بار بار　　ناتوانی نے بڑھا دی میری منزل اور بھی

طائر کی طرح ہے قفسِ تن میں مقید شاید ہے مری روح گنہگار کسی کی
ہوں طور کی چوٹی سے بھی میں سو قدم آگے لے آئی کہاں حسرتِ دیدار کسی کی

نہیں ہے جو دل میں تو ہوگا جگر میں یہی دو ٹھکانے ہیں دردِ نہاں کے

بتادیں دل میں پیکاں آپکا کیا بنکے رہتا ہے؟ محبت بن کے آتا ہے تمنا بن کے رہتا ہے

اڑ گئی آئی ہوئی نیند اُس ستم ایجاد کی یہ مجھے کیا ہو گیا تھا میں نے کیوں فریاد کی؟

بستہ و آراستہ زلفیں مرے کس کام کی میں تو اُس گیسو کا سودائی ہوں جو برہم رہے

دستِ جاناں میں ہے بوتل اور بوتل میں شراب ہے پری کے ہاتھ میں شیشہ پری شیشے میں ہے
میں ہی اے سیماب آئینے کو دیتا ہوں جلا میرے ہی دم سے یہ سب جلوہ گری شیشے میں ہے

رکھا ہمیں خدا نے بہر حال سربلند مٹ بھی گئے تو گردِ رہِ کارواں رہے
اشکوں کیساتھ دل سے نکلتا ہے خونِ گرم پانی میں کس طرح یہ شرارے نہاں رہے ؟

ہائے کیا چیز ہے مجبوریِ قطعِ اُمید ہم جہاں تھک کے ٹھہر جاتے ہیں منزل ہے وہی
روح کے بعد بھی ہے دل میں ہجوم غم و یاس بجھ گئی شمع گر شورشِ محفل ہے وہی

لے تو ساتھ سلالیں نصیب خفتہ کو اکیلے ہجر کی شب نیند ہی نہیں آتی

سمجھ رہا ہوں کہ رسماً ہے میری پرسش حال بہانہ چاہئے دشمن کو دوستی کے لئے

جاگنے سے اُنکے سب کی روح کو ہے تازگی پھول کہتے ہیں جو وہ سوئے تو ہم مر جائیں گے
آئیں گے گر دیکھنے سیماب کعبے میں اُسے برہمن کہتے ہوئے اللہ اکبر جائیں گے

ہے فصلِ گُل بہارِ مئے ناب پر بھی ہے اے میکشو بسنت کی تم کو خبر بھی ہے
اس انقلاب سے کسی پہلو نہیں ہے چین کیسا یہ درد ہے کہ اِدھر بھی اُدھر بھی ہے

قاتل کا نام لکھ دیا کیوں میری قبر پر لیتے ہیں راہگیر بھی بوسے مزار کے
حیرت ہے کس طرح وہ ہوئے ہم سے پُر غبار رکھا تھا اُن کو شیشۂ دل میں اُتار کے

جاؤ گے کہاں چھپ کے بھلا اہلِ نظر سے وہ دیکھ لیا دل نے تمہیں چاکِ جگر سے!

ہم لوٹ پڑے کعبے سے بُت خانے کی جانب — واللہ پھرے آج تو اللہ کے گھر سے

گر یہ نہ میرے حال پہ کیوں بیکسی کرے — شمع لحد سے بادِ صبا جب ہنسی کرے
گم کردہ راہ - آبلہ پا - دُور کوئے دوست ! — اب شوق ہی کرے تو مری رہبری کرے

رنج ہو انجام شادی اہلِ عالم کے لئے — عید اک تمہید ہے ماہِ محرّم کے لئے
رکھ دیا اللہ نے پہلو میں اک مضبوط دل — یہ رعایت کی تمہارے جورِ پیہم کے لئے
ہاتھ آجاتا جو پتھر آستانِ دوست کا — ہم بھی اک کعبہ بناتے اہلِ عالم کے لئے

تمہیں جب دیکھ لیتا ہوں تو ہوتی ہے یہ کیفیت — قدم کچھ اور کہتے ہیں نظر کچھ اور کہتی ہے

پاؤں پھر راہِ محبت میں تھکے جاتے ہیں — پھر تمنائے درِ یار رہی جاتی ہے

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی — جھکی تو پھر نہ اُٹھی شاخ آشیانے کی

دیکھ کر کہتے ہیں ہم اُن کی پریشاں نظری — اِدھر آ ہم ہیں ترے ناز اُٹھانے والے
اس قدر بارِ معاصی ہے۔ الٰہی توبہ — بیٹھے جاتے ہیں جنازے کے اُٹھانے والے

نظر آئیں گے جب جلوے تو آنکھیں بند کر لیں گے — تجھے آنکھوں میں رکھ کر طالبِ دیدار دیکھیں گے
تری تصویر بن کر تیرے جلووں میں فنا ہو کر — تری آنکھوں سے ہم اک دن ترا دیدار دیکھیں گے
مآلِ جلوۂ دیدار تو سمجھے نہ کچھ موسیٰؑ — زباں سے کہدیا ہم جلوۂ دیدار دیکھیں گے
ہمیں پہونچا دے کوہِ طور تک اے شوقِ نظارہ — نہیں جلوہ نہ ہو ہم جلوہ گاہِ یار دیکھیں گے

میں تمہارا نہیں تو کس کا ہوں؟ — دل تمہارا نہیں تو میرا ہے!؟

بانگِ جرس بلالے آواز دے کے مجھ کو — گم کردہ راہ ہوں میں بچھڑا ہوں کارواں سے

یہ دھواں دھار گھٹائیں یہ ہوائیں توبہ! — شاید ایسے ہی میں توبہ شکنی ہوتی ہے
ہم تو جب چاہتے ہیں دیکھتے ہیں جلوۂ دوست — وہ تو موسیٰؑ ہی سے ربِ ارنی ہوتی ہے
روز آجاتا ہے میخانے میں حسبِ وعدہ — کہیں سیماب سے پیاں شکنی ہوتی ہے

شکوہ نہ کر ابتلائے غم کا — ہے یہ بھی زکوٰۃ زندگی کی
دنیا میں بنا نہ گھر مسافر!
یہ راہ تو ہے چلا چلی کی

(خورشید قمر)

QASRULADAB SERIES

No. 5.

1ST EDITION 1936 2,000

دارالاشاعت قصرالادب آگرہ

قیمت فی جلد ۔ تین روپیہ علاوہ محصول

Title & Pictures Printed at The AGRA PRINTING WORKS, Agra.